خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جولائی 2012

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے





جولائی 2012

جلد 40 شمارہ 3

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

پے در پے غیر متوقع واقعات ہونے کا عمل تسلسل سے جاری ہے اور بدترین اندیشے بھی۔

اختیار، اقتدار اور دولت کا کھیل بھی عجب ہے۔ یہ انسان کے ہاتھ میں آجائے تو انصاف منہ چھپا لیتا ہے اور دلیلیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اقتدار اللہ تعالیٰ کو ہی زیبا ہے اور اُن کو جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور زمین پر انصاف قائم کرتے ہیں۔

اس مہینے میں رمضان المبارک کا آغاز ہو رہا ہے۔ روزہ وہ واحد عبادت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

"روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔"

نفس انسانی کی تربیت میں روزے کو خصوصی دخل ہے۔ روزہ کی حالت میں جھوٹ، غیبت، چغلی، ظلم و زیادتی اور ہر قسم کی فضول و لایعنی گفتگو سے منع کیا گیا ہے۔

روزہ کا حقیقی مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب ایک ماہ کی اس تربیت کو ہم اپنی زندگی کا معمول بنا لیں اور اسے سال کے بقیہ گیارہ ماہ میں بھی برقرار رکھا جائے۔

ہماری طرف سے رمضان المبارک کی مبارک باد قبول کیجیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقدس مہینے کی برکتوں سے پوری طرح فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- فرحت اشتیاق کا مکمل ناول۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو،
- نایاب جیلانی کا مکمل ناول۔ بات ایک رات کی،
- مقدس مشعل کا ناول۔ احساس زیاں،
- راحت جبیں اور مہوش کنول مشی کے ناولٹ،
- سعدیہ حمید چودھری، نازیہ کنول نازی، ثمرہ شکور اور شازیہ جمال نیئر کے افسانے،
- عنیزہ سید اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- ٹی وی کے مشہور فنکار نعمان اعجاز سے ملاقات،
- ایف ایم 105 کی آر جے ہما کاشف سے باتیں،
- میری خاموشی کو بیاں ملے۔ قارئین سے سروے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- ہمارے نام۔ آپ کے خطوط اور ان کے جوابات،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہے۔ ہم اسے آپ کے لیے پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ یہ آپ کا اپنا پرچا ہے۔ ہمیں خط لکھ کر اپنے قیمتی مشوروں اور آرا سے ضرور نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کا بیان

حضرت ابو سلمہ رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کے بارے میں سوال کیا تو ام المومنینؓ نے فرمایا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھتے تھے، حتیٰ کہ ہم کہتے کہ اب تو آپ روزے ہی رکھتے جائیں گے۔ اور روزے چھوڑتے تو ہم کہتے کہ اب تو آپ نے روزے چھوڑ ہی دیے ہیں۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزے رکھتے نہیں دیکھا۔ آپ چند دن کے سوا ماہ شعبان کے (سارے) روزے رکھ لیتے تھے۔"

فوائد

1۔ نفلی روزے مسلسل رکھنا بھی جائز ہے، جبکہ ہر روزہ افطار کیا جائے، یعنی وصال نہ کیا جائے، کیونکہ وہ ہمارے لیے ممنوع ہے۔

2۔ نفلی روزے سال کے ہر مہینے میں رکھے جا سکتے ہیں۔

3۔ مسلسل ایک مہینہ نفلی روزے رکھنا خلاف سنت ہے۔

4۔ ماہ شعبان میں نفلی روزوں کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیے۔

5۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسلسل) روزے رکھتے تھے، حتیٰ کہ ہم کہتے، آپ افطار نہیں کریں گے۔ اور افطار کرتے حتیٰ کہ ہم کہتے، آپ روزے نہیں رکھیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سے

مدینہ شریف لائے' آپ نے رمضان کے سوا کبھی مسلسل ایک مہینہ روزے نہیں رکھے۔

6۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ کو سب سے زیادہ محبوب روزہ داؤد علیہ السلام والا روزہ ہے۔ آپ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن چھوڑتے تھے اور اللہ کو سب سے زیادہ جو نماز پسند ہے وہ داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ آپ آدھی رات تک سوتے اور تہائی رات میں نماز پڑھتے اور رات کا چھٹا حصہ سوئے رہتے۔"

فوائد

1۔ نفلی عبادات کی مقدار کم و بیش ہو سکتی ہے۔ آدمی چاہے تو زیادہ نوافل ادا کرے' چاہے کم رکعتیں پڑھ لے۔ اس طرح چاہے زیادہ روزے رکھے' چاہے کم رکھ لے' البتہ ان امور سے اجتناب کرے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

2۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے انداز پر نفلی روزے رکھنا سب سے افضل ہے۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ نفلی روزے رکھنے سے ثواب کم ہو جائے گا۔

3۔ حضرت داؤد علیہ السلام والے روزے اس لیے افضل ہیں کہ اس طریقے سے انسان کو جسم کا' اہل و عیال کا اور دوسرے لوگوں کا وہ حق ادا کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے' جو ہمیشہ روزے رکھنے کی صورت میں ادا نہیں کیا جا سکتا اور اللہ کی عبادت کرکے ثواب بھی حاصل ہو جاتا ہے اور ایک لحاظ سے یہ دائمی عمل بھی بن جاتا ہے۔ جو اللہ کو پسند ہے۔

4۔ نماز تہجد رات کے کسی بھی حصے میں ادا کی جا سکتی ہے' تاہم مذکورہ بالا صورت افضل ہے' کیونکہ اس میں بھی جسم کے حق اور اللہ کے حق کا ایک خوب صورت توازن موجود ہے۔

5۔ داؤد علیہ السلام والی نماز کی صورت یہ ہے' مثلاً" ایک رات بارہ گھنٹے کی ہو تو اس میں چھ گھنٹے آرام کیا جائے' پھر اٹھ کر چار گھنٹے نماز تہجد اور عبادت میں گزارے جائیں' پھر دو گھنٹے تک آرام کر لیا جائے۔

شوال کے چھ روزے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان ؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے عیدالفطر کے بعد چھ روزے رکھے اس کے پورے سال کے روزے ہو گئے۔ جو شخص نیکی کرے' اس کے لیے اس کا دس گنا ثواب ہے۔"

روزہ رکھنے کی فضیلت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یوں تو نبی آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے' سوائے روزے کے' کہ وہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور روزہ (گناہوں سے) سپر (ڈھال) ہے پھر جب کسی کا روزہ ہو تو اس دن گالیاں نہ بکے اور آواز بلند نہ کرے پھر اگر کوئی اسے گالی دے یا لڑنے کو آئے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔ اس قسم ہے اس پروردگار کی کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جان اس کے ہاتھ میں ہے کہ بے شک روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے آگے قیامت کے دن مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور روزہ دار کو دو خوشیاں ملتی ہیں جن سے وہ خوش ہوتا ہے۔ ایک تو وہ اپنے افطار سے خوش ہوتا ہے اور دوسرا وہ اس وقت خوش ہو گا جب وہ اپنے روزے کے سبب اپنے پروردگار سے ملے گا۔"

ماہِ رمضان کی فضیلت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھل

جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں کس (باندھ) دیے جاتے ہیں۔"

ماہ رمضان سے پہلے ایک دو روزے نہ رکھو

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"رمضان سے پیشگی ایک دو روزے مت رکھو' سوائے اس شخص کے جو ہمیشہ ایک مقررہ دن میں روزہ رکھ رہا تھا اور وہی دن آ گیا تو وہ اپنے مقررہ دن میں روزہ رکھ لے۔ (مثلاً" جمعرات اور جمعہ کو روزہ رکھتا تھا اور انتیس اور تیس تاریخ میں شعبان کے وہی دن آ گئے تو روزہ رکھ لے۔)"

روزہ چاند دیکھنے پر ہے

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے چاند کا ذکر فرمایا اور فرمایا۔

"جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم اس کو دیکھو' تب ہی افطار کرو پھر اگر بادل آ جائیں تو تیس روزے پورے رکھ لو (اس کے بعد عید کرو)۔"

بے شک اللہ نے اسے لمبا کر دیا ہے

"سیدنا ابو البختری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم عمرہ کو نکلے اور جب (مقام) نخلہ کے درمیان میں پہنچے تو سب نے چاند دیکھنا شروع کر دیا اور بعضوں نے دیکھ کر کہا کہ یہ تین رات کا چاند ہے (یعنی بڑا ہونے کی وجہ سے) اور بعضوں نے کہا کہ دو رات کا ہے پھر ہم سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملے اور ان سے ذکر کیا کہ ہم نے چاند کو دیکھا اور کسی نے کہا کہ تین رات کا ہے اور کسی نے کہا' دو رات کا ہے' تب انہوں نے پوچھا کہ تم نے کون سی رات میں دیکھا؟ تو ہم نے کہا کہ فلاں فلاں رات میں انہوں نے کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔"

"اللہ تعالیٰ نے اس کو دیکھنے کے لیے بڑھا دیا اور وہ اسی رات کا تھا جس رات تم نے دیکھا۔"

ہر شہر (ملک) کے لیے ان لوگوں کی رؤیت

کریب کہتے ہیں کہ سیدہ ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا نے انہیں سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس (ملک) شام بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ میں شام گیا اور ان کا کام کر دیا اور میں نے جمعہ (یعنی پنجشنبہ) کی شب کو رمضان کا چاند دیکھا پھر مہینے کے آخر میں مدینہ آیا اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے پوچھا اور چاند کا ذکر کیا کہ تم نے کب دیکھا؟ میں نے کہا کہ جمعہ کی شب کو۔ انہوں نے کہا کہ تم نے خود دیکھا؟ میں نے کہا' ہاں اور لوگوں نے بھی دیکھا اور روزہ رکھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور لوگوں نے بھی تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ہم نے تو ہفتہ کی شب کو دیکھا اور ہم پورے تیس روزے رکھیں گے یا چاند دیکھ لیں گے تو میں نے کہا کہ آپ سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا (چاند) دیکھنا اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں جانتے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں' ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایسا ہی حکم کیا ہے اور یحییٰ بن یحییٰ کو شک ہے کہ حدیث میں "نکتفی" کا لفظ ہے یا "تکتفی" کا۔

عید کے مہینے (اجر و ثواب کے اعتبار سے)

سیدنا ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔ "عیدوں کے دو ماہ ناقص نہیں ہوتے۔ ایک رمضان شریف اور دوسرا ذی الحجہ۔

روزہ کے لیے سحری کا بیان

سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔
"سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔"

سحری میں تاخیر کا بیان

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ سحری کی پھر صبح کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں (راوی) نے کہا کہ (سحری اور نماز) دونوں کے درمیان کتنی دیر ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ پچاس آیات کے موافق۔ (سحری سے فراغت اور نماز کی تکبیر کے درمیان تقریباً" دس منٹ کا فاصلہ تھا۔)

اللہ تعالیٰ کے اس قول حتی یتبین لکم..... کے بارے میں

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری کہ:
"کھاؤ اور پیو' یہاں تک کہ سفید دھاگہ نمودار ہوجائے۔"
تو آدمی جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتا تو دو دھاگے اپنے پیر میں باندھ لیتا۔ ایک سفید اور دوسرا سیاہ اور کھاتا پیتا رہتا یہاں تک کہ اس کو دیکھنے میں کالے اور سفید کا فرق معلوم ہونے لگتا' تب اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد "فجر سے" کا لفظ اتارا' تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ دھاگوں سے مراد رات اور دن ہے۔

بے شک بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رات کو اذان دیتے ہیں' پس تم کھاؤ اور پیو

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دو مؤذن تھے۔ ایک سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ نابینا تھے تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔
"بلال رات کو اذان دیتے ہیں' پس تم کھاتے پیتے رہو۔ یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔"

سورج غروب ہوجائے تو روزہ افطار کرلو

سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ رمضان کے مہینے میں سفر میں تھے پھر جب آفتاب غروب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔
"اے فلاں! اترو اور ہمارے لیے ستو گھول دو۔"
انہوں نے کہا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم! ابھی آپ پر دن ہے۔" (یعنی ان صحابی کو یہ خیال ہوا کہ جب غروب کے بعد جو سرخی ہے' وہ جاتی ہے جب رات آتی ہے' حالانکہ یہ غلط ہے)۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پھر فرمایا۔
"اترو (یعنی اونٹ پر سے) اور ہمارے لیے ستو گھولو۔"
پھر وہ اترے اور ستو گھول کر آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس لائے اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نوش فرمایا اور پھر اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا۔
"جب سورج اس طرف غروب ہوجائے (یعنی مغرب میں) اور اس طرف (یعنی مشرق سے) رات آجائے تو پس روزہ دار کو روزہ کھول لینا چاہیے۔"

افطاری جلدی کرنے کا بیان

ابو عطیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں اور مسروق ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور مسروق نے ان سے کہا کہ۔
"اے مسلمانوں کی ماں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اصحاب میں سے دو شخص ایسے ہیں کہ ایک تو اول وقت افطار کرتے ہیں اور اول وقت ہی نماز پڑھتے ہیں اور دوسرے افطار اور نماز میں دیر کرتے ہیں۔"
ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ "وہ کون ہیں جو اول افطار کرتے ہیں اور اول وقت نماز

پڑھتے ہیں۔"
تو ہم نے کہا کہ "وہ عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ ہیں۔"
تو انہوں نے کہا۔
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔"

سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ رمضان کی سولہ تاریخ کو جہاد کیا تو کوئی ہم میں سے روزہ دار تھا اور کوئی افطار کیے (بے روزہ دار) تھا اور روزہ دار افطار کرنے والے پر عیب نہ کرتا تھا اور نہ افطار کرنے والا روزہ دار پر۔

اس افطار کرنے والے کے اجر کا بیان جو سفر میں کام کرے

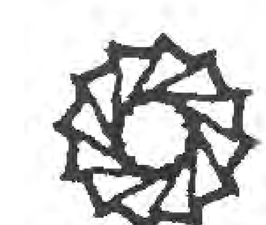
سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے پس کوئی ہم میں سے روزہ دار تھا اور کوئی بے روزہ دار۔ اور سخت گرمی کے وقت ایک منزل میں اترے اور سب سے زیادہ سائے میں وہ تھا جس کے پاس چادر تھی اور کتنے تو ایسے تھے کہ ہاتھ ہی سے دھوپ روکے ہوئے تھے اور روزہ دار جتنے تھے' سب منزل پر جاکر پڑے رہے اور جن لوگوں کا روزہ نہیں تھا انہوں نے کھڑے ہوکر خیمے لگائے اور اونٹوں کو پانی پلایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔ "افطار کرنے والے آج بہت سا ثواب لے گئے۔"

میت کے روزے کی قضا

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مرجائے اور اس پر روزے (کی قضا) ہو تو اس کا وارث اس کی طرف سے روزے رکھے۔
سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک عورت آئی اور اس نے عرض کیا میں نے ایک لونڈی خیرات میں اپنی ماں کو دی تھی اور میری ماں مرگئیں۔
آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔
"کہ تیرا ثواب ہوگیا اور پھر وہ لونڈی میراث کی وجہ سے تیرے پاس آگئی۔"
اس نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ماں پر ایک ماہ کے روزے (قضا) تھے۔ کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟"
آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "ہاں اس کی طرف سے روزے رکھو۔"
اس نے عرض کیا کہ "میری ماں نے حج نہیں کیا تھا۔"
تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ "اس کی طرف سے حج بھی کرو۔"

نماز عید میں کیا پڑھیں

عبیداللہ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اضحیٰ اور فطر میں کیا پڑھتے تھے؟" انہوں نے کہا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں ق والقرآن المجید اور اقتربت الساعۃ وانشق القمر پڑھتے تھے۔" (مسلم)





کچھ انڈوں کی طرفداری میں

انشا جی

دنیا میں یہ بحث ہمیشہ سے چلی آرہی ہے کہ انڈا پہلے یا مرغی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں انڈا۔ کچھ کا کہنا ہے مرغی۔ ایک کو ہم مرغی اسکول یا فرقہ مرغیہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے کو انڈا اسکول۔ ہمیں انڈا اسکول سے منسلک سمجھنا چاہیے۔ ملت بیضا کا ایک فرد جاننا چاہیے۔ ہمارا عقیدہ اس بات میں یہ ہے کہ اگر آدمی تھانیدار یا مولوی یعنی فقیہہ شہر ہو تو اس کے لیے مرغی پہلے۔۔۔ اور ہم ایسا غریب شہر ہو تو اس کے لیے انڈا پہلے۔۔۔ اور غریب شہر سے بھی گیا گزرا ہو تو نہ اس کی دسترس مرغی تک ہو سکتی ہے نہ انڈا اس کی گرفت میں آسکتا ہے۔ اسے اپنی ذات اور اس کی بقا کو ان چیزوں سے پہلے جاننا چاہیے' پہلے مقدم رکھنا چاہیے۔

ایک زمانے میں ہمارا دھیان کبھی کبھی مرغی کی طرف بھی جایا کرتا تھا۔ لیکن جب سے بکری کے دام گائے کی قیمت کے برابر ہوئے ہیں اور مرغی' بکری کے دام پانے لگی ہے اور انڈا مرغی کے بھاؤ دستیاب ہونے لگا ہے' ہمارے لیے انڈا ہی مرغی ہے۔ ہم وحدت الوجود کی منزل میں آگئے ہیں۔ انڈا یوں بھی بڑی خوبیوں کی چیز ہے۔ اس میں سفیدی ہوتی ہے۔ اس میں زردی ہوتی ہے۔ اس میں چونا ہوتا ہے۔ اس میں پروٹین ہوتی ہے۔ اسے دانہ نہیں ڈالنا پڑتا۔ یہ بیٹ نہیں کرتا۔ بلیاں اس کی جان کی خواہاں نہیں ہوتیں۔ اس کے لیے ڈربہ نہیں بنوانا پڑتا۔ اس کے خول پر رنگ کرکے اسے گھر میں سجا سکتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی یہ گندا ضرور نکل جاتا ہے۔ سو اسے آسانی سے اٹھا کر باہر گلی میں پھینکا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال بھی جب نئی تہذیب کے کسی گندے انڈے کو دیکھتے تھے' یہی کہا کرتے تھے۔ افسوس کہ پرانی تہذیب کے گندے انڈوں کے متعلق انہوں نے اپنے کلام میں کوئی واضح ہدایات نہیں چھوڑیں۔ اس لیے ان کے عقیدت مند ان کو سنبھال سنبھال کر رکھے جارہے ہیں۔

اقبال کے ایک شارح نے تو اس شعر کی مدد سے علامہ اقبال کی گھریلو زندگی پر بھی پورا مقالہ لکھ دیا ہے۔ آج کل دستور یہی ہے کہ غالب کی زندگی معلوم کرنی ہے تو اس کے دیوان سے اخذ کرو کہ وہ شہر میں بے آبرو پھرا کرتے تھے۔ دھول دھپا اور پیش دستی کیا کرتے تھے در کعبہ سے الٹے پھر آیا کرتے تھے' سیدھے نہیں اور مرنے کے بعد بھی بولا کرتے تھے۔

"کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ"

وغیرہ وغیرہ۔ ان صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال ایک روز بازار سے نئی تہذیب کے چند انڈے لے کر آئے۔ ان کی بیوی آملیٹ بنانے بیٹھیں تو انہیں دوسرا مصرع پڑھنا پڑا۔

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اس پر علامہ موصوف نے ترکی بہ ترکی یعنی مصرع بہ مصرع ہدایت کی کہ۔

ان کو اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

یہ تحقیق یہاں ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ اتنی سی بات تو ہر عامی بھی سمجھ سکتا ہے۔ شارح موصوف کا کہنا ہے کہ شاعر کا گھر کسی گلی میں تھا۔ یہ شعر لازما" ان دنوں کا ہے' جب علامہ مرحوم نے میو روڈ پر ابھی اپنی کوٹھی نہیں بنائی تھی۔ ورنہ وہ یہ فرماتے کہ

اٹھا کر پھینک دو باہر سڑک پر

جناب محقق نے علامہ اقبال کی زبان میں نقص بھی دریافت کیا ہے کہ باہر کا لفظ زاید ہے کیونکہ گلی گھر کے اندر نہیں ہوتی۔ مزید لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ہر معاملے میں خوامخواہ اپنی رائے دینے کی عادت تھی ورنہ گندے انڈے کو گلی میں پھینکنے کا فیصلہ ان کی بی بی خود بھی کر سکتی تھیں۔

شارح موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال مرحوم کے ابتدائے جوانی کا ہے۔ جب انہیں پہلوانی' کسرت اور کرتب بازی سے دلچسپی تھی۔ وہ بھاری بھاری وزن کو اٹھا کر دو چار بار گردش دیتے تھے' پھر پھینکتے تھے۔ یہ ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ اس لیے کہا ہے کہ "اٹھا کر پھینک دو۔۔۔" صرف پھینک دو" کہنا کافی نہیں سمجھا۔ معاملہ انڈوں ہی کا کیوں نہ تھا ہمارے خیال میں اس شعر سے ابھی اور معنی نچوڑنے کی بھی گنجائش ہے۔

علامہ مرحوم کو اپنے باطن کی صفائی کی طرف زیادہ دھیان رہتا تھا۔ باہر کی صفائی کا کچھ خیال نہ کرتے تھے ورنہ وہ یہ کبھی نہ فرماتے کہ انڈے اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دو۔ انہیں کوڑے کے ڈرم میں پھینکنا چاہیے تھا۔ باہر کسی بھلے آدمی کی اچکن پر گر جاتے تو بڑا فضیحتا ہوتا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری قوم کو علامہ مرحوم کی ہر ہدایت پر آنکھ بند کرکے عمل کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اپنی عقل کا واجبی استعمال بھی کر لینا چاہیے۔ تھوڑی احتیاط بھی لازم ہے۔ ہر خوشہ گندم کو جلانے' مرمر کی سلوں سے ناخوش و بیزار ہونے' اس رزق سے موت اچھی ہونے اور گندے انڈے گلی میں اٹھا کر پھینک دینے کے متعلق اشعار اس کی محض چند مثالیں ہیں۔

آج انڈوں کی طرف رہ رہ کر ہمارا دھیان جانے کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو سردی' دوسرے حکومت کا یہ اعلان کہ گوشت اور دودھ کی طرح انڈوں کی بھی قیمتیں مقرر کی جارہی ہیں تاکہ مقررہ قیمتوں پر نہ ملیں۔ تیسرے شاد عارفی مرحوم کا ایک نادرہ کار شعر ہماری نظر سے گزرا ہے۔ صیاد اور قفس اور نشیمن کے مضمون بہت شاعروں نے باندھے ہیں۔ نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے بھی باندھے ہیں۔ خود علامہ اقبال مرحوم نے بھی ایک بلبل کی فریاد لکھی ہے لیکن اس مضمون کے جملہ متعلقات پر کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ فرماتے ہیں شاد عارفی رام پوری۔

انہیں بھی ساتھ لیتا جا' کہیں ٹکیاں بنا لینا
ارے صیاد دو انڈے بھی رکھے ہیں نشیمن میں

انڈے کا مضمون تو ختم ہوا لیکن اپنے دوست عنقا کے شکریے کے ساتھ شاد عارفی مرحوم کے چند اور اشعار۔

تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی
لیکن سوال یہ ہے کہ پھر کیا کرے کوئی

جناب شیخ ہی اب رہ گئے ہیں لے دے کے
وہ دن گئے کہ کسی برہمن پہ چوٹ کروں

ستم گر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں
غلط کہہ رہا ہوں مگر کہہ رہا ہوں

کانٹے چنے جو ہم نے سر راہ کوئے دوست
جھگڑا یہ ہے دکھاؤ ہمیں' کیا اٹھا لیا

جفا وجور کو خوبی تو ہم سمجھتے ہیں
حکومتوں میں نہیں بلکہ مہ جبینوں میں

☆

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

امت الصبور



تہذیب و روایت کا ایک دور ختم ہوا۔
وہ ذہن جو علم و ادب کا خزانہ تھا' تہ خاک ہوا۔

دانش ور' ادیب' محقق' کمپئیر عبید اللہ بیگ (بیگ بھائی) اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔

عبید اللہ بیگ کو شہرت ٹی وی پروگرام "کسوٹی" سے حاصل ہوئی۔ اس پروگرام کے ذریعے انہوں نے دیکھنے والوں کو اپنی ذہانت اور شخصیت کا گرویدہ بنالیا۔ ان کے مطالعہ کی وسعت اور حافظہ کمال کا تھا۔ علم و ادب کی دنیا کی بیشتر معروف شخصیات نے اس پروگرام میں حصہ لیا۔ اور انہوں نے عبید اللہ بیگ کی ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔

یہ پروگرام ان کی وجہ شہرت بنا' لیکن در حقیقت وہ ایک بہت اچھے ادیب بھی تھے اور بہترین محقق بھی۔ ٹی وی پر ان کا پروگرام "سیلانی کے ساتھ" اپنی نوعیت کا منفرد پروگرام تھا۔ جس میں انہوں نے پاکستان کے مختلف حصوں کی قدیم تاریخی حیثیت کے بارے میں تحقیق کی اور دستاویزی فلمیں بنا کر ان کا حسن دنیا کے سامنے پیش کیا۔

بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ وہ ماہر شکاری بھی تھے۔ ایک بار گفتگو کے دوران انہوں نے بڑے تاسف سے کہا کہ انہوں نے شکاریات پر مضامین لکھے تھے' جو الشجاع رسالے میں شائع ہوئے تھے۔ مدت ہوئی یہ رسالہ بند ہو چکا ہے۔ اب ان مضامین کا ملنا مشکل ہے۔

ریاض صاحب کے پاس "الشجاع" کی فائلیں محفوظ تھیں۔ انہوں نے بیگ صاحب کو یہ شمارے بھجوا دیے تو وہ بہت خوش ہوئے۔

ان کا ناول "اور انسان زندہ ہے" عمران ڈائجسٹ میں سلسلہ وار شائع ہوا۔ ایک اور ناول "راجپوت" کے نام سے لکھا۔ ان کے ناولوں میں ادب اور تاریخ کا بہت خوب صورت امتزاج نظر آتا ہے۔ سادہ سے جملوں کی معنی خیزی کائنات کے گہرے رازوں کا پتا دیتی ہے۔ سچائیاں کشید کرتے ہوئے ان کی گہری سوچ اور فکری پختگی کہانی کو ایک نئے انداز سے سامنے لاتی ہے۔ ان کی علمیت اور تاریخ کا وسیع مطالعہ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے' لیکن وہ ان کی ادبی حیثیت کو متاثر نہیں کرتا۔

بیگ صاحب علمیت اور قابلیت کے ساتھ ساتھ بہت خوب صورت انسان بھی تھے۔ ہنس مکھ' بذلہ سنج' شگفتہ مزاج۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی دوستی کس کے ساتھ تھی۔ ریاض صاحب' بابر صاحب' خاور صاحب' عامر صاحب' آذر سب ہی کے ساتھ ان کا قربت اور محبت کا رشتہ تھا۔ سلمیٰ بھابھی کی محبت اور اخلاق کے بھی سب ہی لوگ گرویدہ تھے۔

بیگ بھائی کو قدرت نے حسن کلام سے نوازا تھا۔ کبھی تاریخ پر گفتگو چھڑ جاتی تو۔۔۔ ان کی ذہانت اور وسیع مطالعہ کا کمال سامنے آتا۔ بڑے سادہ اور سلیس انداز میں دقیق گتھیاں سلجھتی چلی جاتیں۔ گھنٹوں گزر جاتے' وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ باوجود اس کے کہ ذہانت اور علم میں کہیں آگے تھے۔ کبھی اپنی ذہنی برتری اور بڑائی کا احساس نہیں دلایا۔ ان کے مزاج میں بڑی کی فطری سی انکساری اور شفقت و محبت تھی۔

سچ یہ ہے کہ وہ ایک بہترین اور سچے انسان تھے۔ ایک ایسے انسان جن سے صرف ایک مرتبہ ملنے والا شخص بھی ان سے محبت کا دعویدار تھا۔ آج جب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو احساس ہو رہا ہے کہ ہم ایک ایسی شخصیت کو کھو چکے ہیں' جس کی جدائی کا غم برسوں مندمل نہیں ہو سکے گا۔ سلمیٰ بھابھی کے دکھ کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ رفیق سفر کی دائمی جدائی کا صدمہ سہنا آسان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کی بیٹیوں کو صبر جمیل عطا کرے اور بیگ بھائی کو جنہیں مرحوم کہنے کو جی نہیں چاہتا' اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)



مشہور و مقبول آرٹسٹ

نعمان اعجاز سے ملاقات

شاہین رشید

نعمان اعجاز ایک ایسا نام جو کسی بھی سیریل اور ٹیلی فلم کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ورسٹائل فنکار جو ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ناظرین میں اسی طرح مقبول ہیں جس طرح پہلے تھے۔

آج آپ انہیں کئی سیریز میں دیکھ رہے ہیں اور سب میں ان کا کردار مختلف اور منفرد ہے اور یہ ہی سچے فنکار کی پہچان ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اپنے کرداروں میں تنوع دے۔

"کیسے ہیں نعمان اعجاز صاحب؟"

"الحمد للہ۔۔۔"

"آپ ایک بہترین فنکار ہیں۔ ڈراما "میرا سائیں' جو چلے تو جاں سے گزر گئے' 'اک نظر میری طرف' 'جل پری' اور دیگر بہت سے ڈراموں میں آپ کی اداکاری منفرد نظر آئی۔ کیا اداکاری آپ کا خواب تھا؟"

"نہیں ہرگز نہیں! میرا خواب تو ڈاکٹر بننا تھا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا اور اداکار بن گیا۔ ویسے کیریر کا آغاز میں نے وکالت سے کیا تھا۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ایک ڈیڑھ سال اس پیشے سے وابستہ رہا' پھر شوبز کی مصروفیات کی وجہ اسے جاری نہ رکھ سکا اور وکالت کو خیرباد کہہ دیا۔"

"ویسے اس فیلڈ میں آکر ہر طرح کے رول کرکے کچھ تسکین تو ہوئی ہوگی؟"



"جی بالکل! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ واقعی میں نے اس فیلڈ میں آکر اتنے رول کیے ہیں کہ اب یہ حسرت نہیں ہے کہ مجھے یہ کرنا چاہیے یا وہ کرنا چاہیے۔"

"آپ کا خواب ڈاکٹر بننا تھا' بن نہ سکے۔ پھر وکالت میں آئے۔ مگر شوبز کی مصروفیات کی وجہ سے چھوڑ دی۔ آخر آپ شوبز میں آئے کیسے؟ کس نے آپ کو یہ راستہ دکھایا؟"

"ایسا نہیں ہے کہ مجھے شوبز میں آنے کا شوق نہیں تھا۔ شوبز میں آنے کا شوق تھا۔ مگر اداکار بننے کا شوق نہیں تھا۔ میں پی ٹی وی پہ نیوز کاسٹرز کو خبریں پڑھتا ہوا دیکھتا تھا تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں بھی خبریں پڑھوں۔

چنانچہ انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں پی ٹی وی گیا اور نیوز کاسٹر کے لیے آڈیشن دیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ 1985ء کی بات ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ میں نے نیوز اچھی نہیں پڑھی تھیں' بلکہ یہ کہا گیا کہ تم ابھی کم عمر ہو۔ 1987ء میں جب دوبارہ اس کام کے لیے گیا تو اتفاق سے نصرت ٹھاکر صاحب سے ملاقات ہو گئی انہوں نے کہا کہ "تم اداکاری کی فیلڈ میں کیوں نہیں آجاتے۔ مجھے تم میں ٹیلنٹ نظر آتا ہے۔" اور پھر انہوں نے ہی مجھے اپنے ڈرامے "دن" میں کاسٹ کر لیا۔ یہ میرا پہلا ڈراما تھا۔ اس میں میری پرفارمنس ان کو اتنی پسند آئی کہ انہوں نے مجھے اپنے مزید چار ڈراموں میں بک کر لیا۔۔۔ بس اس طرح میں اس فیلڈ میں آگیا۔"

"گویا انسان کو دنیا میں وہی کچھ ملتا ہے' جو اس کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔ آپ مانتے ہیں اس بات کو؟"

"جی بالکل! مانتا ہوں' کیونکہ بچپن سے میرا خواب ڈاکٹر بننے کا تھا۔ لیکن میں وہ کچھ بن گیا' جس کے بارے میں' میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس فیلڈ میں آنے کا سوچتا بھی تھا تو یہی کہ نیوز کاسٹر بنوں گا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہوا' تو سچ تو یہ ہے کہ انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی زور لگالے کہ اسے یہی بننا ہے۔ بہرحال میں خوش ہوں اپنی لائف میں۔"

"اس فیلڈ میں کیا تجربات حاصل ہوئے؟"

(ہنستے ہوئے) "یہ نہ پوچھیں کہ کیا تجربات ہوئے۔۔۔ بہت برے تجربات بھی ہوئے اور بہت اچھے بھی لیکن ایک تجزیہ بہت گہری نظر سے میں نے کیا کہ اس فیلڈ میں مخلص' ایمان دار اور دوسروں کے لیے اچھا سوچنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ زیادہ تر لوگ اس فیلڈ میں مفاد پرست ہیں۔ دوسروں کی غیبت کرنا' دوسروں کو نیچا دکھانا اور دوسروں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا' یہ سب کچھ اس فیلڈ میں ہوتا ہے۔ منافقت اور جھوٹ بہت ہے اس فیلڈ میں۔"

"اس لیے آپ نے اپنی لائف پارٹنر کے لیے شوبز کا انتخاب نہیں کیا؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔۔۔ لیکن اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ میری قسمت میں شوبز کی لڑکی نہیں تھی اور پھر وہی بات کہ اللہ جو کرتا ہے' بہتر کرتا ہے۔"

"مگر شوبز کے کئی لوگ ہیں جو بہت خوش گوار د

خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔"

"بے شک! بہت سے جوڑے کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ بات پھر وہیں پہ آکے رک جاتی ہے کہ جو نصیب میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے۔ اگر میرے نصیب میں شوبز کی لڑکی ہوتی تو مجھے ضرور ملتی۔"

"ویسے رابعہ سے کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ آپ کی پسند کا کتنا عمل دخل تھا؟"

"میری ہی پسند کا عمل دخل تھا... میں نے رابعہ کو پہلی مرتبہ کالج کے ایک فنکشن میں دیکھا تھا۔ مجھے وہ پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگی اور دوسری ملاقات میں پروپوز کردیا تھا۔"

"گھر والوں کو پتا تھا آپ کی پسند کا؟"

"بالکل پسند کا پتا تھا اور انہیں کوئی اعتراض بھی نہیں تھا... لیکن تھوڑی سی دیر رابعہ کی طرف سے ہوئی' لیکن آخر کار سارا معاملہ سیٹ ہوگیا۔ ہماری شادی 1995ء میں ہوئی۔ جس لڑکی کو میں نے چاہا تھا' وہ مجھے مل گئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے تین عدد خوب صورت بیٹے دے کر زندگی کو مکمل کردیا۔ میرے بڑے بیٹے کا نام "زاویار" دوسرے کا نام "شاہ میر" اور تیسرے کا نام "ریان" ہے۔"

"بیٹی نہیں ہے آپ کی۔ اچھا محسوس کرتے ہیں یا خواہش بھی بیٹی کی؟"

"مجھے بیٹیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ مجھے بیٹی کی خواہش تھی۔ مگر اللہ نے نہیں دی۔ اب کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"چلیں! بہوویں آجائیں گی تو یہ خواہش بھی پوری ہوجائے گی۔ خیر! جب آپ اس بات کو مانتے ہیں کہ سب کچھ نصیب کا لکھا ملتا ہے۔ پھر تو کبھی کوئی کام پلاننگ کے ساتھ نہیں کرتے ہوں گے؟"

"آپ ٹھیک سمجھی ہیں... میں آئندہ زندگی کے لیے کوئی پلاننگ نہیں کرتا اور میں روزانہ کی بنیاد پر پلاننگ کرتا ہوں۔ جو آج ہے 'وہ ہمارا ہے' جو کل ہے اُس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ بس! اللہ تعالیٰ اپنی مہربانیاں' ہم پر جاری رکھے۔"

"1987ء سے آپ اس فیلڈ میں ہیں۔ بہت کام کیا۔ تعداد تو یاد نہیں ہوگی' مگر ڈھیر سارے چینلز کے آجانے کے بعد کن ڈراموں کو بہت اچھا کہیں گے؟ میں آپ کے ڈراموں کی بات کررہی ہوں؟"

"او کے... پہلا ڈراما تو جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ڈراما سیریل "دن" تھی۔ اس کے بعد سے لگا تار کام کیا اور تقریباً" 120 یا 125 ڈراما سیریلز کی ہیں۔ تقریباً" پونے تین سو کے قریب سنگل ڈراموں میں' جنہیں آپ ٹیلی فلمز بھی کہہ سکتی ہیں' میں کام کیا اور دس فلمیں کیں... اب رہی یہ بات کہ پسند کون کون سے ہیں تو مجھے تو اپنے سارے ہی ڈرامے اور فلمیں پسند ہیں۔ ہاں! جو بہت مشہور ہوئے ہیں ان میں "میرا سائیں" جس کا سیکوئیل بھی چلا۔ اس کے علاوہ "دشت' جل پری' جو چلے تو جاں سے گزر گئے' نجات' یہ زندگی ہے' خاموشیاں' جھمکا جان' اک نظر میری طرف' میں مرگئی شوکت علی' ور شہوار' فشار' من و سلویٰ" سب ہی سپر ہٹ گئے۔ مگر "میرا سائیں" نے تمام ریکارڈز توڑ دیے ہیں۔"

"اس میں آپ کا رول بہت اچھا تھا۔"

"بے شک! مگر اس میں ساری ٹیم نے بہت محنت کی۔ کسی ایک کے رول کے اچھا ہوجانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک ٹیم ورک نہ ہو۔ سب نے اپنا اپنا کام بہت محنت سے نبھایا ہے۔"

"کردار اپنی پسند سے لیتے ہیں؟"

"ڈائریکٹر مجھے بتاتا ہے کہ یہ رول ہے' پھر میں دیکھتا ہوں' سوچتا ہوں اور اگر اچھا پاور فل ہوتا ہے تو قبول کرلیتا ہوں۔ ورنہ ظاہر ہے "ہاں" کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جو رول پسند آتا ہے بس پھر اسی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ آگے میری مدد اللہ کرتا ہے۔"

"اکثر لوگ کہتے ہیں' میں نے بہت محنت کی' بہت جدوجہد کی' تب اس مقام تک پہنچا۔ کیا اولاد کو آگے بڑھانے میں والدین کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ والدین کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ اگر ہماری اچھی تربیت نہ کریں' ہمیں اچھی تعلیم نہ دلوائیں' ہمارے اندر محنت کا جذبہ پیدا نہ کریں تو ہم کب کچھ کرنے کے قابل ہوسکتے ہیں۔ میں تو اپنے والدین کا بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم اپنے پیروں پہ بااعتماد طریقے سے کھڑے ہوئے۔"

"اور اب آپ اسی انداز میں اپنے بچوں کی تربیت کررہے ہیں؟"

"جی بالکل! بچوں کی تربیت میں والدین کا ہاتھ ہی ہوتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ماں کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے... کیونکہ باپ تو سارا دن اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ میرے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت میں میری بیگم کا بہت ہاتھ ہے۔"

"آپ کتنا وقت دیتے ہیں؟"

"میری کوشش ہوتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ وقت دوں... لیکن کام کی نوعیت ایسی ہے کہ جتنا وقت مجھے دینا چاہیے' اتنا دے نہیں پاتا... لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میں اپنی فیملی کے ساتھ ہر سال ملک سے باہر مہینہ دو مہینے کے لیے ضرور جاتا ہوں اور پھر وہ سارا وقت بچوں کے لیے ہی ہوتا ہے۔"

"مزید سوالات سے پہلے آپ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیں۔"

"میں 14 فروری کو لاہور میں پیدا ہوا۔ میرا ستارہ حوت ہے۔ میری والدہ کا نام فرحت اور والد کا نام اعجاز ملک تھا۔ دونوں حیات نہیں ہیں۔ ہم دو بھائی ہیں اور ہماری ایک ہی بہن ہے۔ بھائی مجھ سے بڑا ہے جو کہ امریکا میں ہے۔ بہن چھوٹی ہے جو کہ اپنی شادی شدہ لائف میں خوش حال زندگی گزار رہی ہے اور اپنی تعلیم کے بارے میں تو میں نے آپ کو بتایا ہی ہے کہ (ایل ایل بی) ہوں۔"

"آپ کے پاس دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔ پھر بھی کسی چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں اپنی زندگی میں؟"

"بہت اچھا سوال کیا آپ نے... بے شک اللہ نے مجھے ہر نعمت سے نوازا ہوا ہے۔ میں ایک اچھی زندگی گزار رہا ہوں۔ بس کمی ہے تو والدین کی۔ کاش وہ حیات ہوتے۔ ہمارے ساتھ ہوتے تو زندگی کا لطف ہی کچھ اور ہوتا۔ میں انہیں بہت مس کرتا ہوں۔ بہت کمی محسوس ہوتی ہے ان کی۔"

"آپ بتا رہے ہیں کہ آپ ہر سال ملک سے باہر گھومنے پھرنے جاتے ہیں۔ کبھی دل چاہا کہ باہر ہی رہنا چاہیے؟"

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میرے پاس کینیڈا کی شہریت ہے۔ مگر میں صرف اور صرف پاکستان میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے پاکستان سے پیار ہے۔ یہاں میری جڑیں ہیں اور اللہ نے پاکستان میں ہی مجھے شہرت دی ہے۔ میں جو کچھ ہوں پاکستان کی وجہ سے ہی ہوں۔"

"شہرت پہ ایک سوال پوچھوں گی... ہجوم سے گھبراتے ہیں؟"

"نہیں! لوگ محبت کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ڈیمانڈ کرتے ہیں آٹو گراف کی تو کیا ہوا... لوگ ملتے ہیں تو تعریف ہی کرتے ہیں۔"

"اپنے آپ کو عام لوگوں سے کتنا مختلف سمجھتے ہیں؟"

"بالکل بھی مختلف نہیں سمجھتا۔ میں بھی عام لوگوں کی طرح انسان ہوں۔ عام انسانوں کی طرح رہتا ہوں... ضرورت کے اوقات میں گھر کے کاموں میں بھی حصہ لیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جو عزت' شہرت دی ہے اُس پر غرور کیسا؟"

"آپ سے بات کرکے بھی اندازہ ہورہا ہے کہ آپ میں بہت انکساری ہے۔ کھانے پینے میں نخرہ دکھاتے ہیں؟"

"نہیں بالکل نہیں! کیونکہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ نخرہ کیا کرنا اور سچ بات تو یہ ہے کہ کھانے پینے میں نخرہ دکھانے' نہ دکھانے کا سارا دارو

مدار والدین کی تربیت پر ہوتا ہے۔ ہمارے والدین نے کچھ کھانے اور کچھ نہ کھانے کی بالکل بھی عادت نہیں ڈالی۔ بلکہ ہمیشہ یہی کہا کہ تم کو سب کچھ کھانا ہے۔ کوئی نخرہ نہیں دکھانا کیونکہ یہ ناشکری ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ناشکری کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں اپنے بچوں کو بہت ڈانٹتا ہوں، جب وہ کھانے میں نخرے دکھاتے ہیں۔"

"جو انکساری اور خلوص آپ میں ہے 'یقیناً' آپ کے بچوں میں بھی ہوگا؟"

"ان شاء اللہ ہوگا۔ کیونکہ بڑا بیٹا بارہ سال کا ہے۔ دوسرے دو چھوٹے ہیں، لیکن میں ان کو مینرز سکھاتا رہتا ہوں کہ کسی کے گھر جاؤ تو ان کے ملازموں سے بھی بہت عزت و انکساری کے ساتھ ملو۔ کیونکہ محنت سے کمانے والا ہر شخص عزت اور احترام کے قابل ہے۔"

"سیاست سے لگاؤ ہے آپ کو؟"

"ہے اور نہیں بھی۔ ہمارے یہاں کی سیاست بہت عجیب و غریب ہے۔ ہمارے سیاست دان صرف اپنے ہی مفاد کا سوچتے ہیں۔۔۔ انہیں غریبوں کی غربت کا کیا احساس، جنہوں نے کبھی فاقہ نہ کیا ہو، جنہوں نے کبھی بازار جاکر خود خریداری نہ کی ہو۔ جنہوں نے لائن میں لگ کر بل جمع نہ کرائے ہوں۔ جنہوں نے کبھی دھوپ کی گرمی نہ سہی ہو۔ انہیں غریبوں کا کیا احساس ہوگا۔ میرا بس چلے تو کچھ سبق تو سکھا ہی دوں۔۔۔ مگر مجبور ہوں۔"

"آپ کے خیال میں عورتوں کو جاب کرنی چاہیے؟"

"کیوں نہیں۔۔۔ اگر مجبوری ہو، ضرورت ہو اور اپنی صلاحیتوں کو تسلیم کروانا ہو تو ضرور کریں، مگر اپنی حدود کے اندر رہ کر۔ ویسے بھی خواتین کو تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہیے۔ تاکہ بچوں کی اچھی تربیت کر سکیں۔ خود میری بیگم رابعہ گریجویٹ ہے۔"

"فضول خرچ ہیں؟"

"ہر وقت فضول خرچی نہیں کرتا۔ لیکن جب کچھ پسند آجاتا ہے تو پھر نہیں رک سکتا۔ میرا ایمان ہے کہ اگر خرچ کریں گے تو اللہ تعالیٰ رزق میں اضافہ کرے گا۔ اپنے اوپر بھی خرچ کرنا چاہیے۔ گھر والوں پر بھی خرچ کریں اور ضرورت مندوں پر بھی۔ پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح رزق میں اضافہ کرتا ہے۔"

"مذہبی ہیں؟"

"بالکل ہوں۔۔۔ نصیب کے لکھے پر یقین رکھتا ہوں۔ نماز، روزے کی پابندی کرتا ہوں۔ باوضو رہتا ہوں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ باوضو رہنے سے اللہ تعالیٰ رزق میں اضافہ کرتا ہے۔ میں نے اس بات کو گرہ سے باندھ لیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے رزق میں کشادگی دی ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ پانچ وقت کی نماز پڑھوں۔۔۔ کبھی مجبوری میں چھوٹ جائے تو اور بات ہے ورنہ نہیں چھوڑتا۔"

"غصہ آتا ہے؟ رد عمل کیا ہوتا ہے؟"

"انسان ہوں۔۔۔ غصہ تو آتا ہے مگر کم آتا ہے۔ کوئی بلاوجہ جھوٹ بولے تو بہت غصہ آتا ہے، مگر اظہار نہیں کرتا۔ خاموش رہنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"

"کھانے میں نخرہ تو نہیں دکھاتے، پھر بھی کھانے میں کیا پسند ہے آپ کو۔۔۔ اور کیا خود بھی پکا لیتے ہیں؟"

"میں خود نہیں پکاتا۔۔۔ نہ کبھی ایسا کوئی موقع آیا کہ مجھے خود پکانا پڑا ہو اور کھانے میں دال چاول اور ساتھ ہری مرچ بہت پسند ہیں۔"

"میوزک سے آپ کا لگاؤ؟"

"بالکل ہے۔۔۔ نصرت فتح علی بہت پسند ہیں۔ زیادہ تر انہیں ہی سنتا ہوں۔ باقی کو ذرا کم سنتا ہوں۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"فارغ اوقات اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ ان کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے بہت کم مواقع ملتے ہیں۔"



1 "اصلی نام؟"
"ہما کاشف۔"

2 "پیار کا نام؟"
"ہما ہی ہے۔"

3 "تاریخ پیدائش اور شہر؟"
"10 اپریل/کراچی۔"

4 "اسٹار/قد بغیر ہیل کے؟"
"ARIES/5 فٹ 6 انچ۔"

5 "تعلیمی قابلیت؟"
"گریجویشن۔"

6 "بہن بھائیوں میں آپ کا نمبر؟"
"میرا نمبر پانچواں ہے۔"

ایف ایم ۱۰۵ کی آر جے

باتیں ہما کاشف سے

شاہین رشید

7 "ریڈیو کا پہلا پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟"
"ریڈیو کا پہلا پروگرام 'بی ان اسٹائل' اور وجہ شہرت 'آواز و انداز' بنا۔"

8 "ٹی وی کا پہلا پروگرام؟"
"سچ سویرا۔ مارننگ شو ہے یہی آج کل کر رہی ہوں۔"

9 "میڈیا میں آمد؟"
"اپنے شوق سے 'اپنی کوشش سے آئی۔ ایف ایم 100 میں آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئی۔"

10 "کن کن ایف ایمز میں کام کیا؟"
"ایف ایم 100 'ایف ایم 103' ایف ایم 91' اور اب ایف ایم 105 میں ہوں۔"

11 "ایف ایم سے آپ کی وابستگی؟"
"2001ء میں ایف ایم جوائن کیا۔"

12 "پہلی کمائی۔۔۔ کیا کیا تھا؟"
"پہلی کمائی تو ٹیچنگ کی تھی۔ ایک کوچنگ میں پڑھایا تھا اور کراچی یونیورسٹی میں نگراں ممتحن کے فرائض انجام دیے تھے۔ کمائی کے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔"

13 "سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے؟"
"اپنی برتھ ڈے کا۔"

14 "کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟"
"بہت مرتبہ اور اکثر باتیں سچ ہوتی ہیں۔"

15 "کس شہر میں گھر بنانے کی خواہش ہے؟"
"کراچی میں۔"

16 "کس ملک میں گھر بنانے کی خواہش ہے؟"
"کہیں نہیں صرف پاکستان۔"

17 "کوئی تحفہ جسے پاکر بہت خوشی ہوتی ہو؟"
"میرے پرستار مجھے اکثر تحفہ دیتے رہتے ہیں۔ ان کا

”خلوص و پیار بہت بڑا تحفہ ہے۔“

18 ”انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟“
”بہت کم۔“

19 ”آپ کی فیوچر پلاننگ؟“
”کام کے حوالے سے ہی ہے۔ بہت زیادہ کام کرنا ہے اور اسی فیلڈ میں اپنا کیریر بنانا ہے۔“

20 ”سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟“
”خاموشی' سناٹا' سکون۔“

21 ”مطالعہ ضروری ہے یا وقت گزاری ہے؟“
”بہت ضروری ہے کیونکہ بہت ساری باتیں انسان کتابوں سے سیکھتا ہے۔ کتاب انسان کی بہترین دوست ہے۔“

22 ”پاکستانی معاشرے کی اچھی اور بری بات؟“
”اچھی بات یہ کہ لوگ اچھا کام کرتے ہیں تو اس کو سراہا جاتا ہے اور بری بات یہ کہ انسان جب کوئی کام شروع کرتا ہے تو لوگ نصیحتیں بہت کرتے ہیں۔“

23 ”باہر کے معاشرے کی اچھی اور بری بات؟“
”باہر کے لوگوں میں آگے بڑھنے کا جذبہ بہت ہے اور صبح اٹھنے کی اچھی عادت ہے۔“

24 ”خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟“
”بزدل ہوتا ہے۔ حرام موت مرنے سے بہتر ہے' کوئی اچھا کام کرلے۔“

25 ”آپ کی شخصیت کی کمزوری اور طاقت؟“
”کمزوری یہ کہ لوگوں پر بہت جلدی بھروسا کرلیتی ہوں اور طاقت یہ کہ آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔“

26 ”کوئی تاریخی شخصیت جس سے ملنے کی خواہش ہے یا متاثر ہیں؟“
”کچھ ایسی سیلیبریٹیز ایسی ہیں جن سے ملنے کی خواہش ہے۔“

27 ”میک اپ میں کیا چیز بری لگتی ہے؟“
”سب ہی اچھی لگتی ہیں۔ بری کوئی نہیں لگتی۔“

28 ”میک اپ ایجاد نہ ہوتا تو؟“
”تو ہم اتنے حسین نظر نہ آتے۔“

29 ”کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟“
”اگنور کرنا سب سے زیادہ دکھ کا باعث بنتا ہے۔“

30 ”بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟“
”گانے وغیرہ سن لیتی ہوں یا ٹی وی دیکھ لیتی ہوں۔“

31 ”کس کی یاد تنہائی میں سکون کا باعث بنتی ہے؟“
”بچپن کی یادیں اور ماضی۔“

32 ”صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟“
”کہ کاش! میری فجر کی نماز قضا نہ ہو مگر ہمیشہ ہو جاتی ہے۔“

33 ”گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟“
”اپنے بیڈ روم میں۔“

34 ”کھانے میں کیا پسند ہے؟“
”کچھ بھی مل جائے' سبزی ہو' چاہے پالک ہو' ٹینڈے ہوں۔“

35 ”کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟“
”اماں کے ہاتھ کے کھانے بہت پسند ہیں مگر اب ہر وقت ان کے ہاتھ کے کھانے تو نہیں کھا سکتے۔“

36 ”ناشتا جوش و شوق سے کرتی ہیں؟“
”میں تو ناشتا نہیں کرپاتی' حالانکہ اپنے سننے والوں کو ناشتے کی تاکید کرتی ہوں۔“

37 ”اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟“
”اپنی بہترین دوست شعاع سے۔“

38 ”کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟“
”بہت شدید غصہ آتا ہے۔“

39 ”آئینے کو کتنا وقت دیتی ہیں؟“
”بہت کم وقت دیتی ہوں' کیونکہ مصروف بہت رہتی ہوں۔ ہاں کوئی تعریف کردے تو پھر ضرور دیکھ لیتی ہوں۔“

40 ”کیا آپ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہی ہیں؟“
”ہاں بالکل! اپنی مرضی سے گزار رہی ہوں۔“

41 ”زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟“
”اپنے لیے۔“

42 ”پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟“
”جس چیز کے لیے استعمال کررہی ہوتی ہوں' وہی لکھتی ہوں۔“

43 ”کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟“
”نہیں! میں اپنی صحت کا نقصان نہیں کرتی۔ غصہ میں لوگوں پر نکالتی ہوں' کھانے پہ نہیں۔“

44 ”دل کب ٹوٹتا ہے؟“
”جب لوگوں کا رویہ بہت سخت ہو جاتا ہے اور کوئی نظر انداز کرے تو۔“

45 ”کیا بات جذباتی کردیتی ہے؟“
”کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

46 ”موڈ کب خراب ہوتا ہے؟“
”جب اپنی مرضی سے کوئی کام نہ ہو رہا ہو یا کوئی آپ کو دھوکا دے۔“

47 ”ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟“
”تعلیم بہت ضروری ہے۔“

48 ”کیا آپ اپنی غلط کا اعتراف کرلیتی ہیں؟“
”بالکل جی! کرلیتی ہوں۔“

49 ”پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟“
”سوچتی نہیں! بلکہ ہر نماز میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ میاں پاکستان کو بہت لمبی عمر عطا فرمائے۔“

50 ”آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟“
”عام لوگوں کا تو مجھے نہیں پتا لیکن میں اپنے پورے دن کا ٹائم ٹیبل بنالیتی ہوں اور اسی حساب سے چلتی ہوں۔“

51 ”کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟“
”موبائل' پرس' گلاسز' اے ٹی ایم۔“

52 ”تنہائی میں کس سے ہم کلام ہوتی ہیں؟“
”اپنے آپ سے ہی ہم کلام ہوتی ہوں۔“

53 ”اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کیا؟“
”اب تک نہیں کیا۔ شاید میں واحد ہوں کہ جس نے نمبر نہیں بدلا۔“

54 ”سفر کے لیے بہترین سواری' رکشا' بس یا اپنی کار؟“
”اپنی کار' بڑا سکون رہتا ہے۔“

55 ”کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتی ہیں؟“
”اپنے کپڑوں پہ...... کیونکہ میڈیا کی جاب ہے تو کپڑے اسٹائلش ہونے چاہئیں اور پرفیومز وغیرہ۔“

56 ”کوئی ایسا اینکر جس کے ساتھ پروگرام کرنا چاہتی ہیں؟“
”کسی کے ساتھ نہیں۔“

57 ”اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیے؟“
”اچھی تو یہ کہ جتنا ہو سکتا ہے' لوگوں کی مدد کرتی ہوں اور اسی لیے نقصان بھی اٹھاتی ہوں اور شاید یہی بری عادت ہے کہ بھروسا کرلیتی ہوں۔“

58 ”دھوکا اپنے دیتے ہیں یا پرائے؟“
”اپنے نہیں دیتے۔ پرائے دیتے ہیں۔“

59 ”کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟“
”سعودی عرب۔“

60 ”پاکستان میں کس چیز کی آزادی نہیں ہے؟“
”پاکستان میں تو ہر چیز کی آزادی ہے۔ یہاں ہر شخص ہر ایشو پہ بات کرسکتا ہے۔“

61 ”لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ جملہ؟“
”یار...... کیا ہے۔“

62 ”لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟“
”اوہ...... آپ تو بڑی گلیمرس ہو گئی ہیں۔“

63 ”اگر آپ ملک کی صدر ہوتیں تو؟“
”بہت سی برائیوں کا خاتمہ کردیتی اور تعلیم کو عام کردیتی۔“

64 ”ٹی وی آن کرتے ہی پہلا چینل کون سا لگاتی ہیں؟“
”اے آر وائی ذوق' کیونکہ اس میں میری آواز میں ریسیپی چل رہی ہوتی ہے یا پھر دیکھتی ہوں کہ مارننگ شو میں کس نے کیا ڈریسنگ کی ہے اور کیا ٹاپک ہے۔“

”اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟“
”کوئی بات نہیں...... اللہ اللہ خیر صلا۔“

☆

عنیزہ سیّد

جنوں کی گرد آ تھمے

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔ سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔



ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی' وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کردیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کررہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا' جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

۴
چوتھی قسط

سید پور میلے میں پہلا دن تھا۔ ماہ نور کا ذہن چکرا رہا تھا۔ چاک پر مٹی کے برتن گھڑتے کمہار پر نظر پڑتے ہی اس کے ذہن نے شدید جھٹکا کھایا تھا۔ ماہ نور کمہار کے سامنے کھڑی ایک ٹک اسے دیکھتی چلی جارہی تھی۔

"چلیں۔ اب کچھ کھا لیتے ہیں۔" شاہ بانو نے کچھ دیر بعد اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"ہوں!" ماہ نور چونکی تھی مگر وہاں سے ہلی نہیں تھی۔

"اس برتن کو کیا کہتے ہیں۔" کمہار کے گرد ہجوم ذرا کم ہونے پر اس نے دانستہ آگے بڑھ کر ایک برتن کو چھوتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"ہاتھ نہ لگانا بی بی!" کمہار کے بالکڑے نے تیزی سے کہا۔ "گیلا ہے۔"

بالکڑے کی بلند آواز پر کمہار نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ماہ نور کا خیال تھا کہ اس کی طرح کمہار بھی اس کو دیکھ کر ضرور چونکے گا' مگر اس نے ایک نظر ماہ نور پر ڈالنے کے بعد نظریں جھکا کر اپنا کام دوبارہ شروع کردیا۔ ماہ نور کا ذہن ایک نئی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔

"اب چل بھی دو۔" شاہ بانو نے ماہ نور کا بازو کھینچا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ شاہ بانو کے ساتھ چل رہی مگر نجانے کیوں شاہ بانو کے بھائی تک پہنچتے پہنچتے اس نے کئی بار مڑ کر گیلی مٹی سے برتن گھڑتے اس کمہار کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"چوہدری صیب نے آکھیا اے گول گول تے ایکو جئے گونگلو وکھرے کرلوؤ۔" (چوہدری صاحب نے کہا ہے کہ گول اور ایک جیسے شلجم الگ کرلو) کھاری نے سبزی دھوتی جنت بی بی کو مخاطب کیا۔

جنت نے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے کھاری کی طرف دیکھا۔

"گونگلوواں ری کوئی شپیسل' ہانڈی چاڑھنی اے اج رات دی عوت لئی۔" (شلجموں کا کوئی خاص کھانا بنانا ہے آج رات کو دعوت کے لیے) کھاری نے جنت کو اطلاع دی۔

"تے گاجراں تے ادھیاں کس وی لشیاں نے پا نذیر تے چاچے جمالے نیں۔ ادھیوں تھوڑیاں ای پیچھے رہ گئیاں نیں۔" (چاچے جمالے اور بھائی نذیر نے آدھی سے زیادہ گاجریں کدوکش کر بھی لی ہیں)۔ وہ منہ میں آتا پانی نگلتا بولا۔

"وے بدنیتا۔" جنت نے ہاتھ نل سے نکلتے پانی کے نیچے کرکے ان کی مٹی چھڑاتے ہوئے کہا۔ "تیرا دھیان ہر ویلے کھان پین ول ای کیوں رہندا اے۔" (تیرا دھیان ہر وقت کھانے پینے کی طرف ہی کیوں رہتا ہے)

"دھیان ای رہندا اے نا' کیہڑا میں کھا پی لیندا آں۔" (دھیان ہی رہتا ہے نا' کون سا میں کھا پی بھی لیتا ہوں) کھاری نے نیچی آواز میں کہا۔

"تاویرا نا۔" جنت نے کھاری کو شرمندہ ہوتے دیکھ کر کہا۔ "بندے دی نظر رجی ہونی چاہی دی اے۔" (انسان کی نظر سیر ہونی چاہیے)

"میری نظر رجی ای اے جناب۔" (میری نظر سیر ہی ہے جناب) کھاری تیزی سے بولا۔ "میں نے کدی اکھ چک کے کسی شے ول ویکھیا وی نئیں۔" (میں تو نظر اٹھا کر کسی چیز کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہوں)

"ہے شاباش اے۔" جنت نے چادر کے پلو سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کھاری کو شاباش دی۔ "چلو یہ مٹر کا ٹوکرا اٹھاؤ اور بوریوں میں بھر دو۔"

کھاری نے مٹر سے بھرا ٹوکرا اٹھا کر سر پر رکھا۔ دوسرے ٹوکرے میں سے دھلی دھلائی گاجر نکالی اور اسے کھاتے ہوئے فارم ہاؤس کی طرف چل دیا۔

میں ایتھاں تے ڈھول ملتان اے

وہ بلند آواز میں گا رہا تھا۔

"او نئیں او نئیں۔" پھر اس نے لمحہ بھر کر رک کے خود کو یاد دلایا۔ "اے نئیں گانا۔" اس نے خود کو یاد دلایا اور دوبارہ سے چلنے لگا۔

اوکھے پینڈے لمیاں نے راہواں عشق دیاں
لکھ نہ چھڈے ویکھ وفاواں عشق دیاں۔
(عشق کے راستے دشوار اور مشکل ہیں عشق بندے کے پلے کچھ نہیں چھوڑتا)

گلاب کے پودوں کی کٹائی کرتے افضل اور سعید نے کھاری کی بات سنی اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

"شیدائی ہے بے چارہ۔" افضل نے کہا۔

"جیسا بھی ہے' فارم کی رونق اسی کے دم سے ہے۔" سعید نے ہاتھ روک کر دم لیتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب نے بڑی شفقت رکھی ہوئی ہے اس پر۔" افضل نے مشاقی سے قینچی چلاتے ہوئے کہا۔

"بڑی نیکی ہے۔ بے چارے کا نہ کوئی آگا ہے نہ پیچھا۔ یہ فارم ہی اس کا گھر اور فارم پر کام کرنے والے ہی اس کے گھر والے ہیں۔" سعید نے خیال ظاہر کیا۔

"او فارم چھوڑو' پورا اینڈ ہی اس کا دوست ہے۔" افضل ہنسا۔

"اللہ خوش رکھے اس کو۔" سعید نے قینچی بند کرتے ہوئے کہا۔

پھلاں ورگی جندڑی عشق رلا چھڈ دا
سر بازار جالے عشق نچا چھڈ دا

(پھولوں جیسی زندگی کو عشق خوار کر دیتا ہے عشق کے لیے سر بازار ناچنا پڑے تو بھی ناچتا ہے)

افضل اور سعید کی گفتگو سے لاعلم کھاری راستہ بھر تانیں اڑاتا چلا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم اتنی اپ سیٹ کیوں نظر آ رہی ہو ماہ نو!" شاہ بانو نے سید پور سے واپسی پر پریشان ہوتے ہوئے اسے پوچھا۔

"کیوں ماہ نور۔ کوئی ہٹو (ناگوار) چیز دیکھ لی کیا؟" شاہ بانو کے بھائی عبید نے بھی اس کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں' ایسا تو کچھ نہیں ہے۔" وہ جو مسلسل گاڑی کے شیشے سے باہر گزرتے مناظر پر غیر حاضر دماغی کے ساتھ نظریں ٹکائے بیٹھی تھی' ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ شاہ بانو اور عبید کن اکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کسی الجھن کا شکار ہوں۔

ماہ نور نے ہاتھ پھیر کر اپنے بال سیدھے کیے' چہرے پر ہاتھ پھیرے اور پھر شاہ بانو کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

"ارے کیا ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "شاید میں تھوڑا تھک گئی ہوں۔" اس نے اپنے تئیں دلیل دینے کی کوشش کی۔

"ہے بلی۔" شاہ بانو نے بے یقین نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے شانے اچکائے۔

"شاید ماہ نور کو آج وہاں کچھ اپنی مرضی کے مطابق نہیں نظر آیا۔ کل اسے مزا آئے گا' کل دن میں ایگزیبیشن اور رات میں میوزیکل نائٹ ہو گی۔" عبید نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے آج بھی بہت مزا آیا۔" ماہ نور نے اپنی آواز میں وہ کھنکھناہٹ پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی' جو اس کے لہجے کا حصہ تھی۔ "یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ میں نے اس سے پہلے انسانی کاوش کے ہاتھوں اس طرح آباد ہوا شہر نہیں دیکھا تھا۔ اٹ واز ونڈر فل! بہت منظم' بہت خوبصورت۔"

"مگر سید پور کے مقامی لوگ اس انسانی کاوش سے خوش نہیں ہیں' ان کی آزادی متاثر ہوئی ہے۔" عبید نے کہا۔

"ہاں یہ ان کا پوائنٹ بڑا ویلڈ (صحیح) ہے۔" شاہ بانو کہہ رہی تھی۔

وہ دونوں بہن بھائی اسی موضوع پر بات کرنے لگے۔ ماہ نور کے ذہن پر وہ منظر پھر ابھرنے لگے۔ وہ ان مناظر کے درمیان تعلق جوڑ رہی تھی۔ منطق کی رو سے ان مناظر کا آپس میں کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ نہ ان مناظر کے پس منظر ایک سے ہے' نہ جائے وقوع ایک سی تھیں۔ پھر اس کا ذہن بار بار کیوں اٹکتا تھا۔ وہ خود سے سوال کرتی' اپنے آپ سے الجھتی گھر تک پہنچی تھی۔ اس رات وہ ایک لمحہ کے لیے بھی سو نہ سکی تھی۔ اسے بچپن سے ہی پہیلیوں' جگسا پزلز اور بھول بھلیوں جیسے کھیلوں سے چڑ سی تھی۔ اخبار میں بچوں کے مضمون اور بچوں کے رسائل میں بھی اس قسم کے صفحات سے اسے چڑ محسوس ہوتی تھی' جن میں راستہ ڈھونڈنے اور خزانے تک پہنچنے کی سرخیاں لگی ہوتی تھیں۔ اسے مسٹری موویز اور ایڈونچر فلمیں بھی کچھ زیادہ پسند نہیں تھیں۔ ایسی چیزوں کے بجائے اسے نقطے ملا کر اشکال بنانے والے کھیل زیادہ پسند تھے اور کامیڈی موویز اور رومانٹک فلمیں دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ بھول بھلیوں کے کھیل اور سسپنس کہانیوں میں اس نے کبھی دماغ نہ کھپایا تھا مگر اب اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا سامنا ایک راستہ ڈھونڈ کر خزانے تک پہنچنے والے کھیل یا جگسا پزل کے ٹکڑے ملا کر تصویر بنانے والے چیلنج سے ہو گیا تھا اور وہ چاہنے کے باوجود اپنے ذہن کو اس صورت حال میں الجھنے سے بچا نہیں پا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ عارف خان ہے' یہ ہی تمہارا باپ ہے' یہ ہی تمہاری ماں۔"

جب اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد لفظوں کو سمجھنا سیکھا تو اسے بتایا گیا۔ وہ شخص جس کی شکل سے وہ مانوس تھی' جس کے چہرے پر اس کے لیے نرمی اور محبت تھی' اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اس کا باپ تھا۔ اسے اس بات کو مان لینے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ لفظ باپ کا جو مطلب وہ سمجھتی تھی' عارف خان اس پر پورا اترتا تھا۔

"تم پری ہو پری.... جس کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی ہوتی ہے'۔ جادو کی چھڑی' جس کے ایک سرے پر ستارہ بنا ہوتا ہے۔" عارف خان نے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

"فیریز وینڈ (پری کی چھڑی۔)" مسز پیٹر نے بہت دن بعد جب اسے اس کتاب میں سے پری کی چھڑی کی تصویر دکھائی' جس میں پیاری پیاری چیزوں کی رنگین تصاویر تھیں تو وہ کتنی ہی دیر پلکیں جھپکائے بغیر پری کی چھڑی کی تصویر دیکھتی رہی تھی۔ وہ چھڑی سنہری رنگ کی تھی' جس کے ایک سرے پر سنہری ستارہ بنا ہوا تھا اور جس میں سے سنہری روشنیوں کے جھماکوں کے عکس ادھر ادھر جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

"تو کیا میں ایسی چھڑی والی پری ہوں؟" کافی دیر بعد اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے خود سے سوال کیا تھا اور مسز پیٹر سے پریوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ پریاں جن کی چھڑیاں گھمانے سے ناممکن' ممکن ہو جاتا ہے۔

اس نے عارف خان سے خود کے لیے چھڑی والی پری کا خطاب سنا تھا اور مسز پیٹر سے پریوں کے کرشموں کے ناقابل یقین اور ناقابل فراموش واقعات سُنے تھے اور کبھی کبھی سوچنے پر اسے ایسا لگتا جیسے عمر بھر جو وہ کرتی رہی' وہ خود کو اور اپنے ـــــ دیکھنے والوں کو یہ باور کرانے کے لیے کرتی رہی کہ وہ' واقعی ایک ایسی پری ہے' جو ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔

"ہم اسکول کی کتابیں بھی پڑھیں گے اور اپنے کام کو بھی سیکھیں گے۔" وہ تھوڑی اور بڑی ہوئی تو عارف بابا نے اسے بتایا۔

"ہم کون سے اسکول جائیں گے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

"ہم سیلانی لوگ ہیں پری!" عارف خان بابا نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم ایک جگہ تھوڑی رکتے

ہیں ہم تو شہر در شہر، بستی در بستی گھومتے ہیں' اس لیے ہم کسی اسکول میں بھی نہیں جائیں گے۔"

"تو پھر ہم اسکول کی کتابیں کیسے پڑھیں گے؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"میں پڑھوں گا اور تم کو بھی پڑھاؤں گا۔" عارف بابا نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے یقین دلانے کے سے انداز میں کہا۔

"اور مسز پیٹر بھی تو ہیں۔" پھر عارف بابا نے اسے یاد دلایا تھا۔

"مگر وہ تو کھانا بناتی رہتی ہیں اور جانوروں کو نہلاتی ہیں' ان کو برش بھی کرتی ہیں۔" اسے مسز پیٹر والا آئیڈیا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"ارے بابا! وہ بہت پڑھی لکھی عورت ہے۔" عارف بابا نے اسے تسلی دی۔ "وہ جو بڑا سارا ٹرنک اس کے پاس ہے نا' اس میں ڈھیر سی کتابیں ہیں' وہ کتابیں وہ تم کو پڑھائے گی۔"

پری' عارف خان بابا کی یہ باتیں سن کر آنے والے دنوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھنے لگی تھی' جن میں مسز پیٹر کے ٹرنک میں دھری تصویروں والی ساری کتابیں اس نے ایک ایک کر کے پڑھ ڈالی تھیں اور عارف خان بابا سے وہ سب بھی سیکھ لیا تھا' جو اس کو ہر حال میں سیکھنا ہی تھا۔



وہ پہلی بار بس پر بیٹھی تھی۔ اس سے پہلے اس نے اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر کئی بار پچھلی سڑک سے گزرتی اکا دکا لاریوں کو دیکھا تھا۔ اسے یہ لاریاں کچھ اتنی اچھی نہیں لگتی تھیں کیونکہ وہ دھواں بہت زیادہ چھوڑتی تھیں اور ان میں اکثر ان کی گنجائش زیادہ مسافر لدے ہوتے تھے۔ اکثر مسافر چھتوں پر بھی بیٹھے ہوتے تھے۔ اسے لگتا کہ مسافروں کی زیادتی کی وجہ سے یہ ایک طرف کو جھکی جاتی ہیں اور شاید ایک طرف جھکتے جھکتے کبھی یہ الٹ جائیں اور سارے مسافر گر جائیں۔ وہ خود کبھی لاری پر نہیں بیٹھی تھی۔ اس نے بہت عرصے تک اس بات پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ خود' اس کی اماں اور ابا کبھی کہیں نہیں جاتے۔ اس نے کبھی اپنے ماں' باپ سے یہ سوال ہی نہیں کیا تھا کہ کیا ان کے کوئی رشتے دار عزیز' دوست ایسے نہیں ہیں' جن سے ملنے جانے کے لیے انہیں لاری یا رکشا پر بیٹھنا پڑے۔ اس نے کبھی اس بات پر بھی غور نہیں کیا تھا کہ ان کے گھر کبھی کوئی خالہ' ماموں' نانا' نانی' چچا' تایا' پھوپھی یا دادی' دادا قسم کے رشتے دار کیوں نہیں آتے۔ وہ اپنے اس پہلے سفر سے قبل اپنی ہی ایک الگ دنیا میں مست تھی۔ اسی لیے شاید اس پہلے سفر کے تصور' اپنی رہائش گاہ بدل جانے کے خیال اور عزیز ترین سہیلیوں کے چھوٹ جانے کے احساس تلے وہ سفر سے کئی دن پہلے ہی تھکی ہوئی اور نڈھال تھی۔

گھر کا مختصر سامان ایک تانگے میں پورا آگیا تھا۔ دوسرے تانگے میں وہ اماں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ابا سامان والے تانگے پر کوچوان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ محلے کی تمام خواتین' بچے اور بچیاں' اماں اور اسے رخصت کرنے کے لیے مسجد کی دہلیز سے بڑی سڑک تک قطاروں میں موجود تھے۔

خواتین اماں کے گلے لگ کے آنسو بھی بہا رہی تھیں۔ سب کا خیال تھا کہ وہ اماں کے پڑھائے سبق اور نصیحتیں کبھی بھلا نہ پائیں گی۔ کسی کو اماں کی سلائی کا انداز یاد آرہا تھا' کسی کو ان کے ہاتھ کے ڈالے اچار' چٹنیوں اور مربوں کا ذائقہ یاد آرہا تھا' کسی کو ان کے وہ مشورے یاد آرہے تھے' جو ہر مشکل وقت میں ان کے کام آئے۔

اماں کی گوناگوں صلاحیتوں اور خوبیوں کا ذکر بھی اسی روز پہلی بار سعدیہ کلثوم کے کانوں میں پڑا تھا۔

محلے کے مرد مولوی سراج سرفراز کو رخصت کرنے کے لیے موجود تھے۔ ان کی روانگی سے ایک روز قبل مولوی

صاحب کے لیے الوداعی محفل کرائی گئی تھی' جس میں انہیں ایک عدد نیا سفید جوڑا' سرخ چارخانہ رومال اور سفید ٹوپی کا تحفہ پیش کیا گیا تھا۔ انہیں تلے کا بڑا ہار پہنایا گیا اور ان کے اس مسجد میں گزرے وقت میں ان کی کارکردگی پر خراج تحسین بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس پذیرائی پر مولوی سراج سرفراز کی آنکھیں احساس تشکر سے بھر آئی تھیں۔ ان کی مسکین اور عاجز سی شخصیت کے لیے یہ اعزاز خلاف توقع تھا۔ وہ اہل محلّہ کے مشکور ہوتے ہوئے گلوگیر ہو گئے تھے۔

وقت رخصت بھی مولوی سراج سرفراز شانے پر رکھے زرد چارخانہ رومال سے بار بار اپنی نم آنکھوں کو پونچھ رہے تھے۔ وہ ایک انجان منزل کے مسافر بننے والے تھے' جہاں خدا جانے ان کے لیے کتنی مشکلات تھیں اور کتنی آسانیاں۔

تانگا ایک جھٹکے سے عازم لاری اڈہ ہوا اور سعدیہ کلثوم نے بڑی سڑک سے آگے کے منظر پہلی بار اور شاید آخری بار ہی دیکھنے شروع کیے۔ وہ گھوڑے کی ٹاپوں پر کان دھرے' راستے میں آنے والی دکانوں' گھروں اور دفتروں کو آنکھوں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔

"کاش! پہلے پتا ہوتا کہ بڑی سڑک سے آگے یہ سب کچھ ہے تو کیوں نہ میں کھیلتی کھیلتی سب کو لے کر ادھر ہی آنکلتی۔"

اس نے تانگے کی سواری کے دوران بارہا سوچا تھا۔ جس طرح کے جھٹکے کے ساتھ گھوڑا دوڑنا شروع ہوا تھا' ویسا ہی جھٹکا کھا کر ایک جگہ جا کر رک گیا اور اس نے سعدیہ کو اس کے خیالوں کی دنیا سے نکال باہر پھینکا۔ سعدیہ نے چونک کر دیکھا۔ اس کا کندھا اماں کے آہنی شکنجے جیسے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ سعدیہ بے دھیانی میں جھٹکا کھا کر کہیں نیچے ہی نہ لڑھک جائے۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے اماں سے پوچھا اور سیاہ برقعے کے دوہرے نقاب تلے چھپے ان کے چہرے کے تاثرات جاننے کی کوشش کرنے لگی۔

"آہستہ بول۔ آواز کا بھی پردہ ہوتا ہے۔" اماں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

سعدیہ نے کچھ دیر اماں کے کہے الفاظ پر غور کرنے کے بعد سمجھ نہ آنے پر اپنا دھیان دوسری طرف کرلیا۔ سامان والا تانگہ ان سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا اور ابا اس سے نیچے اتر کر سامان اتروا رہے تھے۔ سعدیہ نے دیکھا ایک روغن اڑے سنگ میل پر "لاری اڈا" کے مٹے مٹے الفاظ نظر آرہے تھے۔

"اوہ تو یہ لاری اڈہ ہے۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچا۔

لاری اڈے کے قریب ہی نہر کا پل تھا۔ سعدیہ نے پانی سے لبالب بھری وہ چوڑی اور لمبی نہر بھی اس روز پہلی بار دیکھی تھی۔ نہر کے کنارے بہت سے لوگ موجود تھے۔ وہ جون کا ایک چلچلاتا دن تھا۔ جب سورج صبح نو بجے ہی سوا نیزے پر محسوس ہو رہا تھا۔ بہت سے لڑکے' جانگیہ پہنے نہر میں چھلانگیں لگانے اور باہر نکلنے میں مشغول تھے۔ نہر کے کنارے سبز تربوزوں کا ڈھیر لگا تھا۔ بہت سے تربوز کنارے کے ساتھ ساتھ بہنے والے پانی کے اندر بھی رکھے ہوئے تھے۔

"کیا یہ تربوز نہر میں بہائے جاتے ہیں؟" سعدیہ کے ذہن میں ایک اور ایسا سوال آیا جو اسے کسی سے نہیں پوچھنا تھا۔

پھر دھواں چھوڑتی' شور مچاتی' کھڑکھڑاتی' نیلے' سرخ اور سبز رنگوں سے مزین ایک ویسی ہی لاری اڈے پر آکر رک گئی' جیسی سعدیہ اپنے گھر کی چھت سے دیکھا کرتی تھی۔ بس میں بیٹھے کچھ مسافر اتر رہے تھے۔ سعدیہ کے ابا

اور ایک آدمی نے مل کر تیزی سے سعدیہ کے گھر کا سامان لاری کی چھت پر منتقل کیا۔ اباجی نے اماں اور سعدیہ کو لاری میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ لاری کا پائدان اونچا تھا اور سعدیہ اس پر چڑھنے سے قاصر۔ اباجی نے آگے بڑھ کر خود اسے اٹھا کر لاری کے اندر رکھ دیا۔

لاری کے اندر قدم رکھنے تک سعدیہ گن چکی تھی کہ لاری کے بیرونی حصے پر روغن سے سبز رنگ کے بیس مور بنے ہوئے تھے اور اس کے پچھلے شیشے پر دو بڑے بڑے پرندے اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ پچھلے شیشے پر "حافظ خدا تمہارا" کے الفاظ بھی درج تھے۔

سعدیہ اور اس کی اماں کو دو ایسی سیٹوں پر بٹھایا گیا جہاں سے ڈرائیور' ڈرائیور کے سامنے کا شیشہ اور اس بڑے شیشے سے پار کے منظر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ سعدیہ کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور اس کھڑکی کا شیشہ بند تھا۔ وہ پسینہ میں نہائی ہوئی تھی اور اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔

اس نے اگلی سیٹ کے مسافر کی تقلید کرتے ہوئے بند شیشے کو پیچھے کھسکایا اور گرم ہوا کے جھونکے سے فیض یاب ہوئی۔ کھڑکی کے شیشے سے مریل مریل آموں کی ریڑھیوں والے' پکوڑوں کے ٹھیلوں والے اور بڑے بڑے کولر اور گلاس تھامے "ٹھنڈا شربت" کا نعرہ لگاتے ہوئے لوگ صاف نظر آرہے تھے۔

ٹھنڈے شربت کے کولر کو دیکھ کر سعدیہ نے اپنے پیاس سے سوکھتے لبوں پر زبان پھیری اور اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ انہیں متوجہ نہ پا کر اس نے دوبارہ کھڑکی سے پار دیکھنا شروع کردیا۔

اسی وقت لاری ایک جھٹکے سے چلنا شروع ہوئی۔ سعدیہ نے گھبرا کر لاری کے سارے مسافروں پر نظر ڈالی' اس کے اباجی کہاں تھے۔ وہ سوار بھی ہوئے تھے کہ نہیں۔ پچھلی سیٹوں میں سے ایک پر بیٹھے اباجی نظر آئے تو اس کی جان میں جان آئی۔ اب لاری نہر کے ساتھ ساتھ بھاگتی چلی جارہی تھی اور اس کے پیچھے سے اگلتے دھویں کے بادل دائیں بائیں بکھرتے بھی نظر آرہے تھے۔ سعدیہ' اماں اور ابا انجان منزل کے مسافر تھے اور تینوں کی نظریں راستے پر تھیں۔ کون جانے کب اچانک منزل آجائے اور ان کا سفر ختم ہوجائے۔

☼ ☼ ☼

اگلا دن تصویری نمائش کا دن تھا۔ ماہ نور نے اس خاص دن کے لیے خصوصی کپڑے' بہت شوق سے بنوائے تھے۔ ایک مصورہ کی حیثیت سے یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بہت اچھی طرح اس سے گزرنا چاہتی تھی لیکن کل کی الجھن اس کے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔ وہ بے دلی سے تیار ہوتی رہی۔ تیار ہونے کے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا رسٹ کلر کی لمبی قمیص اور رسٹ اور سیاہ اسکارف کا گہرا رنگ اس کے چہرے کی اتری رنگت کا ساتھ نہیں دے پارہے تھے۔ اس نے شاہ بانو کے سوالوں سے بچنے کے لیے ہونٹوں پر قمیص سے ہم رنگ لپ اسٹک سجائی اور کانوں میں سیاہ آویزے بھی پہن لیے۔ لیکن ابھی بھی اسے لگ رہا تھا کہ شاہ بانو سوال کیے جائے گی اور وہ اس کے کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے پائے گی۔

نومیڈ آرٹ گیلری سید پور میں اس روز گمنام مصورین کا راج تھا۔ وہ سب اپنی پہلی نمائش کے لیے پرجوش نظر آرہے تھے۔ ماہ نور کے چار کول امیجز (تصویریں) ایک کونے میں رکھی تھیں۔ نمائش دیکھنے والوں میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ' پیشہ ور فوٹو گرافرز' پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے لوگ موجود تھے۔ ماہ نور خاصی پراعتماد شخصیت کی مالک تھی مگر اس روز اسے ایسا لگ رہا تھا وہ یہاں جس حیثیت میں متعارف ہورہی ہے وہ اس کی نہیں ہے' جیسے وہ یونہی کہیں آگئی ہو۔ نقاد اور تبصرہ نگار اس سے اس کی پینٹنگ کے بارے میں سوال

پوچھ رہے تھے اور وہ حیرت انگیز طور پر اپنی توقع کے بالکل برعکس جواب بھی دے رہی تھی مگر اسے اپنا ذہن اس جگہ حاضر محسوس نہیں ہورہا تھا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کسی سحر میں جکڑی ہوئی ہوں۔ مگر وہ کون ہے' جس نے مجھے اس سحر میں مبتلا کر رکھا ہے' وہ کیا ہے؟" وہ وقفے وقفے سے سوچ رہی تھی۔

"کیا آپ یہ اسکیچ بیچیں گی؟" وہ اسی غیر حاضر ذہن کے ساتھ کھڑی تھی جب کسی نے اسے مخاطب کیا۔ ماہ نور نے سر کو ہلکا سا جھٹک کر مخاطب کرنے والے کی طرف دیکھا۔ صبح سے اب تک وہ اپنے ہر مخاطب کے سوال کا جواب حاضر جوابی سے دیتی رہی تھی۔ لیکن اس وقت اسے لگا کہ اس کا ذہن سپاٹ ہوگیا ہے' اس پر جواب کے لیے کوئی لفظ درج ہی نہیں ہورہا تھا۔

"یہ Silhouette (ہلکے رنگ کے پیش منظر میں گہرے رنگ کی تصویر) امیزنگ ہیں۔" اس کا مخاطب کہہ رہا تھا۔

"میں کسی آرگنائزر سے کہہ کر وقتی طور پر اس پر فروخت شدہ کا ٹیگ لگوا سکتا ہوں' قیمت ہم بعد میں طے کرلیں گے۔" ماہ نور اس کی بات سن رہی تھی مگر اس کا ماؤف ہوتا ذہن اس کے الفاظ کے مفہوم سے قاصر تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور وہاں رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس کو یوں بیٹھتے دیکھ کر شاہ بانو جو دور کھڑی کسی سے باتوں میں مصروف تھی' اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ادھر کو لپکی۔

"کیا ہوا۔ تم ٹھیک ہو نا؟" اس نے ماہ نور کے قریب آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ماہ نور نے سر اٹھا کر شاہ بانو کی طرف دیکھا اور اسے تسلی دینے کے لیے سر ہلایا۔ شاہ بانو نے گردن موڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا' جو ماہ نور کے سامنے کھڑا تھا۔

"میں ان سے اس اسکیچ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" شاہ بانو کو اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر اس نے وضاحت کی۔

"جی کیا پوچھنا تھا آپ کو؟" شاہ بانو نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"یہی کہ اگر یہ اسے بیچنا چاہیں تو میں انہیں اس کی منہ مانگی قیمت دے سکتا ہوں۔"

شاہ بانو نے بے یقینی سے اس لڑکے کی طرف دیکھا۔ "اس کا دماغ چل گیا ہے شاید۔ ایک نو آموز آرٹسٹ کے ناپختہ سے کام کی منہ مانگی قیمت!" اس نے سوچا۔

"آپ بعد میں سوچ کر بتادیجیے گا۔" وہ لڑکا ماہ نور سے مخاطب ہوا۔ "ابھی صرف اتنی اجازت دے دیجیے کہ میں اس پر سولڈ کا ٹیگ لگوا دوں۔"

شاہ بانو نے ماہ نور کا ردعمل جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ ماہ نور نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"او تھینکس۔" لڑکا خوش ہو کر بولا۔ وہ اتنا خوش نظر آرہا تھا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہال کے دوسرے سرے پر چلا گیا تھا۔ اسے کسی آرگنائزر سے ملنا تھا شاید۔

"تم بہت خوش قسمت ہو ماہی!" شاہ بانو متاثر ہوتے ہوئے بولی۔

"پہلی ایگزیبیشن کے پہلے دن منہ مانگی قیمت پر سیل ہوگیا تمہارا کام۔"

ماہ نور خاموش بیٹھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اسی جگہ ٹکی تھیں' جہاں وہ لڑکا کھڑا کسی سے بات کررہا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر کئی منظر ابھر اور غائب ہورہے تھے۔

"ماہی!" شاہ بانو نے اس کے شانے کو جھنجھوڑا۔ "لگتا ہے تم حیرت اور خوشی کے مارے بے ہوش ہونے والی ہو۔" اس نے کہا اور بیگ سے اپنا سیل فون نکالا۔ "ٹھہرو! میں عبید بھائی کو یہ بریکنگ نیوز دے دوں۔"

شاہ بانو کے بھائی عبید کو بھی یہ خبر اپنی کامیابی محسوس ہورہی تھی۔

"دیکھو۔ یہ ماہ نور منع کر رہی تھی کہ اسے اپنا کام ایگزیبیشن میں نہیں رکھنا۔" وہ بار بار کہہ رہے تھے۔

"اسے کہتے ہیں اچانک کامیابی ملنا۔" شاہ بانو بھی بہت خوش تھی۔

"لیکن مجھے تو یہ اسکیچز نہیں بیچنے تھے۔" دوپہر کے کھانے کے بعد ماہ نور کا ذہن تھوڑا ٹھکانے پر آیا تو اس نے کہا۔

"لو بھلا۔" شاہ بانو کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ "کیوں نہیں بیچنے تھے۔" اس نے سوال کیا۔ "اور اگر نہیں بیچنے تھے تو اس وقت سر کیوں ہلا دیا تھا جب وہ لڑکا تم سے کہہ رہا تھا اس پر سولڈ کا ٹیگ لگا دو۔"

"پتا نہیں۔" ماہ نور نے کوک کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلا اور گلاس پر چمکتے پانی کے قطروں کو انگلی سے مٹانے لگی۔

"یہ تو بہت عجیب اور غلط بات ہے۔" شاہ بانو خفگی سے بولی۔

"بے اصولی کی بات ہے بلکہ۔" عبید بھی جھلا کر بولا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ اسے میں یہ اسکیچ دوں گی نہیں۔" ماہ نور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے یہ کہا کہ میں اسے بیچوں گی نہیں۔"

شاہ بانو نے اس کی بات سن کر ہونٹ بھینچ لیے۔

"یعنی تم اسے یہ اسکیچ تحفتاً" پیش کرو گی؟" شاہ بانو نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جسے تم جانتی ہو نہیں اور جو کہیں دور دراز سے بھی تمہارے ماے، چاچے کا پتر نہیں۔"

"کیا ہے بھئی۔" ماہ نور نے اکتا کر جواب دیا۔ "نہیں بیچنے مجھے، مجھ سے غلطی ہو گئی جو بغیر سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔ اب اس غلطی کو کسی طریقے سے نبھانا تو ہے۔ آپ......" اس نے عبید کی طرف دیکھا۔

"عبید بھائی پلیز" اس سے کوئی قیمت ویمت نہیں لیجیے گا۔ بس اس کو دے دیجیے گا۔"

"تم ہوش میں تو ہو؟" شاہ بانو نے زور سے اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔ "منہ مانگی قیمت دے رہا ہے وہ پاگل!" اس نے ماہ نور کو یاد دلانا چاہا۔

"وہ بے وقوف ہے۔" ماہ نور ہلکا سا مسکرا کر بولی۔ "ایسے ناپختہ کام کی منہ مانگی قیمت دینے کا کہہ گیا ہے۔ شاید اس کے پاس بہت فالتو پیسہ ہے۔"

"اگر وہ بے وقوف اور فضول خرچ ہے تو پھر میں بھی اتنی مین (لالچی) نہیں ہوں کہ بے سبب پیسے لے لوں اس سے۔ مجھے اپنے کام کی ورتھ (قیمت) کا خوب اندازہ ہے۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے ماہی!" شاہ بانو خفا ہو گئی۔ "پیسے مل رہے ہیں تمہیں ہم ان پیسوں سے اتنے مزے کر سکتی ہو کہ حد نہیں۔"

"میں ابھی بھی مزے کر رہی ہوں۔" ماہ نور نے بے نیازی سے کہا۔

"اتنے کہ حد نہیں۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اوپن ایر ریسٹوران ملکی، غیر ملکی لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ غیر ملکی لوگوں کے لیے یہ ریسٹوران پاکستانی دیہی ثقافت کا آئینہ دار تھا اور وہ یہاں آکر خوش نظر آ رہے تھے۔

"ایک بار پھر سوچ لو میری بہن!" تھوڑی دیر کے بعد شاہ بانو اپنی خفگی جھٹک کر پیار سے بولی۔

"اس میں سوچنے کی تو بات ہے ہی نہیں۔ میں نے کبھی کوئی چیز فروخت کرنے کا سوچا ہی نہیں۔ یہ میرے بچپن کا کام ہے، جسے میں نے یوں ہی موقع ملنے پر نمائش کے لیے رکھ دیا۔ سوچا تھا ایک دن کے لیے ذرا سا اہم بن جانا کیسا لگتا ہے، یہ جان لوں گی۔ میں یہاں خریدنے بیچنے کے لیے نہیں آئی تھی۔" ماہ نور نے حتمی لہجے میں جواب

دیا۔

"بچپن کا نہیں لڑکپن کا۔" شاہ بانو نے ناراضی کے باوجود تصحیح کی۔

"جو بھی ہے۔" ماہ نور نے شانے اچکائے۔ "عبید بھائی! آپ کے پاس اگر اب آئے اسکیچ لینے تو اسے بس دے دیجیے گا۔" اس نے ایک بار پھر عبید سے اپنی بات دہرائی۔ وہ دونوں بہن بھائی یقیناً" اس کی عقل کا ماتم کر رہے تھے۔ جب ہی دونوں بالکل خاموش ہو گئے۔

وہ سہ پہر اور شام انہوں نے سید پور گاؤں کے مقامی لوگوں سے ملنے میں گزار دی۔ تھوڑی دیر کی خفگی کے بعد شاہ بانو کا موڈ خود ہی ٹھیک ہو گیا تھا اور وہ بھی ان لوگوں سے محو گفتگو تھی۔

"ان لوگوں کے مسائل سننے والے کان لگتا ہے، بالکل بند ہیں۔" واپس میلے والی جگہ کی طرف آتے ہوئے ماہ نور نے کہا۔

"ہاں۔ وہ کان تو اسی پلینڈ ویلیج (ایک منصوبے کے تحت بسائے گئے گاؤں) کی پروموشن کی تعریف سننے میں مشغول ہیں۔ یہاں آئے دن ڈھول بجتے اور تماشے ہوتے ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کو ثقافت کے نام پر تفریح مہیا کر کے پیسہ کمایا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کی آواز سننے والے لوگ کہاں۔" شاہ بانو نے کہا۔

"ویسے ماہی!" پھر شاہ بانو رک کر بولی۔ ماہ نور نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کتنا ہینڈسم تھا وہ لڑکا جو منہ مانگی قیمت دے رہا تھا اسکیچ کی۔" شاہ بانو کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ماہ نور کی نظروں کے سامنے کا منظر یہ بات سن کر ایک بار پھر گڈمڈ ہونے لگا تھا۔ اس کے ذہن نے پھر ایک جھٹکا کھایا تھا۔

"کہیں تم پر لٹو تو نہیں ہو گیا؟" شاہ بانو نے شرارت سے ایک آنکھ بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔ "کتنی فلمی صورت حال ہے۔ ایک ناپختہ اسکیچ کی منہ مانگی قیمت.... ڈیشنگ لڑکا.... واہ کیا بات ہے۔"

ماہ نور تیز قدموں سے چلتی شاہ بانو سے آگے چلی گئی۔

"اچھا سوری!" شاہ بانو کو لگا وہ اس مذاق پر ناراض ہو گئی تھی۔ "میں صرف مذاق کر رہی تھی بھئی۔"

ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ "کوئی بات نہیں۔"

"کیا بات ہے ماہی.... تم کیوں اتنی اپ سیٹ ہو جاتی ہو اچانک۔" شاہ بانو نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ہے۔" ماہ نور نے سر جھٹکا۔ "چلو، عبید بھائی بلا رہے ہیں۔" اس نے شاہ بانو کے ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر کال آتی دیکھ کر کہا۔ وہ دونوں گیلری کی طرف چل دیں۔

"اپنی سیٹس پر قبضہ کر لو۔" عبید نے انہیں دیکھ کر دو کارڈ پکڑائے "میوزیکل نائٹ شروع ہو رہی ہے۔"

☼ ☼ ☼

انہیں ہر کام وقت پر کرنے کی عادت تھی۔ یہ کوشش بھی ان کے مزاج کا حصہ تھی کہ وہ جو بھی کام کریں وہ مکمل ہو، اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اپنی اس عادت کو وہ اکثر اپنے ساتھ کام کرنے والوں پر بھی لاگو کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس حد تک اس کوشش میں کامیاب رہے تھے کہ ان کے ہر پروجیکٹ کا عملہ مستعد اور چوکنا رہتا تھا۔ عملے کا جو رکن ایسا کرنے میں ناکام رہتا تھا، ان کے پاس اس کی مدت ملازمت اکثر بہت مختصر ہوتی تھی۔ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے ان کے ہر پروجیکٹ کا عملہ "پرفیکٹ پروفیشنلز" پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان کے قریبی دوست اور شناسا لوگ ان کے بارے میں اکثر ایک ہی رائے دیتے تھے۔ وہ انہیں پرفیکٹ بزنس مین کا خطاب دیتے تھے۔ وہ کسی کا نقصان کرتے تھے، نہ کسی کو اپنا نقصان کرنے دیتے تھے۔ ان کی شخصیت کی ایک اور خوبی خود اپنا احتساب کرتے رہنا تھا۔ وہ اپنی خامیوں، غلطیوں اور نفع نقصان

کا بھرپور تجزیہ کرتے اور انہیں نہ دوہرانے کے طریقے سوچنے پر کافی غور و فکر کیا کرتے تھے۔
یہ ان کی پیشہ ورانہ زندگی کی خوبیاں تھیں۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ یہ سب اصول و ضوابط لاگو کرنے میں کامیاب رہے تھے یا نہیں' یہ سوچنے کی کبھی بلال سلطان نے دانستہ کوشش نہیں کی تھی۔

✡ ✡ ✡

سنڈریلا' گولڈی لاک' ریڈ رائیڈنگ ہڈ' ہنسل اور گریٹل کی کہانیوں سے مطالعہ کا آغاز کرنے والی پری نے خود اپنے آپ کو ایسی ہر فیری ٹیل (پریوں کی کہانی) میں موجود پایا تھا۔ پریوں کی کہانی کی پری مہربان' خوب صورت' خوش اخلاق' ہر ایک کی مدد کرنے ۔۔۔ اور معجزے دکھانے والا کردار تھی۔ پری نے کہانیوں کی پریوں سے بہت کچھ سیکھا۔ مسز پیٹر نے اسے ہندسوں سے بھی متعارف کروایا اور یہ بھی بڑی مزے کی بات تھی کہ مسز پیٹر کے پاس ایسی کتابیں بھی تھیں' جن میں ہندسے انسانی اور جانوروں کی شکلوں میں اپنا آپ متعارف کرواتے تھے۔
ہندسے جو کبھی کہتے ہمیں جمع کرو' کبھی کہتے ہیں' تفریق یا تقسیم کرو۔ کبھی ایک چھوٹا ہندسہ اپنے سے اوپر والے ہندسوں کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا ہوتا ہے "ان کو مجھ سے ضرب دے کر دیکھو یہ کتنے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ان ہی ہندسوں نے کبھی انفرادی طور اور کبھی اکٹھے ہو کر اسے بتایا کہ وزن' رفتار' وقت اور رقبے کے بارے میں ان کے ذریعے کیسے جانا سکتا تھا۔ مسز پیٹر نے ہی اسے زبان سے روشناس کرایا۔ پریوں کی کہانیاں پڑھنے کے بعد اسے انگریزی اور اردو زبان کی ایسی کتابیں پڑھنے کو دیں' جن سے اس کو زبان کے لہجے اور صرف و نحو کا پتا چلا۔ عارف بابا نے اسے مسز پیٹر کے ٹرنک کا خزانہ چاٹ لینے پر لگا دیا' مگر عارف بابا کام کے معاملے میں سست نہیں تھے۔
پری کی دوپہریں مسز پیٹر کے خزانے چاٹنے میں گزرتیں' صبحیں' اور شامیں سخت مشقت میں۔ وہ بلیو ہیون سرکس کی بچی تھی' جہاں باہر سے آ کر لوگ کرتب دیکھتے تھے اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے سیکھے ہوئے کرتبوں کا مظاہرہ کرتے تھے' پھر وہ تو پیدا ہی سرکس کی سرگرمیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ اسے کرتب سکھانا اور سرکس کا حصہ بنانا لازمی تھا۔ پری کی تربیت چھوٹی چھوٹی گیندیں ہوا میں اچھال کر دوبارہ دبوچنے سے شروع ہوئی تھی۔ وہ ہوا میں گیند اچھالتی مگر دوبارہ پکڑنے سے پہلے ہی گیند ادھر ادھر بکھر جاتی وہ کئی بار گیندوں کو قابو کرنے کی کوشش میں گری' کبھی منہ کے بل' کبھی بازو کے بل اور کبھی چت' کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بھاگتے بھاگتے اس کا سر کسی ستون یا سامنے آنے والے بندے سے ٹکرا جاتا۔ وہ گر کر منہ بسورتی۔ عارف بابا کی آواز اسے دائیں' بائیں' سامنے یا عقب سے سنائی دیتی۔
"یہ تو میجک ہے پری میجک۔ جس کو آ جائے' وہ کبھی بھی کسی بھی چیز کو کچھ بھی بنا لیتا ہے۔ انڈے سے طوطا نکال لیتا ہے۔ رومال سے خرگوش اور ہیٹ سے کبوتر۔ تم نے تو خود دیکھا ہے عابد انکل اور صائمہ آنٹی کے شوز میں کیا کیا نہیں ہوتا۔"
منہ بسورتی پری کے کان میں پڑنے والی یہ آواز بھی جادوئی اثر رکھتی تھی۔ اپنے چوٹ کھائے اعضا کی تکلیف بھول کر پری اپنی تمام گیندیں اکٹھا کر کے دوبارہ ہوا میں اچھالنے میں مشغول ہو جاتی۔
جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی گیند اچھالنے کا کرتب اس کے سامنے بچہ بنتا گیا۔ بچہ پیچھے رہ گیا اور وہ بڑی سے بڑی ہوتی چلی گئی۔ صرف سات سال کی عمر میں وہ ہاتھی' شیر اور کتے قابو کر کے انہیں اپنی چھڑی کے اشارے پر چلانے' نوکیلی سوئیوں کے بستر پر ہنستے کھیلتے لیٹنے' آگ لگے رنگ میں سے مسکراتے ہوئے گزر جانے اور الماری میں بند ہو کر صندوق سے نکلنے کے کرتب پر مہارت حاصل کر چکی تھی۔
بلیو ہیون سرکس جس شہر میں بھی جاتا' اس کے اشتہاروں اور بینروں پر پری کا ذکر خصوصی طور پر درج ہوتا۔

پری کی تصویریں بھی اشتہاروں پر موجود ہوتیں۔ ہاتھی اور شیروں پر تفاخر کے ساتھ بیٹھی بچی' جو اپنے کرتبوں کے ذریعے تماشائیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ لوگ مارے تجسس اور شوق کے خاص طور سے اس چھوٹی بچی کے کرتب دیکھنے آتے تھے۔ جو ببر شیر کے جوڑوں کے ساتھ کھلے میدان میں تماشا کرتی تھی اور ہاتھیوں کی پشت پر کھڑے ہو کر ہوا میں لہراتی' قلابازیاں کھاتی' دوبارہ چلتے ہوئے ہاتھی کی پشت پر آن کھڑی ہوتی تھی۔ سرکس کے منتظمین پری کے کرتب عموماً" آخر میں رکھتے تھے تاکہ تماشائیوں کے شوق اور تجسس کو خوب ہوا دے لینے کے بعد اسے سامنے لایا جائے۔
پری کی رِنگ میں آمد تالیوں اور سیٹیوں کے شور میں ہوتی اور جب وہ رِنگ سے نکلتی' اپنے پیچھے تالیوں' نعروں اور سیٹیوں کی گونج چھوڑ کر آتی۔
"پری کی چھڑی' لمحہ بھر میں ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔"
عارف بابا کو اپنی ٹریننگ پر فخر محسوس ہوتا تو وہ سینہ پھلا کر اعلان کرتے اور بہت دفعہ ایسا ہوا کہ عارف بابا کی یہ بات سنتے ہوئے کچھ دیر سانس لینے کو ستاتی ہوئی پری ٹریننگ ایریا میں اپنے سامنے موجود جانوروں اور انسانوں کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگتی۔
"تماشا دیکھنے والے لوگوں کو یہ کبھی نہیں پتا چلے گا کہ ان ہاتھیوں' گھوڑوں' شیروں' کتوں اور انسانوں نے اپنے اپنے کرتبوں پر مہارت حاصل کرنے کے لیے کتنی مار کھائی' کتنی بار چمڑیاں ادھڑوائیں۔ ان میں کتنوں کے کاسٹیومز کے نیچے چھپے جسموں پر مار کے کتنے زخم اور کتنے نشان ہیں۔ تماشا دیکھنے والوں کو کبھی پتا نہیں چلتا اور کبھی پتا چلے گا بھی نہیں کہ ان کے سامنے آ کر بلی بنے شیر کتنے دن بھوکے رکھے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنا کرتب سیکھنے کی ہار مان لیں۔ ان بڑے بڑے ہاتھیوں کی موٹی سخت کھالیں کہاں کہاں سے ادھڑی ہوئی ہیں اور ان کتوں کے دانت کیسے کمزور کر دیے گئے ہیں۔"
"شش" پھر وہ خود کو یاد دلاتی۔ "تماشا دیکھنے والوں کو کبھی پتا چلنا بھی نہیں چاہیے۔ کیونکہ اگر انہیں پتا چل گیا تو انہیں تماشا بھول جائے گا۔ صرف ظلم یاد رہ جائے گا اور دنیا بھر کے سرکس بند ہو جائیں گے۔"
وہ جیسے خود اپنے کان میں سرگوشی کرتی اور ایسا سوچتے ہوئے خود اس کے اپنے جسم پر نجانے کہاں کہاں تازہ اور مندمل ہو چکے زخموں کا درد اٹھنے لگتا تھا۔ اس کے پیروں کے تلووں میں جلن شروع ہو جاتی۔ ٹریننگ کے دوران پاؤں ایک بار غلط پڑ جانے پر نجانے کتنے بید ان کی نذر کیے جاتے تھے۔
اذیت کا ایک ابال اس کے اندر اٹھتا' جس کو وہ صرف ایک چیز کے تصور سے اندر ہی بٹھا دیتی۔ اور وہ چیز مسز پیٹر کا خزانے سے بھرا ٹرنک تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ میوزیکل نائٹ بھی شاید ٹیلنٹ ہنٹ اسکیم (کسی میدان سے متعلق خوبی اور مہارت رکھنے والے لوگوں کی تلاش کا منصوبہ) کے تحت منعقد کی گئی تھی۔ ایک سے ایک ایسا گروپ اسٹیج پر وارد ہو رہا تھا' جس کا پہلے کبھی کسی نے نام سنا تھا نہ گانا سنا تھا۔ ان گروپس کے ساتھ مختلف صوبوں کے روایتی لباسوں میں ملبوس ان کے ساتھی عجیب و غریب رقص بھی کر رہے تھے۔
"ڈانس کم یہ ایکسرسائز زیادہ ہے۔" ایک گروپ کی پرفارمنس دیکھتے ہوئے شاہ بانو نے ماہ نور کے کان میں سرگوشی کی۔
"سب سے ڈبا آئٹم ہے یہ اس میلے کا۔" ماہ نور نے کہا۔ "بہت فضول اور بکواس۔ وقت ضائع کر رہے ہیں ہم

لوگ بس۔"

"اب کیا کریں، پھنس گئے ہیں۔" شاہ بانو نے بے بسی سے کہا۔ ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھ کر ایک لمبا سانس لیا اور پھر اسٹیج کی طرف متوجہ ہوئی جس کے چاروں کونوں سے روشنیاں اٹھ رہی تھیں۔ ایک نیا گروپ سندھ کا کوئی علاقائی گیت سنا رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا یہ گیت انگریزی لہجے میں گا کر اس کی سخت توہین کی جا رہی ہو مگر تماشائیوں میں موجود نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بازو اٹھا اٹھا کر موسیقی کی تال پر رقص کر رہے تھے۔

"ہمارا اخلاقی کلچر تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔" ماہ نور کو خدیجہ آنٹی کی بات یاد آئی اور خدیجہ کی یاد کے ساتھ ہی اسے فاطمہ اور فلزا ظہور بھی یاد آگئیں۔

"کل اس میلے سے فارغ ہو کر شاہ بانو سے کہوں گی کہ فلزا ظہور کا پتا لگاتے ہیں۔" اس نے دل میں سوچا اور کوئلے کے ٹکڑے سے چار کول تک کا سفر کرنے والی فلزا ظہور کے بارے میں سوچنے لگی۔

وہ ان ہی خیالوں میں گم تھی، جب اسے اچانک محسوس ہوا کہ جیسے اس کے اردگرد شور اور کچھ دیر پہلے مچا ہوا اہلڑ تھم سا گیا ہو۔ اس نے چونک کر اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا، جن کی متجسس نظریں سامنے اسٹیج پر جمی ہوئی تھیں۔ ان ہی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی نظریں بھی اسٹیج پر جا رکیں۔ اسٹیج پر اپنے اپنے ساز سجائے دو لڑکے کھڑے تھے اور ان سے آگے مائیک کے ساتھ جو لڑکا کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے گلے میں تہہ کی ہوئی سفید چادر لٹک رہی تھی اور سر پر کس صوبے کی علاقائی ٹوپی تھی۔ اس کا اندازہ ماہ نور کو نہیں ہو سکا۔ اس لڑکے کے چہرے پر سیاہ چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی سجی تھی۔

"میری آپ لوگوں سے صرف اور صرف ایک ریکویسٹ ہے۔ ہماری پرفارمنس کے دوران خاموش رہنے کی کوشش کیجیے گا۔ پلیز نو شور، نو تالیاں، اینڈ نو وسلز (سیٹیاں)"

"ایگریڈ؟" (منظور ہے؟) مائیک والا لڑکا ہجوم سے اپنی درخواست کرنے کے بعد سوال کر رہا تھا۔

مجمع میں موجود اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں یس یس اور اچھل اچھل کر رضامندی ظاہر کر رہے تھے۔

"سو پلیز! کیپ سائلنٹ ناؤ۔" (برائے مہربانی اب خاموش ہو جائیے)

ان لوگوں سے منظوری لینے کے بعد وہی لڑکا بولا۔ مجمع پر وقتی طور پر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر میں ان گلوکاروں کے آلات موسیقی بجنے شروع ہوئے۔ یہ کسی علاقائی گیت کی دھن تھی اور کانوں کو مانوس بھی لگ رہی تھی۔

عشق تے آتش دونوں برابر
ادھے عشق دا تاؤ کھیرا
آتش سدا سارے ہے پکھ نپان
ادھے عشق سڑے دل جھیڑا
آتش پانی نال بجھیندی
ادھے عشق دا دارو کھیڑا
غلام فرید اوتھے جاہ نہ رکھی
جتھے عشق لائے گا ڈیرا
(عشق اور آگ دونوں برابر ہیں
لیکن عشق کی تپش الگ ہی ہوتی ہے
آگ انسانوں کو بھوکا پیاسا جلاتی ہے
لیکن عشق میں دل جو جلتا ہے

آگ پانی سے بجھ جاتی ہے
لیکن عشق کا کیا علاج ہے
غلام فرید!! وہاں مت ٹھہرنا
جہاں عشق نے ڈیرا لگا رکھا ہو)

گانے والا ایک جذب کے عالم میں گا رہا تھا اور مجمع پر سکوت طاری تھا۔ ماہ نور کے ابرو اس آواز کی کشش سے اوپر چڑھے یا کسی اور بات سے..... مگر وہ آنکھیں سکیڑے غور سے اس گلوکار کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

یار ڈاڈھی عشق آتش لائی ہے

اس نے تان اٹھائی اور مجمع جیسے ہوش میں آگیا۔ تالیاں، سیٹیاں اور واہ واہ کی آوازیں ہر طرف گونجنے لگیں۔

"سائلنس پلیز۔" اسٹیج سے گائیکی روک کر درخواست کی گئی۔ آوازیں مدھم پڑنے لگیں۔

یار ڈاڈھی عشق آتش لائی اے
وے یار سانوں لگ گئی بے اختیاری
سینے دے وچ نہ سمائی ہے
یار ڈاڈھی.....

اسٹیج سے پھر آواز ابھری۔

گانے والا ایک جذب کے عالم میں گا رہا تھا۔ شور مچاتا، سیٹیاں بجاتا، تالیاں پیٹتا مجمع سکوت کے عالم میں تھا۔

ہو یار سانوں لگ گئی بے اختیاری

الفاظ دہرائے جا رہے تھے اور ماہ نور کے کان جیسے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس نے اپنی سیٹ کی پشت چھوڑی اور سیٹ کے کنارے پر آگے ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر پہچاننے کی مشق میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ اس کے کان مانوس آواز کا تعاقب کر رہے تھے۔

ہل ہلاں کے عشق جو آیا
اوکھے پینڈے لمیاں نے راہواں عشق دیاں.....
گھٹی گھٹی شام آئی ہے
ککھنہ چھڈے ویکھ وفاواں عشق دیاں.....

"سن سن سن۔" ماہ نور کے کان بجنے لگے اور اس کی سماعتوں میں آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں۔

بابے منگو کے میلے میں اکتارہ بجاتا سائیں، سید پور کلچر فیسٹیول میں بہترین ساؤنڈ سسٹم اور جدید ترین آلات موسیقی کے ساتھ مائیک پر گاتا یہ نوجوان.....

"یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔" اس نے زور سے سر کو جھٹکا اور گڈمڈ ہوتی آوازوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا۔

"اف! اس کی آواز سنی ہے۔" شاہ بانو نے سحر زدہ انداز میں ماہ نور کا شانہ دبایا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ کوک اسٹوڈیو کے اگلے سیزن میں نظر آنے والا ہے۔" شاہ بانو اس کے سنسناتے کان میں کہہ رہی تھی۔

پھلاں ورگی جندڑی عشق رلا چھڈ دا
سر بازار جالے عشق نچا چھڈ دا

ماہ نور کو لگا، جیسے وہ ذہنی طور پر ماؤف ہو رہی تھی۔ وہ سحر زدہ انداز میں اٹھ کر آہستہ قدموں سے چلتی اگلی نشستوں طرف چل دی۔

"ماہ نور کہاں جا رہی ہو؟" شاہ بانو اس کی پیچھے لپکی۔

"یہ شخص۔۔۔ یہ شخص۔" ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ شاہ بانو کو ایسا لگا جیسے اس کے سامنے ماہ نور نہیں کوئی زومبی کھڑی ہو۔

"کون شخص؟" شاہ بانو نے پریشان ہو کر اس جانب دیکھا جہاں ماہ نور دیکھ رہی تھی۔

"پلیز بیٹھ جائیں۔" مجمع میں سے کسی نے ان دونوں سے درخواست کی تھی۔

"اچھا ادھر آؤ۔" شاہ بانو نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اسے نشستوں کے ساتھ خالی جگہ کی طرف لے جانا چاہا مگر ماہ نور ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے اسٹیج کے بیچ میں کھڑے شخص کو دیکھے جا رہی تھی۔

"اُفوہ!" شاہ بانو جھنجلائی اور ماہ نور کا بازو پکڑ کر اسے تقریباً" گھسیٹتی ہوئی خالی جگہ کی طرف لے گئی۔

"کیا ہو گیا ہے ماہ نو!" شاہ بانو نے ماہ نور کو زور سے جھنجھوڑا۔

پھلاں ورگی جندڑی
یار ڈاڈھی عشق آتش
ککھ نہ چھڈے
سینے دے وچ نہ سمائی
اوکھے پینڈے لمیاں نے راہواں۔۔۔

ماہ نور کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا' وہ چکرا کر گر جائے گی۔ الفاظ اس کی سماعتوں پر بازگشت کی طرح بکھر رہے تھے۔

"ماہ نور۔۔۔ ماہ نور!" پھر اسے شاہ بانو کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"شاہ بانو! یہ شخص پتا نہیں کون ہے' یہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے' ہر جگہ۔" وہ بڑبڑائی۔

"مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔" شاہ بانو نے گھبرا کر کہا۔ "چلو گھر چلتے ہیں۔" وہ ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

اس نے پلٹ کر مجمع میں بیٹھے عبید کو تلاش کرنا چاہا۔ عبید اسے نظر نہیں آیا۔ شاہ بانو نے اپنا فون نکال کر عبید کا نمبر ملایا۔ وہ بے چینی سے فون اٹینڈ کیے جانے کی منتظر تھی۔

"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو۔" شاہ بانو کی گرفت ماہ نور کے ہاتھ پر ڈھیلی ہوئی اور وہ ہاتھ چھڑا کر کسی سمت لپکی۔ شاہ بانو فون بند کر کے اس کے پیچھے بھاگی۔

اسٹیج پر کچھ لمحے پہلے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا شخص اپنے ساتھیوں سمیت نیچے آکر تماشائیوں میں شامل ہو رہا تھا۔ تماشائی اس کی آواز پر سحر زدہ تھے اور اس کے خاموش ہونے پر جیسے طلسم ٹوٹنے کے بعد ہوش میں آئے تھے۔

"ونس مور' ونس مور۔" تماشائی اس سے مطالبہ کر رہے تھے اور ماہ نور نے تماشائیوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

"تم چھلاوے ہو' ساحر ہو یا تم بہروپیے ہو۔" ماہ نور نے اس لڑکے کا بازو پکڑ لیا' جس نے سیاہ رنگ کی شلوار قمیص اور پگڑی پہن رکھی تھی۔

لڑکے نے ٹھٹک کر شور مچاتے حاضرین کے درمیان اس لڑکی کو دیکھا' جس کی گرفت میں اس کا بازو یوں جکڑا تھا جیسے کسی طور نہیں چھوڑے گی۔

"شٹ اپ ماہ نور! کیا بے وقوفی ہے۔" شاہ بانو نے بھی کسی نہ کسی طرح لوگوں کے درمیان راستہ بنا لیا تھا اور ماہ نور تک جا پہنچی تھی۔

"تمہیں نہیں پتا یہ شخص ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتیں۔" شاہ بانو نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ شور مچانے لگی۔ شاہ بانو نے خجل ہو کر دلچسپی سے اس منظر کو دیکھتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا' کیمروں کے فلیش جگہ جگہ جل بجھ رہے تھے۔

"آئی ایم رئیلی سوری۔" شاہ بانو نے اس لڑکے سے کہا۔ اس کی نظروں میں شرمندگی تھی۔

"اٹس اوکے۔" لڑکے نے نرمی سے ماہ نور کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنا بازو چھڑایا۔

"کاہے کو جذباتی ہو رہی ہو مس!" مجمع میں سے کسی نے جملہ کسا۔ شاہ بانو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"نو ہوٹنگ پلیز۔" وہ لڑکا اس طرف کو رخ کر کے بولا' جہاں سے جملہ آیا تھا اور ان لڑکیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا ہاتھ ہلانے لگا جو اپنے ہاتھوں' بازوؤں' مفلروں اور دوپٹوں پر اس کے آٹو گراف مانگ رہی تھیں۔

"جسٹ ویٹ فور مائی نیکسٹ سونگ۔" (میرے اگلے گانے کا انتظار کرو) مائیک پر اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ ہاتھ ہلاتا ہوا حاضرین کے درمیان پھر رہا تھا۔

"آئی ایک گوئنگ ٹو سنگ رائی حانہ۔"

(میں رائی حانہ کا گانا گانے والا ہوں) وہ بلند آواز میں نوجوان لڑکے لڑکیوں سے مخاطب ہوتا ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔

"فوک کلچر شو میں رائی حانہ' کس کس نے سننا ہے یہ گانا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

شاہ بانو نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ اب قدرے ہوش میں نظر آ رہی تھی۔

"چلو یہاں سے۔" شاہ بانو نے ڈپٹ کر کہا۔ ماہ نور بغیر بحث کیے کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل دی۔

"پاکستان کے ثقافتی شو میں بدیسی گانا کون سننا چاہتا ہے۔" وہ ہی لڑکا اسٹیج کے بیچ میں کھڑا مجمع سے پوچھ رہا تھا۔

حاضرین ہاتھ اٹھا اٹھا کر ووٹ دے رہے تھے۔

"مجھے امید ہے کہ آرگنائزر برا نہیں مانیں گے۔" وہ کہہ رہا تھا اور پھر اسٹیج سے میوزک شروع ہوا۔

روشنی میں چمکتے زرد ہیرے
اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہیں
تمہارا سایہ میرے سائے کے پاس سے گزرتا ہے
کیا ہو جو یہ جاندار ہو جاتے ہیں
میں ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں
اور میں اپنے محسوسات کا انکار نہیں کر سکتا
لیکن مجھے اسے جانے دینا ہے۔
ہمیں محبت ایک ایسی جگہ ملی جہاں پر ملنے کی امید نہ تھی۔

کچھ دیر پہلے سرائیکی لہجے میں کافی سنانے والا نوجوان انگریزی کا ایک مشہور گانا گا رہا تھا اور حاضرین پر دیوانوں کی سی کیفیت طاری تھی۔

"یہ تو ورسٹائل ہے۔" شاہ بانو نے سوچا۔

"یہ وہی ہے۔" ماہ نور گاڑی میں بیٹھ کر بڑبڑائی۔ جگہ جگہ نصب اسپیکرز پر آواز ابھر رہی تھی۔

لیکن بابے منگو کے میلے کا سائیں رائی حانہ کو کیسے گا سکتا ہے۔ بندر کے تماشے دکھانے والی سید پور کلچر فیسٹیول میں کیسے پہنچ سکتا ہے۔ منطق اور بصارت کی کشمکش بری طرح شروع ہو چکی تھی۔

ماہ نور اپنے ذہن اور اپنے دل میں یہ جنگ لڑ رہی تھی۔ نہ منطق بصارت کو شکست دے پا رہی تھی نہ بصارت منطق کو۔ گھر پہنچنے تک ان دونوں کی کشمکش میں ماہ نور تھک چکی تھی۔ اسکا سر سیٹ کی پشت پر ٹکا ہوا تھا

"نہیں یہ وہ نہیں ہے۔" پھر وہ خود سے مخاطب ہو کر نفی میں سرہلانے لگی۔
شاہ بانو بے یقین نظروں سے ماہ نور کی یہ ساری حرکات دیکھ رہی تھی۔
"ایک سائیں رائی حانہ کو کیسے گا سکتا ہے۔" ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ "ہے نا؟"
"یہ جو سنگر تھا عبید بھائی! یہ وہی لڑکا تھا نا جو چارکول اسکیچ خریدنے کی بات کر رہا تھا؟" ماہ نور سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے عبید سے مخاطب ہوئی۔
"نہیں' بالکل بھی نہیں۔" عبید نفی میں سرہلاتے ہوئے بولے۔
"اوہ خدایا...... آپ لوگ کیوں نہیں پہچانتے۔ یہ وہی تھا بالکل وہی۔" وہ زور دے کر بولی۔
"تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے ماہ نور! یہ وہ لڑکا نہیں تھا۔" عبید بھائی نرمی سے بولے۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں شاہ بانو!" وہ یقین دلانے والے انداز میں شاہ بانو سے مخاطب ہوئی۔
"اور وہ جو پہلے اس نے سنایا تھا' وہ سائیں جیسا تھا' وہ سائیں بھی یہی تھا۔" وہ کہہ رہی تھی۔
"اچھا۔ چلو گھر چل کر پہلے آرام کرو۔ پھر بات کریں گے۔ شاید تم تھک گئی ہو۔" شاہ بانو نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔
گاڑی سید پور سے باہر نکل آئی تھی۔ سید پور کے در و دیوار سے گانے والے کی آواز ٹکرا رہی تھی۔



ماہ نور کے ماموں کے گھر گاڑی رکنے پر شاہ بانو نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی بھی سحر زدہ نظر آ رہی تھی۔ وہ ماہ نور کے ساتھ گھر کے اندر گئی اور اسے اس کمرے تک لے گئی۔
"ماہ نور! تم چینج کر لو۔" شاہ بانو نے اس کا بیگ ٹیبل پر رکھ کر کہا۔ وہ بغیر کسی بحث کے واش روم میں چلی گئی۔
دس منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل نظر آ رہی تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔
"چلو اب تم لیٹ جاؤ۔" شاہ بانو نے کہا اور اس کے لیٹ جانے کے بعد وہ کچھ دیر اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ سہلاتی رہی' پھر آہستگی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔
"ماہ نور کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں' ہو سکتا ہے وہ کل دیر تک سوئے۔"
اس نے لاؤنج میں بیٹھی ماہ نور کی ممانی سے کہا۔ انہوں نے سرہلا دیا۔ شاہ بانو' ماہ نور کی طرف سے خاصی پریشان تھی۔ اس نے راستہ بھر عبید سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی اچھی خاصی سمجھ دار دوست کو شاید کوئی جن چمٹ گیا تھا۔ رہ رہ کر اس کے ذہن میں ایک ہی خیال سر اٹھا رہا تھا۔



لاری ایک جھٹکے کے ساتھ کسی جگہ رکی تھی۔ لاری کا کنڈیکٹر اس جگہ کا نام لے رہا تھا۔ مسلسل کھڑکی سے باہر گزرتے منظروں پر نظر جمائے سعدیہ کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اماں نے اسے چونکا دیا۔
"چلو اٹھو۔ ہماری منزل آ گئی۔" اماں نے نیچی آواز میں کہا۔
"اتنی جلدی سفر ختم ہو گیا۔" سعدیہ نے حیرت سے پوچھا۔
"یہ جلدی ہے؟" اماں نے اسے گھورا۔ "ڈھائی گھنٹے ہو گئے بس میں بیٹھے بیٹھے۔"
سارا سفر نہر کے ساتھ ساتھ ہی گزرا تھا۔ راستے میں کچھ دیر کے لیے نہر غائب ہوئی لیکن ایک جگہ موڑ کاٹ کر

جب لاری پی سڑک پر چڑھی تو نہر دوبارہ نظر آنے لگی۔ نہر میں پانی بہت زیادہ نہیں تھا اور یہاں اس میں تربوزوں
کی جگہ بھینسیں نہارہی تھیں۔

"ہائے! ان کو کتنا مزا آرہا ہو گا۔" سعدیہ کو بھینسوں پر رشک آیا۔ خود اس کے اپنے کپڑے پسینے کی وجہ سے جسم
کے ساتھ چپک رہے تھے اور پیاس کے مارے برا حال تھا۔

"یہ سولنگ اندر کو جاتا ہے گاؤں کی طرف۔" اس نے سنا ایک شخص ابا جی کو بتا رہا تھا۔ ابا جی ایک طرف
کھڑے چند مریل گھوڑوں والے تانگوں کے سوئے سوئے سے کوچوانوں میں سے ایک سے محو گفتگو تھے۔
اب ابا جی ایک مریل گھوڑے والے تانگے پر سامان سوار کروا رہے تھے۔ جس جگہ وہ لوگ کھڑے تھے۔ اس
سے چند گز کے فاصلے پر نہر کے کنارے ایک ہینڈ پمپ لگا تھا۔ سعدیہ نے بغیر کچھ بولے اماں سے ہاتھ چھڑایا اور
ہینڈ پمپ کی طرف لپکی۔ پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ سعدیہ نے نلکا چھوڑ کر پمپ سے اگلتے پانی کے آگے ہاتھوں کی
اوک بنالی۔ تھوڑا پانی اس کی پیاس بجھانے کے لیے ناکافی تھا۔ اس نے ایک بار پھر نلکا زور و شور سے چلایا اور پھر
اگلتے پانی کے آگے ہاتھ باندھ لیے۔ اس کے کپڑے بھی اس کوشش میں بھیگ رہے تھے اور اسے یہ گیلے ہوتے
کپڑے اچھے لگ رہے تھے۔

"سعدیہ!" اماں کی ڈپٹتی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اماں اس کے سر پر کھڑی تھیں۔

"بڑا ٹھنڈا پانی ہے اماں! آپ بھی پی لو' منہ دھولو۔" سعدیہ نے منہ پر کچھ دیر پہلے مارے پانی کے چھپا کے کے
آنکھوں پر رہ جانے والے قطروں کے پیچھے سے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔" اماں کے سخت لہجے نے اسے ڈرایا۔ "چلو۔ ابا جی ناراض ہو رہے ہیں۔" اماں نے سختی سے اس کا
بازو پکڑا اور دوبارہ اسی جگہ لے آئیں جہاں وہ پہلے کھڑی تھی۔

"لو پانی پینے پر بھی ڈانٹ۔" سعدیہ نے سوچا۔ "راستے بھر لاری میں ٹھنڈے شربت اور ٹھنڈے پانی والے
چڑھ کر بیچنے آتے رہے' کسی نے ایک گلاس نہیں لے کر دیا۔ اب یہ تو مفت کا پانی تھا' اس پر بھی ناراضی؟"
اس کے دل کی یہ خفگی اور بھی بڑھ گئی جب اماں نے اسے اندر جاتے ایک رستے کی طرف دھکیلا۔ سامان والا
تانگہ آگے آگے چل رہا تھا۔ اور ابا جی اس کے پیچھے پیدل چل رہے تھے۔ اماں اس کا بازو پکڑے ابا جی کے پیچھے
چلنے لگیں۔ گویا ان کو اگلا راستہ پیدل چل کر طے کرنا تھا۔

"ہم تانگے پر کیوں نہیں بیٹھے؟" اس نے منہ اٹھا کر اماں سے سوال کیا۔
"دیکھتی نہیں کیسا مریل تانگہ ہے' سامان ہی لے جائے بڑی بات ہے۔" اماں نے نقاب کے پیچھے سے جواب
دیا۔

"اونہہ!" وہ خفگی سے بولی۔ "دوسرے تانگے کا کرایہ بچایا ہو گا ابا جی نے۔"
اس نے سوچا اور اپنا غصہ نکالنے کے لیے راستے میں آئے ایک پتھر کو جوتے کی نوک سے ٹھوکر ماری۔ پتھر اڑ کر
ذرا آگے جا کر گر گیا' پتھر کے قریب پہنچ کر سعدیہ نے اس کو دوسری ٹھوکر ماری۔ پتھر کچھ اور آگے جا گرا۔ اب وہ اس
نئے مشغلے میں مشغول ہو گئی۔ وہ پتھر سعدیہ کی ٹھوکر سے اڑتا گرتا اس کے ساتھ اس جگہ تک پہنچ گیا' جو سعدیہ اور
اس کے گھرانے کا نیا ٹھکانہ تھا۔

✲ ✲ ✲

"ایک بات غور سے سن لو اور گرہ سے باندھ لو' ایسی کوئی تصویر پرنٹ میڈیا میں نہیں جائے گی اور ایسا کوئی
شاٹ الیکٹرانک میڈیا پر نہیں چلے گا' انڈر اسٹینڈ!"

"رائٹ۔"
"آئی ہوپ کہ مجھے یہ بات دوبارہ کرنے کے لیے تمہیں کال نہیں کرنا پڑے گی۔"
"لیکن سر! وہ جو لوگوں کے پرسنل ویڈیوز ہیں۔ وہ جو سوشل ویب سائٹس اور یوٹیوب وغیرہ۔"
"ثاقب! یہ جو تم من من کر رہے ہو' اس کا حل تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہیں اندازہ ہے کہ اس کا کیا کرنا
ہے۔"
"یس سر!"
"تو پھر پہلی بات ہی آخری بات بھی ہے۔ میں کہیں بھی' اس کے بارے میں کچھ دیکھنا یا سننا نہیں چاہتا۔"
"جی سر!"
"او کے۔"

✲ ✲ ✲

وہ کتنے گھنٹے سوئی تھی اسے اندازہ نہیں ہوا۔ جب اس کی آنکھ کھلی اس کے کمرے کی کھڑکیوں پر دبیز پردے ہونے کی وجہ سے کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کمرے میں موجود ہر چیز کے خدوخال مدھم سے نظر آرہے تھے۔ اس نے ایک بار آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر اسے لگا اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ ذہن شاید سوچنے اور محسوس کرنے کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا وہ یوں کیوں لیٹی ہوئی ہے۔

کچھ سمجھ میں نہ آنے پر اس نے سوچنے کی مشقت چھوڑی اور پہلو بدل کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا موبائل فون اٹھانے کے لیے ہاتھ مارا۔ موبائل فون وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ چونک کر اٹھی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ سیل فون اس کے ساتھ کہیں رکھا نہ ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اسے سامنے میز پر رکھا اپنا شولڈر بیگ نظر آیا۔ اس نے تیزی سے اٹھ کر اپنا بیگ اٹھایا اور واپس بیڈ پر بیٹھ کر اس میں اپنا فون تلاش کرنے لگی۔

فون نکال کر اس نے اس کی اسکرین روشن کی۔ تاریخ اور وقت دونوں نے ہی اس کو حیران کر دیا۔

مسڈ کالز کی لمبی فہرست تھی۔ اس میں ایک نامعلوم نمبر بھی تھا۔ بابا' ممی' سلمان اور شاہ بانو کے میسجز کے علاوہ نومیڈ آرٹ گیلری میسج تھا۔ جس میں گیلری انتظامیہ سے بہترین تعاون پر اس کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور اس کے اسکیچز کی تعریف کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اپنے فروخت شدہ اسکیچ کی قیمت طے کرنے کے لیے گیلری کے اسلام آباد آفس میں تشریف لائے۔

اس نے سر جھٹکا اور ممی کو کال کی۔ وہ حسب توقع پریشان تھیں۔

"اسی لیے میں تمہیں وہاں بھیجنے پر متامل تھی۔" وہ کہہ رہی تھیں۔ "اپنے گھر کے علاوہ تمہیں کہیں رہنے کی عادت جو نہیں ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے ممی! سردار چاچا کے پاس بھی تو رہی تھی۔" اس نے کہا۔ "میں شاید کل زیادہ تھک گئی تھی۔"

"اس وقت رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ نسرین یا فرقان نے کل سے تمہاری خبر نہیں لی۔ دیکھا بھی نہیں کہ تم آخر جاگ کیوں نہیں رہی ہو۔" ممی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپ کو پتا ہے ممی! وہ دونوں بہت مصروف ہوتے ہیں۔" اس نے اپنی اکڑی ہوئی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ایسی بھی کیا مصروفیت کہ گھر میں آئے چند دن کی مہمان کی خبر ہی نہ لی جائے۔" ممی کو غصہ آگیا۔
"تم صبح ہی سامان اٹھاؤ اور شاہ بانو کے پاس چلی جاؤ۔" تھوڑی دیر بعد ان کی آواز آئی۔
"ارے واہ!" ماہ نور ایک دم خوش ہوگئی۔ "واقعی ممی!"
"ہاں واقعی۔" وہ نرمی سے بولیں۔
"اور اگر شاہ بانو ابھی کچھ دن اور رکنے کا کہے تو۔" وہ منمنائی۔
"تو تم بھی رک جانا۔" وہ فراخدلی سے بولیں۔ "اب گھر سے نکلی ہی گئی ہو تو ذرا گھوم پھر لو۔" ماہ نور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
"اور فرقان اور نسرین سے تو مجھے سخت شکوہ ہو گیا ہے۔" وہ ناراض لہجے میں بولیں۔ "دل میں شکوہ ہو تو پھر اس شخص سے دور ہی رہنا چاہیے۔ ورنہ گناہ گاری ہو جاتی ہے۔"
ماہ نور ماں کی یہ بات سن کر بے اختیار مسکرادی۔ بظاہر اتنی سخت مزاج خاتون کے اندر اللہ سے ہر دم ڈرنے والا دل موجود تھا۔ ماہ نور کو اس کا بہت اچھی طرح اندازہ تھا۔
"ممی! آئی لو یو۔" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔
"چلو اب تم اٹھو، خود ہی کچن میں جا کر کچھ کھا لو، مجھے یقین ہے نسرین کا فریج کھانے کی اشیا سے بھرا ہوگا، چاہے انہیں کھانے والا کوئی نہ ہو۔" وہ ہنس کر بولیں۔
"ممی! یہ بھی غیبت ہوتی ہے۔" ماہ نور نے انہیں یاد دلایا۔
"اوہ ہاں" آئی ایم سوری۔" انہوں نے کہا۔
"چلو پھر اٹھ کر کچھ کھا پی لو، صبح مامی کو بتا دینا کہ تم نے فریج سے کیا کیا لیا تھا۔" وہ ہنسیں۔ ماہ نور نے مسکراتے ہوئے انہیں خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔ ممی سے بات کر کے اس کا ذہن بہت ہلکا ہو گیا تھا۔
"اور یہ "سولڈ اسکیچ" (فروخت شدہ تصویر) پھر اس نے دوبارہ آرٹ گیلری سے آیا پیغام پڑھا۔ "اچھا دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی اور اٹھ کر واش روم کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

شاہ بانو اس کا فون سن کر خوش بھی تھی اور تھوڑا پریشان بھی۔ ماہ نور کو جس کیفیت میں دو دن پہلے وہ اس کے ماموں کے گھر چھوڑ کر آئی تھی، اس کے لیے وہ کیفیت پریشان کن تھی۔ اب ماہ نور اسے خبر دے رہی تھی کہ اس کی ممی چاہ رہی تھیں کہ وہ شاہ بانو کے ساتھ رہے۔
"تم ٹھیک تو ہونا!" شاہ بانو نے ماہ نور سے بار بار پوچھا تھا۔
"ہاں۔ ایک دم ٹھیک۔" وہ بشاش لہجے میں ہنس رہی تھی۔
"ماہ نور کو تو شاید جناتی دورے پڑنے لگے ہیں۔" ماہ نور کو اس کے ماموں کے ہاں سے لینے کے لیے آتے ہوئے شاہ بانو مسلسل یہ ہی سوچ رہی تھی۔
"لیکن یہ جن اسے چمٹا کہاں اور کیوں؟" پھر اس نے سوچا تھا۔ "جن ہی تو تھا جو پاگلوں کی طرح فوک میوزک کے ریکارڈز جمع کروا رہا تھا اس سے۔" شاہ بانو کو اپنی ہی سوچ پر بے اختیار ہنسی آگئی۔
"اور اس لڑکے کو محترمہ سائیں سمجھ رہی تھیں جو رائے خانہ کا نمبر گا رہا تھا اور کیا خوب گا رہا تھا۔ کاش اس روز

ماہ نور یوں ری ایکٹ نہ کرتی تو اس لڑکے کے گائے ہوئے گانے تو سننے کو مل جاتے۔ اللہ جانے اور کتنی دیر اسٹیج پر رہا ہوگا وہ تو بھئی منٹوں میں کراوڈ کے لیے heart throb (دل کی دھڑکن) بن گیا تھا۔
"نام پتا نہیں کیا تھا اس کا؟" ماہ نور کے ماموں کے گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے شاہ بانو نے سوچا۔ "چلو سید پور فیسٹیول کی ویڈیوز اپ لوڈ ہو ہی جائیں گی، سب پتا چل جائے گا۔" اس نے خود کو تسلی دی اور ماہ نور کے ماموں کے گھر میں داخل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

بارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے پری بلیو ہیون سرکس کے ساتھ میلوں کا سفر طے کر چکی تھی۔ اور اب تاروں اور رسیوں پر کرتب دکھانے کے علاوہ اسٹیل بار پر کرتب دکھانے میں اس سے زیادہ ماہر کوئی دوسرا شخص سرکس میں نہیں تھا۔
"پری تو بلیو ہیون کا ایسا اثاثہ ہے، جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔" عارف خان بابا سینہ تان کر کہتے۔
"پری انگریزی بولتی ہے اور پری رنگ میں پری کی چھڑی جیسے کرشمے دکھاتی ہے۔" مسز پیٹر اپنا کریڈٹ لینا کبھی نہیں بھولتی تھیں۔
سرکس رنگ میں شام کے وقت پری سے زیادہ پرجوش، ماہر اور میلہ لوٹ لینے والا کوئی دوسرا فنکار نظر نہیں آتا تھا۔ مگر دن کے وقت سرکس کی خاموش چھولداریوں میں سے کسی ایک میں ایک بالکل مختلف پری ہوتی تھی۔ سرکس میں آئے روز نئے نئے لوگ شامل ہوتے تھے، کچھ عرصہ گزار کر چھوڑ جانے والے بھی کئی ہوتے تھے۔
"مجھے مسخرہ بننے کا شوق ہے۔ میں گھر والوں سے چھپ کر آیا ہوں۔" کوئی درخواست کر رہا ہوتا۔
"مجھے ہاتھی اور گھوڑوں کے ساتھ کرتب کرنے ہیں جناب! میں نے ٹی وی پر یہ کرتب دیکھے ہیں۔ مجھے اپنے پاس جگہ دے دیں۔" کوئی اور کہتا سنائی دیتا۔

لوئی یاروں پر چل کر کرتب دکھانے کا دعوے دار ہوتا اور کسی کا خیال ہوتا کہ اس سے بہتر موت کے کنویں میں موٹر سائیکل کوئی نہیں چلا سکتا۔

آنے والوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی شامل ہوتے تھے۔ پری ایسے منظر بچپن سے ہی دیکھتی چلی آرہی تھی۔ اکثر یہ لڑکے اور لڑکیاں عمر میں اس سے بڑی ہوتی تھیں۔ پہلے پہل اس نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا مگر جوں جوں وہ بڑی ہورہی تھی' اس کا شعور بھی بیدار ہو رہا تھا۔ اور کئی قسم کے سوال اس کے ذہن میں اٹھنے شروع ہوچکے تھے۔

"لوگ جو ادھر ادھر سے آئے ہوئے ہیں ان کے تو اپنے گھر بھی ہیں۔ ماں باپ بھی ہیں۔" وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو دیکھ کر سوچتی۔ "میں کون ہوں؟ میں کہاں سے آئی ہوں میرے ماں' باپ کون ہیں؟" اس کا ذہن ان سوالوں کی زد میں رہنے لگا تھا۔

"ارے تو تو سرکس کی جم پل ہے پری!" عارف بابا نے ایک بار اس کے سوال کے جواب میں کہا تھا "تو سرکس کی بیٹی ہے۔ سرکس ہی تیرا گھر ہے اور یہاں ہم سب جو کرتب سکھانے والے ہیں تیرے ماں' باپ ہیں۔ تو دیکھتی نہیں' سب تجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ سب کے لیے تو کتنی اہم ہے۔" وہ اس کا دل راضی کرنے کی کوشش میں کہتے۔

مگر پری کا دل ان جوابوں سے کبھی راضی نہ ہوسکا تھا۔ وہ دس سال کی عمر میں ہی یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ وہ یہاں موجود کسی بھی شخص کی بیٹی نہیں تھی۔ یہاں کوئی عورت اس کی ماں تھی نہ کوئی مرد اس کا باپ تھا۔ چند ماہ اور آگے کھسکنے پر اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اس حقیقت پر کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے اپنا ننھا سا دل کتابوں اور تربیت کے علاوہ ادھر ادھر کے کاموں میں لگانا شروع کیا۔ سرکس کی بیٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہونے کے باعث وہ بلا روک ٹوک سرکس سے متعلق ہر شخص سے بات کرسکتی تھی اور اس کے کام کے متعلق پوچھ بھی سکتی تھی۔

وہ چھولداریاں نصب کرنے' سامان سجانے' سرکس رنگ تیار کرنے' لوگوں کا کھانا بنانے' جانوروں کا راتب تیار کرنے والوں سے لے کر نئے پرانے تمام فنکاروں پر ان سے چھوٹی ہونے کے باوجود رعب جما کر بات کرسکتی تھی۔ اور کچھ عرصہ اس نے ایسا کیا بھی۔ یہ سب لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ اس کی ایک شکایت پر وہ اپنے کام سے برطرف کیے جاسکتے تھے۔ مگر وہ تھوڑے ہی عرصے میں اس مشغلے سے بھی اکتا گئی۔

جانوروں کی تربیت دینے والے ایریا میں کم ہی کوئی دوسرا شخص جاسکتا تھا سوائے ان کو تربیت دینے والوں کے۔ پری کو وہاں جانے سے بھی کوئی نہیں روکتا تھا۔ مگر یہاں کے مناظر ہولا دینے والے تھے۔ پری نے اپنی آنکھوں سے خوفناک جانوروں کو ہفتوں کی تربیت میں انسانی اشارے کے سامنے بھیگی بلی بنتے دیکھا جن کے تصور سے ہی عام انسان کو خوف آجائے۔

کچھ ہفتوں میں اس کی برداشت جواب دے گئی اور اس کے بعد اس نے فرصت کے دنوں میں ادھر ادھر پھرنے کے بجائے اپنی چھولداری میں چارپائی پر لیٹے لیٹے دن گزارنے شروع کردیے۔ ان ہی دنوں میں اس نے سرکس سے باہر کی دنیا کے بارے میں سوچا۔ اس کے تصور میں وہ زندگی آتی ہی نہیں تھی جو سرکس کے باہر ہوسکتی تھی۔ جب بھی وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے' وہ راستوں میں نظر آنے والے مناظر کو دیکھتی اور اسے لگتا سب سے اچھی زندگی سرکس کے اندر ہے۔

وہ اس سے آگے کا شاید سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ پھر اس نے فن کے مظاہروں کے دوران پہنے جانے والے

اپنے مختلف قسموں کے ملبوسات پر غور کرنا شروع کردیا۔ اس کے اس غور نے اس کے ملبوسات کو تنوع اور جدت عطا کرنا شروع کردی۔

"واہ بھئی اپنی پری کے تو کاسٹیوم ہی الگ ہوتے ہیں۔" عارف خان بابا کی کلغی میں ایک اور پر لگا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس سے عمر میں بڑی لڑکیاں' جو سرکس میں کام کرتی تھیں' اس کو ملنے والی اہمیت سے جلتی تھیں۔ وہ اندر سے اپنی زندگی سے کتنی ہی غیر مطمئن سہی اس احساس نے کہ باقی لوگ اس سے حسد کرتے ہیں ______ اسے اپنے کام میں مزید محنت' جدت اور تنوع پیدا کرنے کا جنونی بنادیا۔ بلیو ہیون سرکس میں سارہ خان عرف پری کو سرکس کی ملکہ بن جانے میں اس کے بعد زیادہ عرصہ نہیں لگا۔

☆ ☆ ☆

شاہ بانو نے ماہ نور کو غور سے دیکھ کر اپنی تسلی کرنے کی کوشش کی کہ وہ بالکل نارمل تھی یا نہیں۔

"تم مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟" ماہ نور نے مسکرا کر پوچھا۔

"ویسے ہی۔" شاہ بانو نے اس پر سے دھیان ہٹالیا۔

"تم مجھے اتنے عرصے سے جانتی ہو شاہ بانو! کیا میں پہلے کبھی تمہیں یوں ایب نارمل لگی۔" اپنا سامان شاہ بانو کی گاڑی میں رکھنے کے بعد فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر ماہ نور نے شاہ بانو سے کہا۔

"مجھے تم اب بھی ایب نارمل نہیں لگ رہی ہو۔" شاہ بانو نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ابھی کی نہیں میوزیکل نائٹ والے روز کی بات کر رہی ہوں۔" ماہ نور نے سامنے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس روز۔" شاہ بانو کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"میں تمہاری جگہ ہوتی تو کسی کو اس طرح ری ایکٹ کرتے دیکھ کر یونہی پریشان ہوتی جیسے تم ہوئیں۔" ماہ نور نے اعتراف کیا۔

"وہ ری ایکشن نہیں تھا۔" شاہ بانو نے گئیر بدلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ جو کچھ تھا اس وقت تماشا بن رہا تھا۔" اس نے بدستور سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی۔

ماہ نور نے چونک کر شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"تم کیا سمجھتی ہو ماہ نور۔" شاہ بانو نے اس کی طرف دیکھا۔ "ہزار ڈیڑھ کے مجمع میں تم ایک لڑکے کا بازو پکڑ کر چیخو چلاؤ گی تو کیا اس کو کوئی عقیدت کا اظہار قرار دیا جائے گا۔ وہ سادہ ترین لفظوں میں تماشا تھا۔ جس کو دیکھ کر لوگ محظوظ ہو رہے تھے' جملے بازی کر رہے تھے اور بہت سے اس لمحہ کی تصویریں بھی لے رہے تھے شاید کسی نے اس کی ویڈیو بھی بنالی ہو۔" شاہ بانو کے لہجے میں خفگی تھی اور غصہ بھی۔

ماہ نور کو لگا اس کے جسم کا سارا خون چہرے کی چھوٹی چھوٹی رگوں میں جمع ہوگیا ہے۔ جو کسی بھی لمحہ پھٹ کر باہر بھی آسکتا تھا۔

"مجھے نہیں پتا میں نے۔ مجھ سے یہ کیوں ہوگیا۔" اس نے کچھ دیر کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

شاہ بانو نے پورا دھیان گاڑی ڈرائیو کرنے کی طرف مبذول کرلیا تھا۔

"آئی سوئیر۔ شاہ بانو!" ماہ نور نے بے بسی سے کہا۔

"میں تو سمجھتی ہوں ماہ نور۔" شاہ بانو نے بدستور سامنے نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔ "مگر لوگ نہیں

ماہ نور اپنے آنسوؤں کو قابو نہیں کر پا رہی تھی۔
"شاید میں الوژنز (واہموں) کا شکار ہو گئی ہوں۔" اس نے روتے ہوئے اعتراف کیا۔ "مگر یقین کرو۔ مجھے کئی بار مختلف جگہوں پر ایک ہی شبیہہ کے لوگ نظر آئے ہیں۔"
شاہ بانو نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔
"ہر بار ان کے کام مختلف ہوتے ہیں' ہر بار جگہ مختلف ہوتی ہے' ان کی موجودگی کے پس منظر مختلف ہوتے ہیں' مگر ہر بار بھی چہرے' کبھی آنکھیں' کبھی ہاتھ اور کبھی آواز اتنی مماثل ہوتی ہے کہ میرا ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے۔ پھر میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتی۔"
"ایسا کب سے ہو رہا ہے؟" شاہ بانو نے پوچھا۔
"کافی عرصہ ہو گیا' جب میں گاؤں گئی تھی اس وقت سے۔" ماہ نور نے سر جھکا کر گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کے ناخنوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔
"میں کوئی سائیکالوجسٹ یا سائیکاٹرسٹ تو نہیں ہوں۔" شاہ بانو نے اس کی طرف نرمی سے دیکھا۔ "لیکن جو تمہاری کیفیت ہے اسے شاید یہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔"
ماہ نور شاہ بانو کی بات کے جواب میں کچھ نہیں بولی۔
"چلو خیر' اب ہم ساتھ رہیں گے۔ کچھ دن گھومیں پھریں گے۔ تمہارا ذہن بھی ٹھیک ہو جائے گا۔" شاہ بانو نے عبید کے گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کرتے ہوئے کہا اور گاڑی کا ہارن بجانے لگی۔
"میں اس کو اپنی بات سمجھا سکتی ہوں۔ نہ یہ سمجھ سکتی ہے۔ پھر بات کرنے کا فائدہ کیا۔" ماہ نور نے عبید کے گھر کے پورچ میں گاڑی سے اترتے ہوئے سوچا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا اسکیچ پچاس ہزار روپے میں بکا ہے ماہ نور۔" اس رات کھانے کی میز پر عبید بھائی نے اچانک اسے بتایا۔ پلیٹ میں چمچ چلاتا اس کا ہاتھ ایک دم رک گیا۔
"مگر میں نے تو نہیں بیچا تھا عبید بھائی۔" اس نے بے ساختہ کہا۔
"ہاں بھئی... میں نے بھی اس لڑکے کو تمہارا پیغام دے دیا تھا۔ مگر وہ مفت میں لینے پر تیار نہیں تھا۔ پھر شیراز جو میرا کولیگ ہے' اس نے فیصلہ کیا کہ ہم ایک مناسب سی رقم اس سے لے کر تمہاری طرف سے کسی رفاہی ادارے کو دے دیتے ہیں... کیا خیال ہے؟" عبید بھائی نے سب کچھ کر لینے کے بعد اسے یوں بتایا تھا جیسے انہیں یقین ہو' اس پر وہ برا نہیں مانے گی۔
"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" وہ ایک دم خوش ہو کر بولی۔
"شاہ بانو! اسید پور میلے کی ویڈیو میری USB میں موجود ہے' تم کاپی کر لینا۔" عبید بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"حیرت ہے... میں اس روز سے تمام سوشل ویب سائٹس' یوٹیوب وغیرہ سب چیک کر چکی ہوں۔ کہیں مجھے اس سے متعلق کچھ نہیں ملا۔" شاہ بانو کو اچانک یاد آیا۔
"سب رائٹس محفوظ ہیں۔ سختی سے آرڈر ہو چکا ہے اس لیے کہیں یہ نہیں چلائی جائے گی۔" عبید بھائی نے اطلاع دی۔

"سو اسٹرینج۔" شاہ بانو حیران ہوئی۔
"اتھارٹیز بھئی اتھارٹیز۔" عبید بھائی کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔
"اور ہاں!" دو منٹ کے بعد ہی عبید کمرے میں واپس آ گئے۔ "ماہ نور! میں نے اسکیچ خریدنے والے لڑکے کو غور سے دیکھا تھا' وہ کسی طرح بھی اس سنگر کی طرح نہیں لگ رہا تھا۔"
"اس کا اتا پتا' نام نشان پوچھا؟" شاہ بانو نے پانی پیتے ہوئے ماہ نور کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ایک دفعہ پھر سے سرخ ہو گیا تھا۔
"اس کا کارڈ میرے پاس پڑا ہے' دیکھ لینا۔" عبید نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے چلے گئے۔
"شکر کرو۔ کہیں کوئی تصویر' کوئی ویڈیو نہیں آئی۔" شاہ بانو نے ماہ نور کو تسلی دینی چاہی۔ مگر ماہ نور کسی گہری سوچ میں گم تھی۔
"پھر مجھے کیوں ایسا لگتا ہے' مجھے ہی کیوں۔" وہ سوچے چلی جا رہی تھی۔ اس اسرار کا جواب اس کو شاید کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس رات' رات بھر جاگنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ اس معاملے پر کبھی سوچے گی بھی نہیں۔ یوں جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔
لیکن صبح جب اس نے وقت دیکھنے کے لیے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا سیل فون آن کیا' فون میں ایک نامعلوم نمبر سے اس کے لیے پیغام موجود تھا۔ اس نے پیغام کھولا۔
"ماہ نور! میں سخت معذرت خواہ ہوں' میری وجہ سے تمہیں اتنی کوفت اٹھانا پڑی۔"
پیغام پڑھتے ہوئے ماہ نور کا ذہن ایک بار پھر ماؤف ہونے لگا تھا۔
اس نے اپنے ذہن کو ایک بار پھر شفاف ہونے سے روکا۔ وہ ذہن پر لکھی تحریروں کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ایک لمبے عرصہ سے وہ جس واہمے کا شکار ہو رہی تھی' اس کا اسرار اسے خود ہی کھولنا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر نظریں دوبارہ آنے والے اس پیغام پر جمائیں۔
یہ پیغام جس کسی نے بھی بھیجا تھا اسے بلا سوچے سمجھے اس سے رابطہ کرنا تھا۔ شاید کوئی گرہ کھلے۔ اس نے اس نمبر پر کال ملائی۔ دو تین بار بیل ہونے کے بعد اس کی کال وصول کر لی گئی۔
"السلام علیکم ماہ نور! مجھے یقین تھا۔ تم کال کرو گی۔" دوسری طرف سے بولے گئے الفاظ نے ماہ نور کو حیرت کا ایک نیا جھٹکا لگایا تھا۔ وہ کون تھا جو اس سے اتنی بے تکلفی سے مخاطب تھا۔
"تم کون ہو؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔
"میں کبھی کسی کے سامنے لاجواب نہیں ہوا سوائے اس کے جو مجھ سے پوچھے' تم کون ہو۔" جواب میں کہا گیا۔
"ک... کیا مطلب' ک... کون ہو تم؟" ماہ نور کا اعتماد ایک دم متزلزل ہو گیا۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلنے لگے تھے۔
"ریلیکس ماہ نور۔" دوسری جانب سے اسی سکون اور اعتماد کے ساتھ کہا گیا جس کے ساتھ پہلے دو جملے کہے گئے

تھے۔

"پلیز۔ مجھے بتاؤ تم کون ہو۔" ماہ نور کے لہجے میں اضطراب تھا۔

"میں نے ابھی خلیل جبران کو کوڈ کیا ہے اس سوال کے جواب میں۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ' مجھے بتاؤ پلیز۔"

"ضرور بتاؤں گا' میری وجہ سے تم اتنا پریشان ہوئی ہو کہ میں دل میں سخت شرمندہ ہو رہا ہوں۔"

"کب بتاؤ گے' اب بتا بھی چکو۔" ماہ نور نے اپنی ہتھیلی میں آئے پسینے کو خشک کرنے کے لیے فون دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

میں اس بات کی تفصیل سے وضاحت کرنا چاہتا ہوں' اِس نے انگریزی میں کہا تھا۔

"اور یہ تفصیل فون پر سنائی نہیں جا سکتی۔"

"نہیں۔ تم ابھی بتاؤ تم کون ہو۔" ماہ نور نے اب کے سخت لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا ماہ نور۔ میں اس کے آغاز سے وضاحت کرنا چاہتا ہوں "بندر کے تماشے والے سے لے کر میوزیکل نائٹ کے سنگر تک" ایک ایک بات کی وضاحت۔"

ماہ نور کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

"تت۔ تمہیں کیسے معلوم۔" الفاظ بے ربط انداز میں اس کے منہ سے پھسلے۔

"مجھے ہی تو معلوم ہے۔" دوسری جانب سے نرم لہجے میں کہا گیا۔

"میں تم سے کہیں ملنا چاہتا ہوں ماہ نور!"

"کب' کہاں؟" ماہ نور نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

"جہاں تمہارے لیے ممکن ہو اور اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں ضرور۔" ماہ نور نے ایک بار پھر بغیر سوچے سمجھے کہا۔ "میں ضرور تم سے ملوں گی۔ بتاؤ کب اور کہاں؟"

"اوکے میں تمہیں کچھ دیر بعد بتاتا ہوں۔"

دوسری جانب سے ایک لمبا سانس لینے کے بعد کہا گیا۔ فون بند ہو گیا۔ سیل فون ہاتھ میں پکڑے ماہ نور حیرت زدہ بیٹھی تھی۔ کیا اس کو فون پر ہونے والی گفتگو کا یقین کرنا چاہیے تھا۔ کیا اسے اس سے ملنے پر رضامند ہو جانا چاہیے تھا؟

اس کے ارد گرد سوالوں کا ہجوم تھا اور اسے ان میں سے کسی کا جواب بھی نہیں دینا تھا۔ اسے صرف اور صرف اپنے ذہن پر چھائے واہموں کے غبار کو دھونا تھا' اسی لیے اس نے نتائج عواقب پر غور کیے بغیر اس کی کال کا انتظار کرنا تھا جس میں وہ بتانے والا تھا کہ وہ اس سے کب اور کہاں ملے۔ اس کال کو سننے کے بعد اسے ہر صورت اس شخص سے ملنا تھا۔ بندر کے تماشے والے سے کلچرل فیسٹیول کے سنگر تک کی کہانی سننے کے لیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



سعدیہ حمید چوہدری



"عورت بہت عجیب سی شے ہے یار! تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ ہر عورت ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ خواہ وہ عام سی ہو یا چاند چہرہ۔ چاہے وہ درختوں پہ نام لکھ کر اپنے جذبوں کو کھلے عام آشکار کر دے یا پھر سوکھے گلاب کتابوں میں رکھتی رہے اور کسی کو معلوم ہی نہ ہو کہ کب باد بہار آئی۔ کب کوئی غزل خواں ہوا... یا نہیں ہوا۔ صحرا کی پیاس من میں لیے زندگی ایک جست میں طے کرتی ہے۔ باقی تو زندہ رہنے کے بہانے ہوتے ہیں۔ اس کی پیاس بجھتی ہی نہیں۔ تن کی پیاس' من کی پیاس... من کی پیاس تو اکثر بادل بھی نہیں بجھا پاتے خواہ بارش سے بھرے کیوں نہ ہوں۔"

صفائی والا کپڑا اس کے ہاتھ میں تھا۔ چیزوں پہ پڑی مٹی فنا ہونے کی چاہ میں اس کی منتظر تھی۔ ٹی وی ڈرامے کے کردار ابھی تک اپنے کرداروں کو زندہ کر

رہے تھے' لفظوں کے ساتھ انصاف کر رہے تھے۔ مگر وہ نجانے کہاں تھی۔ روح میں پڑتے شگاف اور دڑاریں اس کے چہرے پہ نمودار ہو رہی تھیں۔ وہ خود نجانے کیا کھوج رہی تھی۔ بعض اوقات یہ کھوج کسی بند گلی میں انگلی تھام کے چھوڑ آتی ہے۔ دنیا میں مقام عدن اور قارعہ کی وادی محض اسی کھوج کی اختراع ہوتے ہیں۔ اس کھوج کو یہ ہنر حاصل ہے کہ یہ کسی سرمئی شام کو خالی ہاتھ بھی کر سکتی ہے اور ببول پہ چنبلی کی نازک کچی کلیاں بھی اگا سکتی ہے۔ ایک عام سی لڑکی کو لیلیٰ بنا سکتی ہے۔ صحرا میں پھول کھل سکتے ہیں۔ عام سے لوگ بادشاہ ہو سکتے ہیں۔ ایک دن' محض ایک دن "عید" ہو سکتا ہے۔ محض اجر برائے اجر کی خاطر۔ چاہے یہ اجر کسی کی خاطر رکھی گئی یا مانگی کی منت کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو اور بعض اوقات پوری ہو جانے والی منت باقی زندگی کے دیے بجھا دیتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

"مینا آپی! قسم سے آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ وہ کپڑوں کی تہہ لگا رہی تھی۔" آصفہ کی آواز پہ یکایک رک کے اس کی شکل دیکھی۔

خوش قسمتی کا پیمانہ کیا تھا بھلا؟

"جس کو چاہا جائے' اس کو پا بھی لیا جائے' اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے بھلا۔ کتنی دھوم دھڑکے سے شادی ہوئی تھی نا آپ کی رضا بھائی سے۔ اب بھی یاد کروں تو بڑی ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے۔" اس نے تصور کر کے مزا لیا۔

اس نے بڑے دھیان سے اس کی بات سنی پھر سر جھکا کے' سوکھے کپڑوں کے جال میں الجھ گئی۔

"کتنا چاہتے تھے نا رضا بھائی آپ کو۔"

"تھے" کی آندھی اس کا سارا دھیان اڑا کے لے گئی۔

"یاد ہے' جب خالد انکل نہیں مان رہے تھے تو انہوں نے زبردست قسم کی بھوک ہڑتال کر دی تھی۔ مجال ہے جو ایک نوالہ بھی ان دونوں میں' منہ میں ڈالا ہو۔ سب زور لگا کے تھک گئے۔ کیا فلمی سچویشن تھی۔ پھر خالد انکل نے باقاعدہ ہار تسلیم کی تھی ان کے جذبوں کے آگے۔۔۔ اور آپ تو کبھی آگے سینہ سپر ہوئی ہی نہیں۔ واقعی لگن سچی ہو تو کچھ بھی ممکن ہے۔"

"ہوں۔" وہ زیر لب کہہ کے الماری میں گھس گئی۔

"اور وہ مہندی کی رات یاد ہے؟" آصفہ نے کیا یاد دلایا تھا۔ اسے کرنٹ سا لگا۔

"خالد انکل نے زبردست پہرہ لگا رکھا تھا مگر وہ بھی رضا بھائی تھے۔ پچھلے لان کی دیوار پھاند کے اندر آ گئے تھے۔ اپنے سامنے آپ کو مہندی لگوائی اور خالد انکل کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلا۔"

ہنسنے سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔ مینا نے سنہری یاد کے ساتھ اس کے گلابی پن کو دیکھا۔

"اتنے چاہنے والے ہزبینڈ ہیں آپ کے۔ آپ کو تو ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"ہاں واقعی محبت کا تو ایک لمحہ بھی قیمتی ہوتا ہے۔ خوش قسمت لوگوں کو ملتی ہے محبت۔"

توسے نیناں لاگے' پیا سانورے!
نہیں بس میں اب یہ جیا سانورے!
محبت تو اک جاوداں زندگی ہے
توسے نیناں لاگے
ملی روشنی
توسے من جو لاگا
ملی زندگی
محبت تو اک جاوداں زندگی ہے

آصفہ نے اس کی بات پوری کہاں سنی تھی۔ وہ کمپیوٹر کے ساتھ مصروف ہو چکی تھی۔ اس نے رضا کی پسندیدہ سی ڈی لگائی تھی۔ وہ رضا کی شرٹس لٹکا رہی تھی۔ اسے شاپنگ کا بہت شوق تھا۔ کچھ مدت کے بعد نئی شرٹس اور ٹائیاں' مینا کو لگتا تھا کہ اس کی متلون مزاجی اسے ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں بھٹکائے رکھتی ہے۔

"توسے نیناں لاگے' پیا سانورے" اس نے بھری آنکھ کو رضا کی شرٹ میں چھپا لیا۔

"بھابھی! رضا بھائی یہ گانا آپ کو سناتے ہوں گے' ہیں نا۔" آصفہ اسے شرارت بھرے انداز میں دیکھ کر بولی۔ وہ جب لاڈ میں ہوتی تو اسے بھابھی کہا کرتی تھی۔

"نہیں تو۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ ایک دم پانچ سو والٹ کے بلب کی روشنی کی زد میں آئی تھی۔ اسے رضا کی متلون مزاجی سہائے رکھتی تھی۔

"کیا باتیں کر رہی ہو تم لوگ؟" شمیم خالہ ایک دم کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"مینا! تمہیں پتا ہے کہ بچوں کے آنے کا وقت ہو رہا ہے اور تمہارے کام ہی ختم نہیں ہو رہے۔ توبہ ہے بھئی! کاہلی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

مینا کو ہمیشہ خالہ کی اندر تک اتر جانے والی نگاہوں سے خوف آیا کرتا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے کپڑے الماری میں ٹھونسنے کے انداز میں رکھ دیے تھے۔ اور باہر کی طرف لپک گئی۔

"اتنی سستی کی ماری ہے کہ بس۔" انہوں نے بمشکل اس کے کمرے سے باہر نکل جانے کا انتظار کیا تھا۔ "میسنی نے کیسے میرے بیٹے کو پھانس لیا۔"

"امی! آپ کو پرابلم کیا ہے؟" آصفہ کو ایک دم غصہ آگیا۔ "اتنی اچھی تو ہیں مینا آپی!"

"پتا ہے مجھے' تمہیں بھی اس گھنی نے اپنے چکر میں ڈال رکھا ہے۔"

"امی آپ بھی۔" وہ پاؤں پٹختے ہوئے واک آؤٹ کر گئی۔

اس نے جلدی جلدی چکن کا پیکٹ فریزر سے نکالا۔ حمزہ کے لیے اسپیگھٹی بنانی تھی۔ عبیرہ تو ہر طرح کے کھانے آرام سے کھا لیتی تھی۔ مگر حمزہ بہت ضدی تھا بالکل رضا کی طرح۔ اس کے لیے اسے اسپیشل کھانا بنانا پڑتا تھا۔ اجیو اور باقی سب کے لیے اسے چکن اور سادہ دال بنانی تھی۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی۔

اس نے جلدی میں دیگچی کو بغیر کپڑے کے اٹھا لیا تھا اور سی کی آواز کے ساتھ فوراً" ہی واپس رکھ دیا۔

"یہ ہاتھ کام کرنے کے لیے نہیں بنے ہیں۔ میں تمہیں کام نہیں کرنے دوں گا۔"

اس کے جلے ہاتھ کی انگلیوں پہ رضا کے ہاتھوں کا لمس مرہم کا کام دے رہا تھا۔ مگر یہ بات بہت پرانی تھی۔

"تم کالا رنگ مت پہنا کرو۔ بہت سجتا ہے تم پہ۔۔۔ پھر مجھے بہت غصہ آتا ہے۔"

نیم وا آنکھوں کی سرخی اس کے دل پہ چھا جاتی تھی۔ اب وہ کئی کئی دن تک کالا رنگ پہنے گھومتی رہتی مگر رضا کے غصے کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔

آوازوں کے بیکراں ہجوم میں اس نے کھانا وقت سے پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ حمزہ اور عبیرہ کی وین کا ہارن سن کر وہ باہر نکلی۔ ان کے کپڑے وہ نکال کے رکھ چکی تھی' سو بہت مطمئن ہو کے باہر نکلی تھی۔

"ماما! آج میں نے میتھس میں ٹین بائے ٹین لیے ہیں۔" حمزہ نے بیگ وہیں پھینکا اور کاپی نکال کے اسے دکھانے لگا۔ ان کے بیگز سمیٹنے تک وہ اس کا ٹیسٹ چیک کر کے تعریف بھی کر چکی تھی۔

وہ عبیرہ کو ساتھ لیے باتھ روم میں داخل ہوئی۔

"ماما! یہ کلّو میرا ٹاول استعمال نہیں کرے گی اور نہ ہی میرا سوپ۔" وہ دروازے میں اکڑ کے کھڑا تھا۔

"پہلے میں نہاؤں گا۔"

اس نے عبیرہ کو دھکا دیا تھا۔ اس نے جلدی سے عبیرہ کو پکڑ کے بہلا لیا تھا' ورنہ اس کا باجا بند ہوتے ہوتے آدھا گھنٹہ تو لگ ہی جاتا۔

"اوکے انوٹیشن۔" وہ عبیرہ کو لیے باہر آ گئی۔ عبیرہ کو نہلانے کے بعد وہ اس کو تولیہ میں لپیٹ کر باہر لائی۔ اس نے رضا کو تکیہ میں سر دیے ہوئے بیڈ پہ کروٹ کے بل لیٹے دیکھا۔

"بے وقت آمد۔" وہ چونکی مگر ظاہر نہیں کیا۔

"السلام علیکم!" دھیرے سے سلام کیا "کھانا لگاؤں؟"

"ہوں!" جواب کچھ دیر کے بعد آیا تھا۔

"چکن اور دال بنائی ہے میں نے۔" یہ غیر ضروری معلومات تھیں۔ رضا کا شمار ان لوگوں میں تھا جو کھانا کھانے کے لیے زندہ نہیں رہتے۔ وہ کچھ دیر وہیں بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کے چل پڑی۔

کمرے سے نکلتے وقت اس نے دیکھا' وہی انداز برقرار تھا۔

اس نے اس کے سلام کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس نے کس رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ لاحاصل جب حاصل بن جاتا ہے تو شاید اسی طرح بے مزہ ہو جاتا ہے۔ نعمت مل جائے تو اس کا شکر ادا کرنا یاد نہیں رہتا۔

عفت اس کی دوست تھی مگر وہ بھی مینا کو کبھی سمجھ نہیں پائی تھی۔

"یار! تم تو نری پاگل ہو۔ تم زیادہ ہی توقعات باندھ لیتی ہو۔"

اس کو کبھی کوئی نہیں سمجھ پاتا تھا۔ وہ بھی جو اس کے دل کا دعویدار تھا۔ جو اس کی زندگی پہ حق ملکیت جتاتا تھا۔ جو اس کے من کا بھیدی تھا۔

کبھی ایسا ہوتا ہے' زندگی میں جب نعمت ملے اور شکر ادا نہ ہو تو پھر صدقہ دینے کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور بعض اوقات صدقے میں وہ نعمت دے کر بھی سیری نہیں ہوتی۔ سکون نہیں ملتا۔

☼ ☼ ☼

آصفہ شام کی چائے بنا رہی تھی۔ وہ لمحہ بھر کو فرصت کی انگلی تھام کر' شام کی اور بڑھتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ حمزہ اور عبیرہ کو جگا کے وہ لان میں چلی آئی۔ وہ دونوں اب قاری صاحب سے پڑھ رہے تھے۔ سنہری نرم دھوپ اور تنہائی اپنی بانہیں پھیلائے اس کی منتظر تھی۔ وہ پتھریلے بینچ پہ سمٹ کے بیٹھ گئی۔ لان میں لگے سفیدے کے درخت ہلکی ہوا کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔ ہوم اکنامکس کالج میں گریجویشن کے دوران اس کی بائیس دن کی ریزیڈنسی (Residence) تھی۔ ان بائیس دنوں میں رضا نے بائیس چکر لگائے تھے۔

"وہ دیکھو! تمہارا مجنوں ہارن پہ ہارن دے رہا ہے اس کو جھلک دکھا دو۔" عفت اسے اطلاع دے کر مفت مشورہ بھی دیتی۔

کیا دن تھے وہ بھی۔ ہم ہمیشہ ایسے دن جو نعمتوں کے انمول خزانوں سے بھرے ہوتے ہیں بغیر شکر ادا کیے گزار دیتے ہیں' پھر جب وہ دن' رخصت ہو جاتے ہیں تو ہم ان کو یاد کر کے آنکھیں نم کرتے ہیں۔ مگر کبھی آنکھوں کی نمی نے بھی کوئی کمی پوری کی ہے؟ اس نے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ رکھے تھے۔

"تم اس طرح کیوں کرتے ہو رضا! تماشا بن جاتا ہے میرا سب کے سامنے۔"

وہ کبھی کبھی بہت زچ ہو جاتی۔

"جنوں ہمیشہ نامراد ہے۔" وہ سگریٹ کی راکھ خالی فرش پہ جھاڑتا تھا اور پھر وہ اس راکھ کو اکٹھا کرنے کے عمل میں ہلکان ہوتی رہتی۔

ایک دل ربا سا مان تھا جس نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ نکاح کے تین بولوں کے بعد وہ جنوں بامراد تو ہو گیا تھا' مگر اس کے حصے میں نامرادی آگئی تھی۔ حمزہ اور عبیرہ کی پیدائش کے بعد تو وہ صرف ان کی ماں ہی بن کے رہ گئی تھی۔ شمیم خالہ کی ناقابل قبول بہو مگر رضا کی بولتی مینا چپ ہو گئی تھی۔

آصفہ چائے کے دو کپ اٹھائے چلی آئی۔ گفتگو کا رخ اور سوچ کا دھارا یکایک بدل گیا۔

"امینہ! خود کو جینے دو پلیز تم مر چکی ہو تمہاری مکینیکل موت ہو چکی ہے۔ تم جا چکی ہو۔ یہ عورت "امینہ رضا" ہے۔ اس کو زندہ رہنے دو۔" سامنے لگے درخت اس کا درد اور اس درد کا زہر اپنے اندر سمیٹ رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی پتا ہل جاتا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں تمہاری باتیں غور سے سن رہا ہوں۔ پھر رفتہ رفتہ وہ بھی سو گئے۔ اسے یوں لگا' جیسے بھرے میلے میں وہ تنہا رہ گئی ہو۔

بچوں کو سلانے کے بعد شمیم خالہ کو گرم دودھ دینے کے بعد وہ لان میں آ کے بیٹھ گئی اس کا رضا ہی تنگ نہیں کرتا تھا۔ خالہ شمیم بھی بہت طنز کرتی تھیں اور مینا تو اس کی جاں کو لگا اک روگ تھی جو اس کو بہت تنگ کرتی تھی۔ جو اپنی موت کے بعد اور وحشت زدہ ہو گئی تھی۔ اس کو گلہ تھا کہ رضا نے اسے مار ڈالا ہے۔ وہ دونوں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ رضا کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس پہ پڑیں۔ تیز تیز قدموں سے اس نے چل کر گیٹ کھولا۔

"بچے سو گئے؟" اس نے ہمیشہ کی طرح رٹا رٹایا جملہ بولا۔ وہ اندر بڑھ جانے کو تھا۔

"رضا ہیپی برتھ ڈے ٹو می۔" اس کی مسکراتی آواز نے اس کے قدموں میں زنجیر سی ڈال دی۔

وہ ایک جھٹکے سے مڑا۔

"اوہو یار! دو بچوں کے بعد بھی تمہیں اپنی برتھ ڈے یاد رہتی ہے؟"

اس نے آنکھوں کی نمی میں اس شخص کو غور سے دیکھا۔ یہ مانوس اجنبی سا شخص کون تھا بھلا۔ وہ تو اس شخص کو جانتی تھی جو رات بارہ بجے سے ہی اسے مبارک باد دینا شروع کر دیتا تھا۔ وہ اداسی سے مسکرائی۔

"کھانا کھا لیا ہے آپ نے؟ میں نے نہیں کھایا ابھی تک۔"

"تم کھا لو پھر۔" وہ ایک دم کاٹ کھانے کو تھا اب کے وہ اس کو بتا نہیں پائی تھی کہ اس نے کیک بھی خود بنا تھا۔ وہ ضبط کے بحر بیکراں میں اتر گئی تھی اس لمحے۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا نظریۂ ضرورت کم از کم میں تو تسلیم نہیں کرتی۔" اس نے عفت کو کافی کا مگ تھماتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی؟" وہ جھنجلا ہی تو گئی تھی۔ "دنیا میں ہر چیز نظریۂ ضرورت کے تحت ہی چل رہی ہے۔ حتیٰ کہ

...ان سے ہوتی ہے جس کی انہیں ضرورت ہوتی ہے۔"

عفت اپنی بات پہ مُصر تھی۔

"یہ بات نہیں ہے عفت! دیکھو' رضا کو شاید اب مجھ سے اتنی محبت نہیں ہے' مگر میں اس کی ضرورت تو ہوں۔" وہ عفت کی شاپنگ دیکھتے ہوئے بولی۔

"رضا کی ضرورت کی تم بات نہ کرو۔ وہ اپنی ضرورتیں کہاں کہاں پوری کرتا ہے' تمہیں پتا ہے۔ آج کل وہ اپنی سیکریٹری کے ساتھ گھوم پھر رہا ہے۔ تم دیکھو! تمہارے پاسنگ بھی نہیں ہے وہ۔ کالی بھجنگ سی لڑکی ہے۔ نہ شکل نہ کچھ اور۔"

مینا کے ہاتھ سے چھوٹتے کپڑوں اور اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کے اسے پتا چلا تھا کہ اس کے منہ سے غلط بات نکل گئی تھی۔

اپنے عشق پر نازاں' اپنے شکووں پہ تنہا مینا نے اسے نخوت سے دیکھا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا! وہ بادشاہ تخت نشین تمہارے حصے کی محبت بے دریغ لٹاتا پھر رہا ہے۔ تم اپنا کاسۂ دل سمیٹ کر بیٹھی رہو۔"

اس رات اس نے اپنا احتساب خود کیا تھا۔ اس نے مینا سے معافی کی گزارش کی تھی۔ ہر وقت "میں کون میں کون" کی صدا لگانا بند کر دی تھی۔ طویل عرصے کے بعد اس نے امینہ رضا کو ایک مقام دیا تھا۔ اس نے عبیرہ اور حمزہ کی ماں کو مینا کی جگہ دے دی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ کبھی مینا تھی۔ اس کی یادداشت کے سارے خانوں میں یہ ہی تھا کہ وہ حمزہ اور عبیرہ کی ماں ہے بس۔ دو راہوں پہ چلنے والے' کبھی اپنے من کو سکون نہیں دے پاتے۔

کبھی آگے کی راہ' کبھی پیچھے پلٹنے کا عمل
یک روئی اختیار کرو' من کو سکون مل جائے گا

اس نے خود کو ایک دور رس نصیحت کی تھی۔ اس نے تنہا ہونے کا عمل چھوڑ دیا۔ اسے مینا کے پلٹنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ مشین سی بن گئی۔ وہ ہر وقت عبیرہ اور حمزہ کے ساتھ لگی رہتی۔ پھر اسے ان کے درمیان رہنے کی عادت پڑ گئی۔

پھر ہوا کیا تھا۔

رضا کو اس سے شکوہ رہنے لگا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا تو لان میں اس کے انتظار میں بیٹھنے والی لڑکی اب بچوں کے درمیان پڑی سو رہی ہوتی تھی یا شمیم خالہ کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوتی۔ آصفہ بھی اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ شمیم خالہ کی "مخالفت برائے مخالفت" کی پالیسی بھی اپنا اثر کھو چکی تھی۔ رضا کو اس کا وجود بہت ضروری دکھائی دینے لگا تھا۔ "شکوہ جواب شکوہ" کا خاموش عمل اپنی سمت بدل چکا تھا۔

"تم کہاں رہتی ہو مینا! میں جب گھر آتا ہوں' تم مصروف ہی ہوتی ہو اور یہ اپنے آپ کو دیکھا ہے کبھی تین دن سے ایک ہی کپڑے پہنے ہوئے ہو۔"

"میں کیا باتیں کروں آپ سے؟" وہ ہنس پڑتی۔ "اب اچھی لگتی ہوں اس عمر میں بنتی سنورتی؟"

وہ اس وقت دم بخود سا رہ گیا تھا' جب اس کی لائی ہوئی بہت خوب صورت نیلے رنگ کی ساڑھی کو اس نے عبیرہ کے لیے رکھ دیا تھا اور وہ کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ نیلے رنگ کی کبھی وہ دیوانی تھی۔

"عبیرہ کا قد دیکھیں! مجھ سے بھی نکل رہا ہے۔' وہ سہولت سے کہہ کے پلٹ گئی۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو مسز! ریڈ روز کا مہکتا ہوا بوکے اور شاعری کی کتاب۔"

ایک وقت تھا' کبھی وہ لفظوں کی دنیا میں بسا کرتی تھی' گرمیوں کی گرم دوپہریں بے اثر ہو جاتی تھیں۔ موسموں کی تلخی بے رحم نہیں لگا کرتی تھی۔ محض لفظوں کے سہارے وہ جی اٹھا کرتی تھی۔ وہ حمزہ کی شرٹس ہینگ کر رہی تھی۔

اس نے بوکے میز پہ رکھ دیا تھا۔ کتاب الٹ پلٹ کے دیکھنے کے عمل میں وہ بہت جامد اور بے حس نظر آ رہی تھی۔

"ہر جگہ محبت ہے۔" اس نے عنوان کو زیر لب پڑھا۔

"ایسا ہی ہے نا؟" اس نے غور کیا تھا کہ رضا کی مسکراہٹ آج بھی جان لیوا تھی۔ بھٹکانے والی' راستہ کھوٹا کرنے والی۔

"اب یہ مت کہنا کہ اب یہ کوئی عمر ہے ایسی باتیں کرنے والی۔" اس نے اس کے ہاتھ سے حمزہ کی شرٹ لے کر لٹکا دی اور الماری کا پٹ سہولت سے بند کر دیا۔

"محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ بڑھاپے کی محبت تو واقعتاً "جان لیوا" ہوتی ہے۔" مینا نے دھیرے سے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ حمزہ کی بک ریکس کے پاس کھڑا کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا' یکدم چونکا۔

"آپ کی بات کر رہی ہوں..... اور کیک کہاں ہے؟" وہ شگفتگی سے بولی۔

"کیک میں اس لیے نہیں لایا کہ تم خود بیک کرو گی۔"

"ماما جانی' مما جی!" حمزہ حسب عادت دور سے ہی آوازیں دیتا آ رہا تھا۔

لو! آ رہا ہے تمہارا لاڈلا۔"

"واؤ بابا! کیا حال ہیں آپ کے؟" وہ رضا کے کندھے سے جڑ کے بیٹھ گیا۔

ان کی تنہائی چپ کی بکل مارے بیٹھ گئی تھی۔ وہ آنے والی بہار کو سمیٹے کمرے سے باہر نکل آئی۔

اس منظر میں وہ پوری فیملی تھی۔ گلابوں کی خوشبو' کیک کی مٹھاس اور محبت کے رسیلے ذائقے سے بھرپور ایک خوشگوار تاثر ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔

رضا کے پہلو میں بیٹھے ہوئے اس کی نظر مینا پہ پڑی۔

اس کے لبوں پہ بہت تھکی تھکی سی مسکراہٹ تھی۔ پپڑیوں والے لب ساکت تھے' مگر امینہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔

سوختہ تن پہ رنگ برنگے ملبوسات چڑھا لینے سے کیا من مطمئن ہو جاتا ہے؟ ٹوٹی پھوٹی بھر بھری عمارتوں میں موسمی پھولوں کی بھرمار ہو بھی جائے تو کیا وہ عمارتیں بہت خوب صورت دکھنے لگتی ہیں؟

جذبات کو توجہ کی ہوا نہ لگے تو وہ زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ اوس زدہ لب پپڑی کی تہہ تلے دب جاتے ہیں۔ گلابی گال خزاں رسیدہ پتے بن جاتے ہیں اور دل دھڑکنا بھول جاتا ہے اور سہمے دل کے ساتھ کیا بدن سج جاتا ہے

تم ہمارے نہیں تو کیا غم ہے
ہم تمہارے تو ہیں' یہ کیا کم ہے

اس نے مینا کے سوالوں سے نظریں چرائیں۔

رضا نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو غور سے دیکھا۔

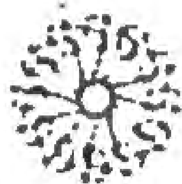
بہت محنت درکار ہے۔ دل و جسم کے رشتے جوڑنے میں دلداریوں کے ناتے جوڑنے میں' سانس کی ڈوری باندھنے میں' قوس قزح کے رنگ چھانٹنے میں' محبتوں کی باڑیں لگانے میں' کہیں اور نکلے چاند کو اپنی چھت پر واپس لانے میں' روٹھے ہوئے دلدار کو منانے میں ....

اس نے امینہ کی آدھی بوتل منہ سے لگا لی۔ عمل بہت چھوٹا تھا' مگر اس کے اثرات دو روٹھے ہوؤں کو قریب کر گئے۔ مینا کے کرب زدہ چہرے پہ مسکراہٹ در آئی۔ اور امینہ رضا کا شرمگیں چہرہ رضا کی آنکھوں میں چاند کی طرح اتر گیا تھا۔

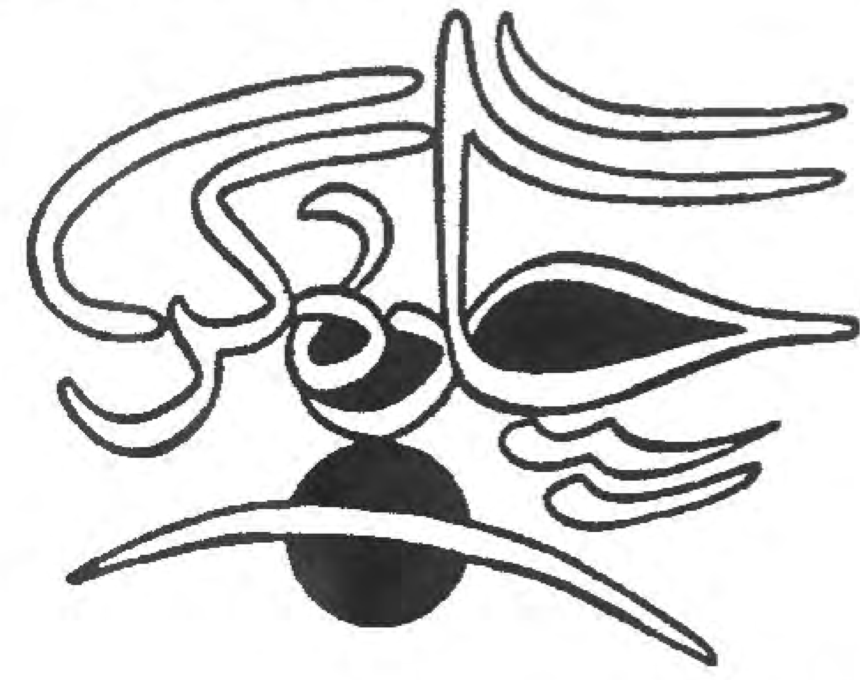
"خدا کرے! وہ ہمیشہ خوش رہیں۔ آباد رہیں۔"

ہمارے اردگرد نجانے کتنے لوگ دو زندگیاں گزارتے ہیں۔ اندر کی چپ اور باہر کے شور کے ساتھ۔ نئے پن سے عاری دل اور حبس زدہ ماحول میں مینا جیسے لوگ جیتے نہیں' محض زندہ رہتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ مینا اور مینا جیسی لڑکیاں کبھی دکھ کی فصل نہ کاٹیں۔ اپنے پن کے چرخے پہ محبت کاتتی رہیں اور خوش رہیں۔ وہ اپنے وجود کے ساتھ آباد رہیں۔



نازیہ کنول نازی



فگار پاؤں میرے' اشک نارسا میرے
کہیں تو مل مجھے اے گمشدہ خدا میرے

"السلام علیکم صاحب جی! مزمل صاحب ملنے آئے ہیں آپ سے۔" وہ ابھی گہری نیند سے بیدار ہوا تھا' ملازم کی اطلاع پر منہ بنا کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے' اسے بٹھاؤ' میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔" بانہوں میں دبا تکیہ سائیڈ پر پھینکتے ہوئے بستر سے نکل گیا تھا۔ اگلے پچیس منٹ کے بعد وہ فریش ہو کر مزمل حسن کے سامنے بیٹھا تھا۔

"کیسے ہو' بڑے دنوں کے بعد نظر آئے۔"

"ویزے کے چکر میں پڑا ہوا تھا یار! تمہیں تو پتا ہے آج کل جینا حرام ہوا ہے میرا۔"

"کیوں' اب کیا ہوا؟"

"کیا ہونا ہے' ابا ریٹائر ہو گئے ہیں اور اماں ان کی پنشن کے پیسوں سے مجھے دبئی بھجوانا چاہ رہی ہیں' اپنے دور کے کسی رشتہ دار کے پاس۔"

"کیوں خیریت' میرا مطلب ہے تم جاب تو یہاں بھی کر رہے ہو۔"

"دس ہزار کی جاب سے کیا ہوتا ہے یار! دو ماہ بعد بشریٰ اور یسریٰ آپا کی شادی ہے' کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"ہوں یہ تو ہے' ناشتا کر آئے ہو یا ابھی کرنا ہے؟"

"گولی مارو ناشتے کو' میں اصل میں کچھ پیسوں کے لیے آیا تھا تمہاری طرف۔ میرے حالات کا تو تمہیں پتا ہی ہے' اوپر سے اس نئی والی محترمہ کی فرمائشوں نے پریشان کیا ہوا ہے۔ ابھی کل موصوفہ کا موبائل چھن گیا۔ گھر والے لے کر نہیں دیں گے' اسی لیے مجھ سے فرمائش کر دی' نیا نیا افیئر ہے' منع بھی نہیں کر سکتا۔" اس کی پریشانی کی وجہ جان کر ارتضیٰ کے لبوں پر ہلکی سی مسکان بکھر گئی۔

"کتنے پیسے چاہئیں؟"

"دس ہزار۔" فرمائش یوں ہوئی تھی جیسے ادھار لینا ہو۔

"ٹھیک ہے مل جائیں گے' مگر ایک شرط پر۔"

"مجھے پتا ہے تم واپسی کی شرط رکھو گے' یار! کر دوں گا واپس' تمہارا ایک ایک پیسہ میرے دل پر لکھا ہے۔ جب تک واپس نہیں کروں گا' مروں گا بھی نہیں' آئی پرامس۔"

"مجھے پتا ہے' مگر میں واپسی کی شرط نہیں رکھ رہا۔"

"پھر۔۔۔؟" وہ حیران ہوا تھا۔ ارتضیٰ نے نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

"پھر یہ کہ پاپا اپنی کسی کزن کی بیٹی کے ساتھ میرا رشتہ فائنل کر رہے ہیں۔ مجھے ان کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں' مگر میں لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں' اسے قریب سے جاننا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں وہ میرے مزاج سے میل بھی کھاتی ہے کہ نہیں۔"

"اوہ! تو تم اس لڑکی کا موبائل نمبر حاصل کرنا چاہتے ہو۔"

"نہیں۔۔۔ میں ایسی خرافات میں نہیں پڑتا' اگلے ہفتے پاپا کی ان کزن کے بیٹے کی شادی ہے۔ اسی لیے پاپا نے اسپیشلی مجھے پاکستان بھیجا ہے تاکہ میں لڑکی کو دیکھ لوں اور تم اس شادی میں میرے ساتھ چل رہے ہو۔"

"میں۔۔۔ مگر میں کیوں؟"

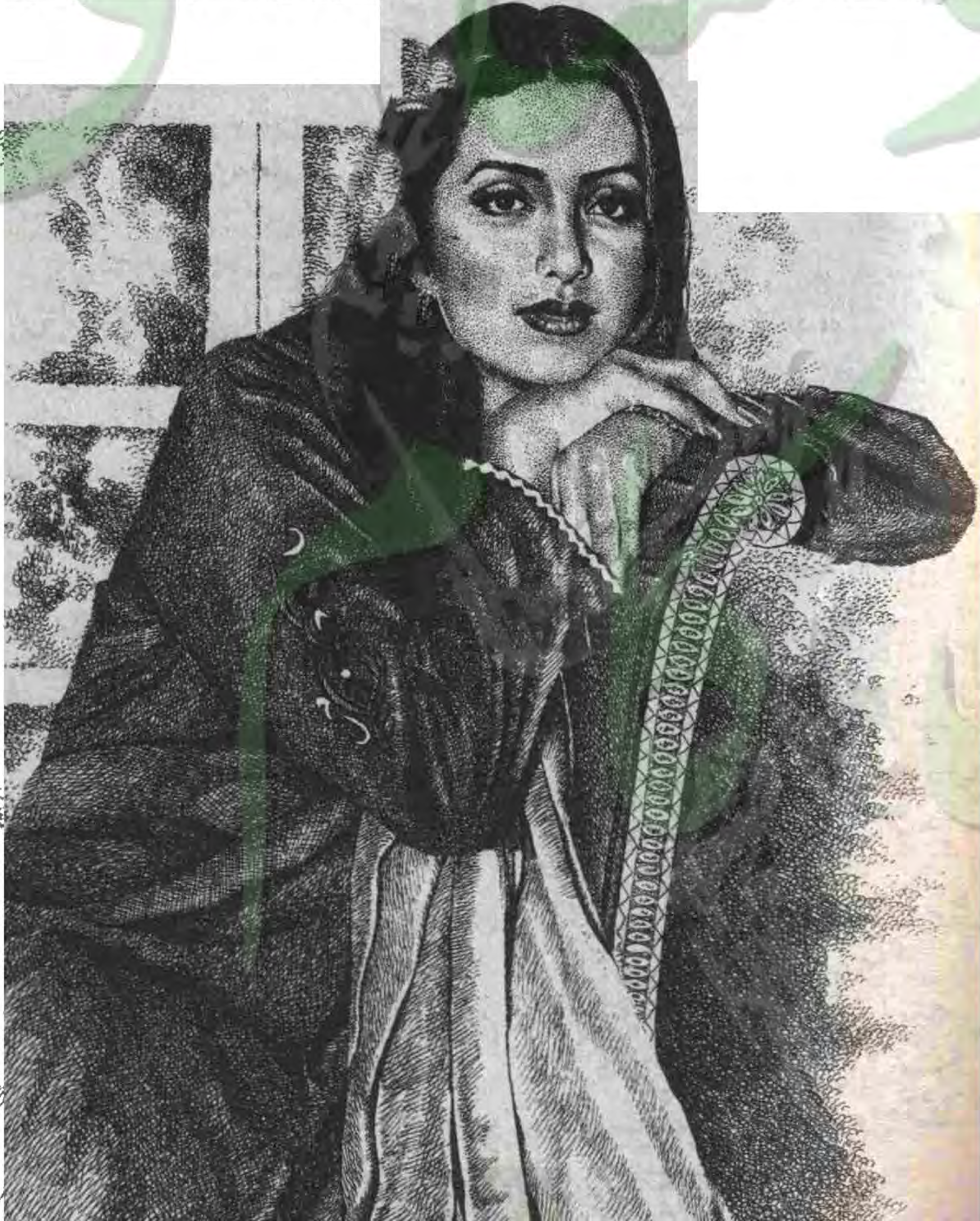
"بتا دوں گا یہ بھی' تم بتاؤ تمہیں دس ہزار چاہئیں یا نہیں؟"

"سوچ کے بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے' جب سوچ لو بتا دینا' پیسے دے دوں گا۔"

"مذاق کر رہا ہوں یار! اتنا بھی نہیں سمجھتے تم۔ یار وہی جو یاروں کے کام آتے ہیں مشکل میں۔" فوراً سے پیشتر اس نے رائے بدلی تھی۔

وہ مزمل کی ہوشیاری پر گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھنے والا مزمل حسن اس کے اسکول لائف کے دوستوں میں سے ایک تھا۔ اس کے حالات بدل گئے تھے مگر مزمل حسن کی فیملی اب بھی زندگی کے اسی مدارج پر کھڑی تھی۔ تاہم اسٹیٹس میں نمایاں فرق کے باوجود وہ کبھی اپنے



دوستوں سے نہیں بدلا تھا۔ شاید اسے بدلنا آتا ہی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

ہر بار یہی سوچا، ہر بار قسم کھائی
اس بار نہ روئیں گے، دامن نہ بھگوئیں گے
اے معنیٔ گل لیکن جب موسم گل آیا
معصوم شگوفوں کی معصوم اداؤں نے
مجبور بنا ڈالا، ہر بار رلا ڈالا

"نمرہ یار۔۔۔ اب بس بھی کرو، اور کتنا روؤ گی، سمجھ لو کہ وہ شخص تمہارے نصیب میں تھا ہی نہیں۔ اب انسان نصیب سے تو نہیں لڑ سکتا نا۔"

"میں اس شخص کے لیے نہیں رو رہی۔ مجھے اپنی بے بسی پر رونا آرہا ہے۔ بچپن سے تائی امی میرے ساتھ یہی کرتی آرہی ہیں۔ وہ مجھ سے ہر چیز چھین لیتی تھیں۔ مگر احمد کوئی چیز نہیں تھا، منگیتر تھا میرا۔ پانچ سال اس کا نام میرے نام کے ساتھ منسوب رہا ہے۔ آج اگر میری امی ہوتیں تو کیا میرے ساتھ یہ سب ہوتا؟"

اس نے اپنی پھوپھو زاد کزن سعدیہ کی طرف دیکھا۔ جواب میں وہ افسوس سے سرہلا کر رہ گئی۔

"یہ تو ہے، مگر قصور تو احمد کا بھی ہے۔ وہ کیوں آیا ممانی کی باتوں میں، کیا اسے تمہارا نہیں پتا کہ تم کس کردار کی ہو۔ اسے تو ممانی کی اس سازش میں تمہارا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ کجا کہ سارے تعلق توڑ کر چلا گیا۔"

"تائی اماں کی چالوں کو سمجھنا عام ذہن کے بس کی بات نہیں ہے۔ مرد کے ذہن میں شک آجائے تو عقل رخصت ہو جاتی ہے۔"

"اچھا ابھی تم اس بات کو بھول جاؤ پلیز، کل مہمان آنا شروع ہو جائیں گے، خوامخواہ تماشا بن جائے گا۔"

"تماشا تو بن گیا ہے۔ ایک لڑکی پر بدکرداری کا الزم لگ جائے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔"

وہ آزردہ تھی مگر اس سے پہلے کہ سعدیہ کوئی جواب دیتی، کوئی دبے پاؤں وہاں چلا آیا۔

"ایکسکیوز می! مجھے مزمل حسن کہتے ہیں۔ کیا مجھے ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟" اس کی آمد پر دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

"جی۔۔۔ میں بنا دیتی ہوں۔"

نظروں ہی نظروں میں نمرہ کو تسلی دیتے ہوئے سعدیہ اس اجنبی شخص کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔ پیچھے نمرہ دیر تک قریبی پودے کے پتوں کو نوچتے ہوئے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

ترمذی ہاؤس میں دو گھرانے برسوں سے آباد تھے۔ ایک نواز ترمذی صاحب کا، جن کی بیگم بلقیس ترمذی تھیں اور ان کے دو بچے یاسر اور ماریہ تھے۔ دوسرا گھرانہ شہباز ترمذی صاحب کا تھا۔ جن کی بیگم قرۃ العین ترمذی شادی کے پانچ سال بعد ایک بیٹی نمرہ کو جنم دے کر کچھ عرصہ بیمار رہیں، پھر ملک عدم سدھار گئیں۔

ان کی رحلت کے بعد نمرہ نے جس طرح اس گھر میں پرورش پائی تھی، اس کا دل ہی جانتا تھا۔ بلقیس بیگم یوں تو خاصی دین دار خاتون تھیں مگر نمرہ سے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا اور اس بیر کی ایک بڑی وجہ ہر معاملے میں ان کی بیٹی پر نمرہ شہباز کی برتری تھی۔ ان کے گھر میں جو بھی آیا تھا، نمرہ کی خوب صورتی، اس کی ذہانت اور سلیقے کی تعریف کرتا تھا، جس پر بظاہر وہ خوشی کا اظہار کرتیں لیکن اندر ہی اندر جل کر رہ جاتیں۔ ان کی بیٹی ماریہ، نمرہ کے مقابلے میں بہت خوب صورت تھی مگر نہ جانے سب کیوں نمرہ ہی کی تعریف کرتے۔ ماں باپ کی آزادی اور بے جا چھوٹ نے ہی ان دونوں بہن بھائیوں کو کسی لائق نہیں چھوڑا تھا۔

ان کے بیٹے یاسر کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی خوب زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ماں بیٹا اور بیٹی صبح ناشتا کر کے گھر سے نکلتے تھے اور شام کے بعد رات کا کھانا تیار ہو جانے کی یقین دہانی کر کے ہی گھر واپس لوٹتے تھے۔ پچھلے کئی روز سے ان کا یہی معمول

تھا مگر نمرہ گھر کے سکون کے صدقے سب برداشت کرتی رہی۔

اس روز اسے رات میں پیاس لگی تھی۔ تب ہی ایک نظر سوئے ہوئے اپنے بیمار بابا پر ڈال کر وہ نیچے کچن میں پانی پینے آئی تو ماریہ سیل فون کان سے لگائے سرگوشی کے انداز میں کسی سے باتیں کرتے ہوئے بیرونی گیٹ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہلے تو نمرہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئی، پھر بھاگ کر تائی کے پاس آئی تھی۔ بلقیس بیگم اس کی اطلاع پر حواس باختہ سی کمرے سے نکلیں اور عین موقع پر بیٹی کو جالیا۔

نمرہ کا دل اس لمحے بہت تیزی سی دھڑک رہا تھا۔ کیونکہ کل سے احمد عباس گاؤں سے شہر آیا ہوا تھا ان کے گھر۔ وہ اس کا منگیتر اور اس کے ابا کے بہت قریبی دوست کا بیٹا تھا۔ بلقیس بیگم کو اس گھر میں اس کی آمد پسند نہیں تھی مگر وہ ہمیشہ بہت مجبوری میں کبھی کبھار ہی اس طرف آتا تھا۔ کل رات بھی خراب موسم کے باعث اسے تایا جان نے زبردستی روک لیا۔

نمرہ کو پوری امید تھی کہ تائی اتنے بڑے احسان کے عوض ضرور اپنے دل سے اس کے لیے پلنے والی ساری کدورتیں نکال دیں گی مگر۔۔۔ اسی وقت تایا ابا جاگ گئے تھے اور ان کو سامنے پا کر تائی اماں نے واویلا کرتے ہوئے سارا الزام اس کے سر ڈال دیا، یہ کہہ کر کہ وہ اپنے کسی آشنا سے ملنے چوری چوری گھر سے فرار ہو رہی تھی۔ ان کی بیٹی ماریہ کی آنکھ کھل گئی اور اس نے اسے پکڑ لیا۔

مارے تحیر کے وہ کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔ کوئی پانچ وقت اللہ رب العزت کے حضور جو ساری کائنات کا رب ہے، سربسجود ہو کر ایک قطعی بے گناہ مسلمان لڑکی پر اتنا بڑا بہتان بھی لگا سکتا ہے۔۔۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ اس وقت تایا نے اسے جن نگاہوں سے دیکھا تھا اس کا بس نہ چلتا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ احمد نے بھی یہ ساری باتیں سنی تھیں۔ اس نے اسے کوئی ملامت کی تھی نہ کچھ کہا۔ تاہم چند روز کے بعد اس کی طرف سے منگنی کا سامان ضرور واپس آگیا تھا اور تب سے ہی وہ رو رہی تھی۔

وہ بے قصور ہو کر بھی سب کی نظروں سے گر گئی تھی اور جو اصل قصوروار تھی، وہ اب بھی سارے گھر میں پوری آزادی کے ساتھ دندناتی پھرتی۔ سعدیہ جو اس کی کزن بھی تھی اور دوست بھی، اس کا درد سمجھتی تھی کیونکہ اس کی طرح وہ بھی بلقیس بیگم کی فطرت کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ٹی وی لاؤنج میں اس وقت تایا ابا، تائی اماں، ان کے دونوں بچے، اور وہ دونوں اجنبی مہمان بیٹھے تھے، جب پونچھا لگاتے ہوئے نمرہ نے تائی اماں کو کہتے سنا۔

"ارتضیٰ۔۔۔ میرے بچے! کاش میں تمہیں بتا سکتی کہ اتنے سالوں بعد تمہیں یہاں اپنے گھر دیکھ کر مجھے کتنی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ جب تم چھوٹے سے تھے تو اپنے بابا کی گود سے نکل نکل کر میری طرف آتے تھے، یہ اپنی ماریہ کے ساتھ بڑی دوستی تھی تمہاری ہائے کیا وقت تھا وہ بھی۔" گہری سرد آہ بھرتے ہوئے انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس کا ماتھا چوما تھا۔

"اور ہاں! اب آئے ہو تو میں نے تمہیں دو ماہ سے پہلے نہیں جانے دینا۔ بھائی صاحب اور بھابھی سے بات ہو گئی ہے میری، وہ دونوں بھی خوش ہیں۔ تم یہاں ہو گے تو گھر میں ذرا رونق بھی لگ جائے گی۔ یہ میری نمانی بیٹی جو ہے، سارا دن گھر میں قید رہتی ہے، نہ دنیا داری کا کچھ پتا ہے نہ دوسری چلتر لڑکیوں جیسے کام آتے ہیں اسے۔ کچھ کھاتی پیتی نہیں ہے تو خون کی بھی کمی ہے، ذرا سا کام کر کے ہی تھک جاتی ہے، بہت ڈانٹتی ہوں مگر اس پر اثر نہیں ہوتا، تم یہاں ہو گے تو اس کملی کا دل بھی بہل جائے گا۔"

نمرہ کا دل ان کے ایک ایک لفظ پر کٹ رہا تھا مگر وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی۔ تائی کی ایک تسبیح مکمل ہو گئی تھی اور اب دوسری شروع کر رہی تھیں۔

”بیٹا! برا نہ ماننا۔ تمہارے ساتھ تمہارا دوست بھی ہے۔اس لیے بتا رہی ہوں۔ نمرہ میرے دیور کی بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی ماں وفات پاگئی تھی۔ میں نے زیادہ سختی اس لیے نہیں کی کہ بن ماں کی بچی ہے' لوگ کیا کہیں گے' شاید اسی کوتاہی کی وجہ سے اس نے ہمیں ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سچ پوچھو تو میں اپنا بیٹا بھی اسی لیے جلدی بیاہ رہی ہوں کہ جن لڑکیوں کی حیا مرجاتی ہے وہ کچھ بھی کرسکتی ہیں بیٹا! اس لیے ڈرتی ہوں۔ کمبخت کو اپنے باپ کی بیماری کا احساس ہے نہ تایا کی عزت کا' سارا دن کام میں مصروف رہتی ہوں پھر بھی کہیں نہ کہیں سے موقع نکال لیتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں پانچ سالہ منگنی ٹوٹ گئی۔ توبہ توبہ.....“

نمرہ کو لگا اگر وہ اب بھی چپ رہی تو اس کے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی' تب ہی پونچھا پھینک کر وہ تائی کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”اللہ کا خوف کریں تائی! ایسا نہ ہو کہ بیٹھے بیٹھے آپ پر اس کا عذاب نازل ہوجائے' حد ہوتی ہے جھوٹ اور بہتان تراشی کی بھی.....“ تائی کو شاید اس سے اس جرأت کی امید نہیں تھی' تب ہی ان کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”دیکھا... دیکھا یاسر کے ابا! اس لڑکی کی بدزبانی کو۔ ارے اللہ کا غضب نازل ہو تم پر' جسے اپنی بے حیائی اور بے شرمی پر ہلکا سا ملال بھی نہیں۔ باپ سے بڑھ کر تایا کی عزت کا کوئی خیال نہیں۔“

بلقیس بیگم کے زور زور سے بولنے کی آواز سن کر فوراً سعدیہ بھاگتی ہوئی وہاں آئی تھی۔

”نمرہ! چلو کمرے میں' ہزار بار سمجھایا ہے بڑوں کے سامنے اس طرح بات نہیں کرتے۔“

”کیوں... بڑے چاہے گلا کاٹ دیں؟“

”تم چلو یہاں سے۔“ زبردستی اس کا ہاتھ تھام کر وہ اسے وہاں سے لے آئی۔ نمرہ کمرے میں آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”صبر سے کام لو نمرہ! اس طرح چیخ چلا کر تم خود کو درست ثابت نہیں کرسکتیں۔“

”تو پھر کیسے ثابت کروں میں خود کو درست' وہ جس کے سامنے چاہتی ہیں مجھے بے لباس کرکے رکھ دیتی ہیں۔ صرف اس لیے کہ میری سائیڈ پر بولنے والا کوئی نہیں۔ میرا کیا قصور ہے اگر میری ماں نہیں ہے اور باپ چارپائی پر پڑا ہے تو۔ میری بھی عزت ہے سعدی! کیوں اللہ اس عورت کو اس کے کیے کی سزا نہیں دیتا' کیا میرا رب نہیں ہے وہ؟ کس سے مانگوں جاکر میں...؟“ آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ وہ پھٹ پڑی تھی۔ سعدیہ گہری سانس بھر کر سر جھکا گئی۔

”امی سے بات کروں گی کہ وہ ممانی کو سمجھائیں ہم پلیز یاسر بھائی کی شادی تک صبر سے کام لے لو' پھر اللہ نے چاہا تو ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی تمہاری سرخروئی کی۔“

”نہیں... اللہ صرف اختیار والوں کی سنتا ہے' بے بس لوگوں کے لیے اس کے پاس بھی کوئی وقت نہیں ہے۔“

”ایسے نہیں کہتے' مایوسی کفر ہے۔“

”کافر ہی تو ہوجاتا ہے انسان مسلسل اذیت سہ سہ کر۔“

آنسو پونچھ کر کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ سعدیہ اس کی اذیت پر کڑھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

تندی ہاؤس میں مایوں کی تقریب جاری تھی مگر وہ دونوں تیار ہونے کی غرض سے ایک ہی کمرے میں گھسے پچھلے آدھ گھنٹے سے اس گھر کے مکینوں پر تبصرہ کررہے تھے۔

ارتضیٰ سر کے نیچے بازو رکھے چت لیٹا تھا جبکہ مزمل حسن گود میں تکیہ رکھے اس کے برابر میں بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”جی جناب! کیسی لگی آپ کو اپنی مستقبل کی ہوم منسٹر محترمہ ماریہ نواز صاحبہ۔“

”اچھی ہے' خوش شکل' خوش مزاج' ماڈ اور سب سے بڑھ کر کردار کی صاف لڑکی' تمہیں پتا ہے میں عورت ذات کی ہر خامی برداشت کرسکتا ہوں' مگر کردار میں جھول نہیں۔ بے شک پاپا نے میرے لیے ایک بہترین لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔“

”پھر کیا خیال ہے' صبح بتادوں آپ کی خالہ جی کو کہ میں جسے وہ ارتضیٰ سمجھ رہی ہیں' ان کا مستقبل کا داماد نہیں ہوں۔“

”نہیں' ابھی نہیں' ابھی مجھے بہت کچھ پرکھنا ہے۔“

”مثلاً“...“

”مثلاً“ بھی بتادوں گا۔ فی الحال تو جیسا کہتا ہوں ویسا کرتے جاؤ۔ بس....“

”ٹھیک ہے باس! ویسے نمرہ بھی اچھی لڑکی ہے۔“

”ہوگی.... مگر مجھے پسند نہیں ہے۔“

”کیوں.... مائنڈ مت کرنا' مگر مجھے وہ بدکردار نہیں لگتی' ایک عجیب سی معصومیت و نور ٹپکتا ہے اس کے چہرے پر' جو دیکھنے والے کو دور سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔“

”چہروں پر مت جانا میرے دوست! چہرے اکثر دھوکا دیتے ہیں۔ نور کی جہاں تک بات ہے وہ تو بلقیس خالہ کے چہرے پر بھی جھلکتا ہے مگر اندر سے وہ کیسی خاتون ہیں میں جانتا ہوں۔ ماریہ میں یہ بات نہیں ہے' وہ گھنی نہیں ہے' کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھتی' نہ اپنی کوئی خوبی نہ خامی۔“

”چلو ٹھیک ہے یار! شادی تو تم نے ہی کرنی ہے۔ میں تو یوں ہی دس ہزار کے عوض قربانی کا بکرا بن کر آگیا ہوں۔“

تکیہ سائیڈ پر گراتے ہوئے جوں ہی مزمل حسن نے کہا' ارتضیٰ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”قربانی کے بکرے! ارتضیٰ سمجھ کر جتنی اس گھر میں تمہاری خاطر داری ہورہی ہے نا' تمہارے گھر والے دیکھ لیں تو بے ہوش ہوجائیں۔“

”ہوں یہ تو ہے' کل میں سوچ رہا تھا تمہیں اب واپس بھجوا ہی دیتا ہوں' بلقیس خالہ کو اس گھر میں تمہارا دندناتے پھرنا بالکل بھی پسند نہیں۔“

وہ اسے چھیڑنے کو کہہ رہا تھا۔ جواب میں ارتضیٰ نے ہنستے ہوئے اس کی گردن دبوچ لی۔

”جان لے لوں گا تمہاری اگر ایسی کوئی بے ایمانی کی تو' یہ یاد رکھنا۔“

”اوکے اوکے' چلو تیاری پکڑو۔ نیچے تمہاری بلقیس خالہ بے تابی سے ہمارا انتظار کررہی ہوں گی۔“

فوراً“ سے پیشتر ہتھیار ڈالتے ہوئے وہ بستر سے نکلا تھا۔ جواب میں ارتضیٰ بھی مسکراتے ہوئے بیڈ سے اتر کر واش روم میں گھس گیا۔

☆ ☆ ☆

مجھ سے جدا ہوئے نہ تیری ذات میں رہے
ہم یوں ہی شام غم کی حوالات میں رہے
کس عرصہ فریب کی دہشت میں تھے کہ ہم
دن میں ہی رہ سکے' نہ کہیں رات میں رہے
اک شہر خواب ہم نے بسایا تھا اور پھر
اس میں رہے نہ اس کے مضافات میں رہے
کیوں چھینتا ہے مجھ سے میرا سایۂ وجود
سورج سے کوئی کہہ دو کہ اوقات میں رہے
میں جس کے روز و شب میں زمانوں سے قید ہوں
مرجائے وہ اگر میرے حالات میں رہے
ہر بار کوئی بات ادھوری رہا کرے
ہر بار تشنگی سی ملاقات میں رہے

زخمی چڑیا کو ہاتھ میں دبوچے وہ اسے پانی پلانے کی کوشش کررہی تھی۔ جب ارتضیٰ چائے کی طلب میں وہاں چلا آیا۔

”ایکسکیوز می....!“

نمرہ نے آنکھوں کے گوشے میں نمی لیے پلٹ کر اسے دیکھا' پھر رخ پھیر لیا۔

”جی....“

”ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟“

”جی ہاں.... مگر بہتر ہوگا کہ یہ فرمائش آپ اپنے دوست کی ہونے والی منگیتر سے کریں۔“

"کیوں۔۔۔ آپ کو چائے بنانی نہیں آتی؟"

"نہیں۔۔۔"

"ویری سیڈ۔۔۔ صبح سے شام تک کام میں لگی رہتی ہیں اور چائے بنانی نہیں آتی۔"

"کہہ دیا نا نہیں' اب جائیں یہاں سے۔ میں مزید کوئی نیا اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتی۔" تلخی سے بھرپور لہجے میں کہتے ہوئے وہ خود ہی کچن سے نکل گئی تھی۔

ماریہ کو شاپنگ کرنی تھی۔ لہٰذا مزمل جو ارتضیٰ عباس بنا ہوا تھا' اسے مارکیٹ لے گیا تھا۔ اس نے بھی ساتھ جانا چاہا مگر بلقیس بیگم نے اسے ساتھ جانے سے منع کر دیا تھا۔ تب ہی وہ چائے کی طلب میں کچن کی طرف آگیا تھا مگر نمرہ کے تلخ رویے پر حیران رہ گیا تھا۔

اسے یہاں ایک بات بہت بری لگتی تھی کہ اس گھر میں انسان کی عزت نہیں تھی۔ انسان کی حیثیت اور مرتبے کو سلام تھا۔

سارا گھر بلقیس بیگم کی رائے اور احکامات پر چلتا تھا۔ ان کے شوہر اور بچوں کو ان کے کسی معاملے میں بولنے کا اختیار نہیں تھا۔ شہباز ترمذی فالج کے اٹیک کے باعث اٹھنے بیٹھنے یہاں تک کہ بولنے سے بھی معذور تھے اور ان کی بیٹی نمرہ عجیب خاموشی اور اداسی کے لبادے میں لپٹی سارا دن کولہو کے بیل کی مانند گھر کے مختلف کاموں میں جتی رہتی یا پھر اپنے معذور باپ کے کمرے میں گھسی رہتی۔

اگلے روز برات جانی تھی۔ وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلا تو اچانک سیڑھیوں کے دہانے پر کھڑی نمرہ سے ٹکرا گیا۔

"سوری۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا آپ برے وقت کی طرح کسی بھی جگہ مل سکتی ہیں۔"

"اگر میں برا وقت ہوں تو ریاست کے نواب آپ بھی نہیں ہیں۔"

اس کی ساری شخصیت کا غرور اس کے منہ پر مارتی' ہوا کے سبک رو جھونکے کی مانند ایک پل میں وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ارتضیٰ اس کی اس درجہ بدتمیزی پر سر کھجا کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

اس روز ولیمہ کی تقریب تھی۔

شہر کے سب سے مہنگے میرج ہال میں مہمانوں کے لیے دعوت ولیمہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ مزمل حسن کے جو ارتضیٰ عباس بنا ہوا تھا' ماریہ نے صبح صبح ہی کپڑے استری کر دیے تھے۔ ہمہ وقت وہ اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی مگر حقیقی ارتضیٰ عباس جو مزمل حسن بنا ہوا تھا' کو کوئی گھاس بھی نہیں ڈال رہا تھا۔ اس کے کپڑے بھی نمرہ کے سپرد کر دیے گئے تھے۔

سعدیہ کی بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ لہٰذا گھر کا سارا کام نمرہ کے کندھوں پر ہی آ پڑا تھا۔ صبح افراتفری میں ناشتا تیار کرتے ہوئے اس کی کلائی پر تیل آگرا تھا۔ جس سے فوراً" آبلہ بن گیا اور اب اس کے آبلے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

ناشتے کے بعد برتنوں کا ڈھیر دھو کر وہ ابھی فارغ ہوئی تھی کہ ماریہ نے اسے کپڑوں پر لگا دیا۔ شادی والے گھر میں کسی قسم کا تماشا مزید نہ بننے کے لیے وہ خاموشی سے ان کے ہر حکم پر سر جھکا رہی تھی۔ ارتضیٰ حسن کے کپڑے استری کرتے ہوئے ابھی اس نے استری شلوار کی ایک سائیڈ پر رکھی ہی تھی کہ وہاں سوراخ بن گیا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ہوا کیا ہے؟ جانے وہ کس قسم کا کپڑا تھا یا اس کی قسمت ہی خراب تھی۔

مزمل جس وقت اپنے کمرے سے نکل کر آیا۔ ماریہ اس کا جلا ہوا سوٹ ہاتھ میں لیے نمرہ پر برس رہی تھی۔ وہ ابھی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ جب نمرہ کی وضاحت پر ماریہ نے اسے زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔

"اسٹوپڈ۔۔۔ تم چاہتی ہی یہی ہو کہ میری بے عزتی ہو۔ سب سمجھتی ہوں میں' مجھے خوش دیکھ کر آگ لگی ہوئی ہے تمہارے اندر۔۔۔"

"تو کیوں سپرد کر کے گئی تھیں میرے' جہاں ہونے والے شوہر کے کیے وہاں اس کے دوست کے بھی کر دیتیں۔"

نمرہ اس کے تھپڑ پر خاموش نہیں رہی تھی۔ ماریہ کو مزید تاؤ آگیا۔

"دیکھا! نکل رہی ہے نا اندر کی جلن باہر' ذرا شادی نپٹ جائے' پھر کرتی ہوں تمہارا کوئی نہ کوئی بندوبست۔"

"ماریہ۔۔۔!" مزمل حسن اچانک وہاں آیا تھا۔ "کیا ہوا' کیوں شور کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں ارتضیٰ! میں تیار ہو رہی تھی تو مزمل بھائی کے کپڑے اس فضول لڑکی کو دے دیے پریس کرنے کے لیے' مگر یہ موبائل پر کسی کے ساتھ مصروف تھی۔۔۔ لے کر سوٹ جلا دیا اتنا قیمتی۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ وہ دوسرا سوٹ پہن لے گا۔ اس میں اتنا شور مچانے والی کون سی بات ہے؟" ماریہ کو نمرہ کے لیے اس کی حمایت پسند نہیں آئی تھی اور یہی بات اس رات اس نے اپنی ماں کو بتائی تھی۔ انہیں خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں نمرہ اپنی مظلومیت سے ارتضیٰ کو پھانس نہ لے۔ ماریہ نواز کی زندگی سے نمرہ کا کانٹا نکالنے کے لیے انہیں کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔

یاسر کی دلہن گھر آچکی تھی۔ ولیمہ کا فنکشن بھی ہو گیا۔ آہستہ آہستہ مہمان بھی اپنے گھروں کو سدھار گئے تھے۔ بلقیس بیگم اب ارتضیٰ پر (جو حقیقت میں مزمل حسن تھا) نکاح کے لیے زور ڈال رہی تھیں مگر وہ ٹال رہا تھا۔

بلقیس بیگم کی نظر میں اس کی اس ٹال مٹول کے پیچھے بھی نمرہ تھی' جبکہ وہ حقیقت میں ارتضیٰ کے فیصلے کا منتظر تھا۔ ادھر اس کے پاپا نے فون کر کے ماریہ کے لیے اس کی رائے لی تھی اور ارتضیٰ نے اپنی رضامندی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ اگلی صبح وہ بلقیس بیگم کو ساری حقیقت بتانے والا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

ٹیرس پر کھڑے ہوئے اس کی نگاہ نیچے لان پر پڑی تھی اور وہاں کچھ ایسا تھا' جس نے اسے چونکایا تھا۔

دو انسانی ہیولے اس کی تمام تر توجہ کھینچ گئے تھے۔ اسے شک نہیں مکمل یقین تھا کہ ضرور نمرہ شہباز پھر کوئی گل کھلا رہی ہوگی۔ تاہم پھر بھی وہ خود کو دبے پاؤں وہاں گھر کے پچھواڑے میں آنے سے نہیں روک سکا تھا۔

"حمرا! تم سمجھتے کیوں نہیں۔ ابھی میرا تم سے ملنا ٹھیک نہیں ہے۔ پلیز ابھی تم واپس جاؤ' کل صبح میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر تمہارے گھر آجاؤں گی' قسم سے۔۔۔"

"اگر نہ آئیں تو۔۔۔؟"

"نہ آئی تو جان سے مار دینا۔ بس۔۔۔"

"ٹھیک ہے' اس بار لگتا ہے یہی کرنا پڑے گا۔"

وہ جو کوئی بھی تھا یقیناً" اس سے نمرہ کے گہرے مراسم تھے۔ تب ہی متنبہ کرتا ہوا وہ گیٹ پھلانگ گیا تھا۔ نسوانی ہیولا اس شخص کے فرار کے بعد جوں ہی واپسی کے لیے پلٹا' ارتضیٰ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

"اوہ۔۔۔ تو اصل کہانی یہ ہے تمہاری۔ بلقیس آنٹی نے بالکل صحیح تعارف کروایا تھا تمہارا۔ شکل مومناں تے کرتوت کافراں۔۔۔"

"شٹ اپ۔۔۔" اس کے طنز کے جواب میں ماریہ چلائی تھی اور نہیں اسے کرنٹ لگا تھا۔ ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑاتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ پیچھے ارتضیٰ اس دیدہ دلیری پر ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

اگلے پندرہ منٹ اور بھی حیران کن تھے۔

ٹی وی لاؤنج میں یاسر کی دلہن سمیت سارا گھر اکٹھا تھا اور انہیں اکٹھا کرنے والی ماریہ نواز تھی۔ مزمل حسن بھی وہیں موجود تھا اور ارتضیٰ کے وہاں پہنچنے تک وہ رو' رو کر اسے بتا رہی تھی۔

"میں پہلے دن سے آپ کے دوست کے یہاں قیام پر مطمئن نہیں تھی۔ مجھے پتا تھا کچھ نہ کچھ ہوگا اور آج وہی ہوا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے آپ کے دوست کو انتہائی شرمناک حالت میں وہاں لان میں نمرہ کے ساتھ دیکھا ہے۔ اف ارتضیٰ! میرا دل اس منظر کا تصور کر کے کانپ رہا ہے۔ ہمارے گھر میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور ہمیں خبر ہی نہیں۔"

ارتضیٰ کی طرح مزمل بھی ہکا بکا کھڑا تھا۔ جبکہ

ارتضیٰ کے پیچھے لاؤنج میں داخل ہونے والی نمرہ کے حواس جیسے خود ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ اپنے بابا کے پاس تھی مگر بستر مرگ پر پڑا وہ فالج زدہ شخص کسی بھی طور سے بول کر اس کی پاکیزگی کی گواہی دینے کے قابل نہیں تھا۔ تب ہی ارتضیٰ نے بولنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں سوائے بکواس کے اور کچھ نہیں ہے۔ میں بتاتا ہوں حقیقت کیا ہے۔"

"چپ کر بے غیرت لڑکے مجھے تو شروع سے تمہاری نیت پر شک تھا۔ میں نے ارتضیٰ سے کہا بھی تھا اور یہ نمرہ... اس کا تو میں خون پی جاؤں گی۔ کتنا رسوا کرے گی تو... بول۔" بلقیس بیگم دھاڑ کر اسے چپ کرواتے ہوئے نمرہ پر پل پڑی تھیں۔

"یہ غلط ہے آنٹی! آپ کی بیٹی جھوٹ بول رہی ہے۔ نمرہ کا کوئی قصور نہیں اس میں۔" ارتضیٰ نے کہنا چاہا۔

"بکواس بند کر اپنی... بڑا آیا نمرہ کا ہمدرد' میری بیٹی نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اتنی ہمدردی ہے تجھے نمرہ سے تو کل ہی نکاح پڑھوا دیتی ہوں تیرا اس سے۔ لے جا اس بلا کو اپنے ساتھ' ہم بھر پائے ایسی معصوم بھتیجی سے..."

"آنٹی! آپ میری بات تو سنیں۔ حقیقت وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔"

"بس چپ... خبردار جو آگے ایک لفظ بھی مزید کہا تو' ارتضیٰ بیٹا! میں کل ان دونوں کا نکاح کروا رہی ہوں۔ یہ بدبخت اس طرح ہماری عزت سے کھیل کر نہیں جاسکتا۔" نواز صاحب نے حسب معمول اپنی بیگم کی تائید زور و شور سے سرہلا کر کی تھی۔

"ٹھیک ہے خالہ! جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ میں خود بھی اپنے دوست کی حرکت سے شرمندہ ہوں۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ کل یہ نکاح ہو ہی جانا چاہیے۔"

ارتضیٰ کو امید نہیں تھی کہ وہ ایسا کچھ بولے گا۔ تب ہی اس نے کھا جانے والی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا مگر وہ خاموش سا واپس پلٹ گیا۔

ارتضیٰ کے لیے وہ رات قیامت کی رات تھی۔ بار بار اس نے اپنے گھر کال کرنی چاہی تھی مگر کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ اگلے روز اس کے لاکھ احتجاج کے باوجود نمرہ شہباز اس کی زندگی کا حصہ بن گئی۔ نکاح کے ساتھ ہی رخصتی کا فیصلہ بھی ہوگیا تھا۔ وہ خاموش سا اندر ہی اندر طوفان دبائے سب برداشت کرتا گیا۔

اس کے ساتھ تو جو ہونا تھا ہوگیا تھا مگر بلقیس بیگم کے ساتھ اب جو ہونے والا تھا وہ سوچ کر اسے دلی تسکین ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

تنذی ہاؤس کے ٹی وی لاؤنج میں اس وقت موت کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

ارتضیٰ عباس کے والدین سمیت وہاں نواز تنذی صاحب کی پوری فیملی موجود تھی مگر سب یوں دکھائی دے رہے تھے گویا سانپ سونگھ گیا ہو۔ بلقیس بیگم کے تسبیح کے دانے گراتے ہاتھ واضح کپکپا رہے تھے۔ بڑے صوفے کے پیچھے ماریہ نواز یوں سر جھکائے کھڑی تھی۔ گویا اس نے ایک بھی لفظ زبان سے نکالا تو اس پر گھر کی دیواریں چھت سمیت گر پڑیں گی۔

مزمل حسن سر جھکائے بتا رہا تھا۔

"میں آپ لوگوں سے معذرت خواہ ہوں مگر حقیقت یہی ہے کہ میں ارتضیٰ عباس نہیں ہوں۔ میرا نام مزمل حسن ہے۔ ارتضیٰ میرا دوست ہے۔ اس کے کہنے پر میں یہاں آیا تھا۔ مجھے نہیں پتا اس کی پلاننگ کیا تھی مگر مجھے حقیقی طور پر اس بات کی خوشی ہے کہ ارتضیٰ کو ایک اچھی اور نیک لڑکی زندگی بھر کے لیے بہترین ہم سفر کی صورت مل گئی ہے۔ ایک چال انسان چلتا ہے اور ایک چال کائنات کا رب چلتا ہے۔ پھر ہوتا وہی ہے' جو اللہ رب العزت چاہتا ہے۔"

بازی پلٹ گئی تھی۔ بلقیس بیگم نے اپنے طور پر نمرہ کا پتا صاف کرنے کے لیے جو چال چلی تھی وہ ان ہی پر الٹ گئی تھی۔ وہ یہ بات بھول گئی تھیں۔ بے شک

اللہ جسے چاہتا ہے' سرخرو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیتا ہے۔ آج سالوں بعد وہ سب کے سامنے بے نقاب ہوگئی تھیں۔ انہوں نے کیا چاہا تھا' مگر ہو کیا گیا تھا۔ کائنات کے بڑے منصف کے سامنے ان کی ساری چالیں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔

نمرہ شہباز کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔ اسے ارتضیٰ عباس جیسے امیر کبیر' خوبرو مرد کی بیوی بننے سے زیادہ اپنی پارسائی ثابت ہونے کی خوشی تھی۔ بے شک اس کے مہربان رب نے اس پر بڑا کرم کیا تھا۔

کرم تو اللہ نے ارتضیٰ عباس پر بھی کیا تھا۔ دس ہزار کے عوض ہونے والی ارتضیٰ عباس کی پلاننگ نے اسے ایک بہت بڑے غلط فیصلے سے بچا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ نمرہ واش روم سے نکلی تو ارتضیٰ کو سوتے دیکھ کر بیڈ کے قریب آگئی۔

"ارتضیٰ! اٹھ جائیے' آج آفس نہیں جانا کیا؟"

جب دو' تین بار پکارنے پر بھی اس کی نیند نہیں ٹوٹی تو اس نے بیڈ کے قریب آکر زور سے اپنے گیلے بال جھٹکے' پانی کے چھینٹے ارتضیٰ پر پڑے۔ وہ ہڑبڑا کر نیند سے بے دار ہوا تھا۔

"یہ نیند سے جگانے کا کون سا طریقہ ہے؟"

"جب کوئی شرافت سے نہ اٹھے تو یہی بہترین طریقہ ہے۔" وہ ہنسی تھی۔ ارتضیٰ نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود پر گرا لیا۔

"اچھا... اور جس روز لیٹ گھر واپسی پر تم سوئی ہوتی ہو اور میں جگا تا رہ جاتا ہوں تب...؟"

"تب کیا' مجھے تو سات خون معاف ہیں۔"

"اچھا کس نے کیے ہیں سات خون معاف؟"

"میرے ہم سفر نے۔"

بڑی ادا سے کہتے ہوئے اس نے ارتضیٰ کی ناک دبا دی تھی۔ تب ہی ارتضیٰ نے اسے خود میں جذب کرلیا۔

"میں اتنی اچھی ہم سفر کے قابل نہیں تھا نمرہ! بے شک میرا مہربان رب بہتر جاننے اور کرنے والا ہے۔ پتا ہے! تنذی ہاؤس سے تمہاری رخصتی کے بعد وہاں ایک کے بعد ایک مصیبت نے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے۔ تمہاری کزن ماریہ نواز شادی کے بعد طلاق لے کر ہمیشہ کے لیے گھر واپس آگئی ہے۔ شاید شہباز چچا کی رحلت کے پیچھے بھی ان ہی حالات کا عمل دخل ہے۔ بہرحال ہر انسان کو اپنا بویا تو کاٹنا ہی پڑتا ہے۔ یاسر کی بیوی بھی سنا ہے الگ ہوگئی ہے۔ میں تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ تمہاری ہٹلر تائی نے خود اپنے ہاتھوں سے زبردستی ہمارا نکاح کروا دیا۔ وگرنہ حقیقت کھل جانے کے بعد وہ کبھی تمہیں میرے نکاح میں نہ دیتیں۔"

"ہوں۔ اب تو مجھے بھی یہ سمجھ میں آگیا ہے کہ جب اللہ انسان کو کسی چیز سے محروم کرتا ہے تو یقیناً اس کے پاس آپ کے لیے اس سے بہتر چیز موجود ہوتی ہے۔ میں مزمل بھائی کی ہمیشہ شکر گزار رہوں گی ارتضیٰ! کہ ان کی وجہ سے آپ میرے نصیب کا حصہ بن گئے۔"

ارتضیٰ کے بال بکھیرتے ہوئے اس نے اپنا سر اطمینان سے اس کے کندھے پر ٹکا دیا تھا۔ بے شک ارتضیٰ عباس کی رفاقت میں گزرے پچھلے پانچ سال اس کی زندگی کے بہترین سال تھے۔



مقصدِ حیات

ثمرہ شکور

پورے پچاس ہزار تھے۔ اس نے ایک بار پھر ان نوٹوں کو گنا اور پھر احتیاط سے اوپر ربڑ بینڈ چڑھا کر لفافے میں بند کیا اور صندوق کھول کر اس لفافے کو سب سے نیچے رکھ کر اوپر باقی سامان اور کپڑے وغیرہ رکھ دیے۔

مغرب کی اذان ہوئے دس پندرہ منٹ ہوچکے تھے۔ ہلکی ہلکی رات کا سایہ چاروں طرف چھا گیا تھا۔ فضا میں ایک مانوس سی خاموشی ٹھہر گئی تھی۔ سردیوں میں تو رات بھی ایک دم سے ڈھل آتی تھی اور یہ خاموشی ایک کھٹکا سا دل میں پیدا کرتی تھی۔

عبداللہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ دونوں بچے برآمدے میں اپنا اپنا بستہ کھولے اسکول کا کام کررہے تھے۔ وہ چلتے ہوئے صحن میں آگئی۔ صحن کے دونوں طرف کی دیواریں گارے اور اینٹوں کی بنی تھیں اور لمبائی بھی صرف آٹھ فٹ تھی۔ اگر کوئی دیوار پھلانگ کے آنا چاہے تو آرام سے آسکتا تھا۔

"اللہ نہ کرے۔ یہ کیسا خیال میرے ذہن میں آیا ہے' اللہ ہمیں اپنی امان میں رکھے۔ آمین۔" اس نے صدق دل سے آمین کہا اور اس شیطانی وسوسے کو فوراً" باہر دھکیل دیا۔

"بس آج عبداللہ آتے ہیں تو ان سے کہتی ہوں کہ کسی سے بات کریں اور فوراً" ان دیواروں کو پکا کروائیں اور کم از کم چار فٹ اور اونچائی کریں۔ یہ ہر روز کا خوف تو ختم ہو۔"

اس نے دل ہی دل میں پچاس ہزار کا ایک مصرف تلاش کیا۔ اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی۔ بچے مخصوص آواز سن کے اندر سے دوڑے چلے آئے۔

عبداللہ کے سائیکل اندر لا کے کھڑی کرنے تک دونوں بچوں نے اسے راستے میں ہی قابو کرلیا۔ وہ دونوں کو پیار کرتے اپنے ساتھ لپٹائے اندر آگیا۔

"کہاں رہ گئے تھے آپ۔ اتنی دیر کردی۔ میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔"

سلام کے بعد وہ عبداللہ کے لیے پانی لے کر آئی تو فوراً" پوچھ بیٹھی۔

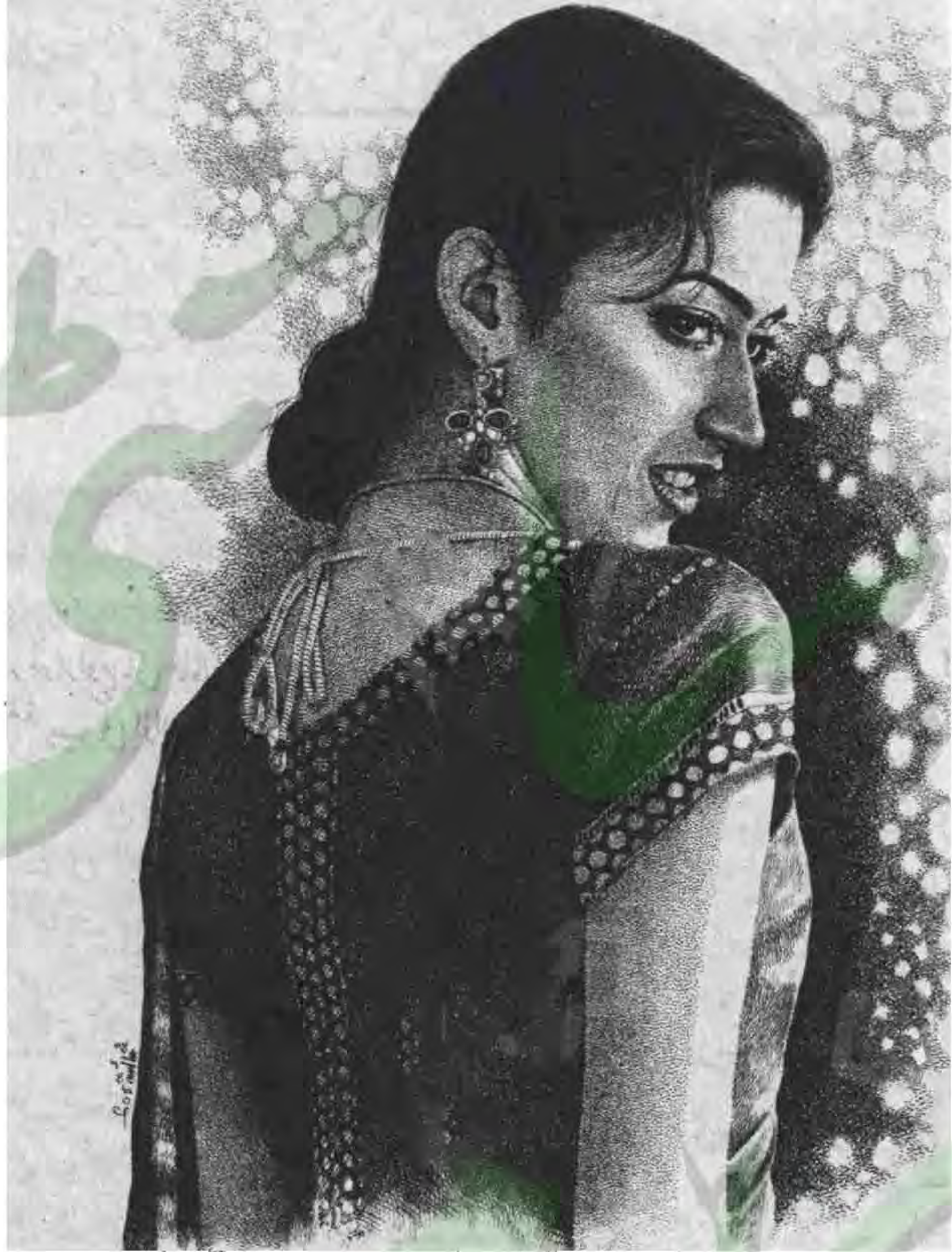
"ارے! تمہیں تو پتا ہی ہے دُکان کے ساتھ ہی بچوں کا اسکول ہے۔ بس آج کسی شرارتی نے ٹائر کی ہوا نکال دی۔ اس کی وجہ سے کافی خوار ہونا پڑا۔ ایک تو ویسے ہی آج نکلتے نکلتے دیر ہوگئی' اوپر سے سائیکل ٹھیک کروانے میں اتنا وقت لگ گیا۔" عبداللہ کے لہجے میں واضح تھکن تھی۔

"آپ کے پاس کچھ پیسے جمع ہوئے کیا؟"

"کیوں' تمہیں کچھ چاہیے؟"

"ہاں! وہ عثمان بھائی کے بیٹے کے لیے کپڑے بنانے تھے' اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اگر آپ کے پاس پیسے ہوں تو مجھے کل بازار لے چلیں۔ چھوٹے کے لیے کپڑے' جوتے اور کچھ ضروری چیزیں خرید لائیں گے۔ سب بہن بھائی کچھ نہ کچھ دے دلا کر فارغ ہوچکے ہیں' بس ایک میں ہی رہ گئی ہوں۔"

مریم نے جواب دیا۔ اس کے چھوٹے بھائی کی پچھلے سال ہی شادی ہوئی تھی اور اب اس کا بھتیجا دو ماہ کا ہوگیا تھا مگر وہ ابھی تک اس کے لیے کوئی تحفہ لے کر نہیں جاسکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت وہ کچھ پریشان سی تھی۔



"ٹھیک ہے' صبح لے چلوں گا۔"

عبداللہ نے رضامندی دی تو وہ پہلے خوش ہوئی اور پھر یکدم ہی بجھ گئی۔

"لیکن میں جاؤں گی کیسے۔ آپ کو پتا ہے اس حالت میں گاڑیاں بدل کر سفر کرنا میرے لیے کتنا مشکل ہے۔" اس کی بات پر عبداللہ سوچ میں پڑ گیا' پھر فوراً" بولا۔

"چلو یہ تو ایسا مسئلہ نہیں ہے' کل تھوڑی دیر کے لیے نوید سے اس کی موٹر سائیکل لے آؤں گا اور تمہیں بازار لے چلوں گا۔"

نوید اس کا جاننے والا تھا۔ جس کی کپڑے کی دکان اس کے جنرل اسٹور کے ساتھ تھی۔

"اب اٹھو اور کھانا لے کر آؤ۔ آج بھوک بہت لگی ہے۔"

عبداللہ نے بات کو سمیٹا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

"کچی دیواروں سے بھی تو کام چل ہی جاتا ہے بلکہ اچھا خاصا چل رہا ہے۔ کیوں نہ ان پیسوں کو عبداللہ کے حوالے کردوں کہ وہ اپنے لیے کوئی موٹر سائیکل خرید لیں۔ ہر روز کبھی سائیکل پر اور کبھی لوکل گاڑیوں پر سفر کرنا ان کے لیے بہت ہی تھکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔"

وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھی۔ غریب لوگوں کا یہ ہی تو مسئلہ ہوتا ہے۔ ہاتھ میں پیسہ نہ ہو تو بھی پریشانی

اور جو چار پیسے ہاتھ آجائیں تو اور بھی مشکل کہ ہزاروں مسائل ناگ کی طرح منہ کھولے ان پیسوں کو ہڑپ کر جانے کی کوشش میں ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کس ناگ کے منہ میں پیسہ ڈال کر اس کا منہ بند کریں اور باقیوں کو تسلی دے کر خاموش کروائیں۔
گہری سانس لے کر وہ ڈونگے میں سالن ڈالنے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ چار بہن بھائی تھے۔ ابو کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ بیوہ ماں نے کپڑے سلائی کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالا اور بڑی دونوں بیٹیوں کی شادیاں جلد ہی کردیں۔ مریم اور عثمان نے ٹیوشنز کر کے اپنی تعلیم مکمل کی۔ میٹرک کے بعد مریم کی بھی شادی ہو گئی۔
بچت کرنا اور کچھ پیسے پس انداز کرنے کا گر اسے عثمان نے ہی سکھایا تھا۔ وہ اکثر اسے سمجھاتا تھا کہ
"مریم! تم ایک عورت ہو، کل کو تم نے ماں بن کر بچوں کی تعلیم و تربیت بھی کرنی ہے اور ایک گھریلو خاتون ہونے کے ناتے تمہارا یہ ذمہ ہے کہ تم یہ طے کرو کہ کس طریقے سے زندگی گزارنی ہے۔ زندگی سبب اور نتیجے کے گرد گھومتی ہے، جیسا سبب ہو گا ویسا ہی نتیجہ بھی نکلے گا۔ اس لیے اچھی اور بہتر بات یہ ہے کہ زندگی گزارنے کے لیے اچھے اسباب پیدا کرو تاکہ اس کے بہترین نتائج نکلیں۔"
اور پھر اس نے یہی کیا۔ اس کے دونوں بچے ابھی چھوٹے تھے۔ عبداللہ سلجھا ہوا انسان تھا۔ بازار میں کریانے کی دکان تھی، بہت اچھی تو نہیں مگر پھر بھی اچھی چلتی تھی۔ سارا منافع وہ لا کر اسے تھماتا، جس میں سے وہ گھر کا بجٹ بھی چلاتی اور کچھ نہ کچھ بچا بھی لیتی۔ اسی وجہ سے آج اس کے پاس پچاس ہزار جمع ہو گئے تھے۔ آج کے مہنگائی کے دور میں یہ رقم معمولی تھی لیکن جن لوگوں نے آٹھ، دس ہزار میں پورا مہینہ چلانا ہو، ان کے لیے یہ کافی زیادہ رقم تھی۔

☼ ☼ ☼

"سکینہ بے چاری تو بہت پریشان ہے۔" زینت خالہ اس کے محلے میں ہی رہتی تھیں اور آج اس کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ اس نے چائے کی ٹرے لا کر رکھی جب انہوں نے یہ بات کی۔
"کیوں خالہ! خیریت، کیا ہوا انہیں؟"
"ارے بیٹا! خیریت کہاں، تم تو جانتی ہو، آج کل اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں بیٹیوں کے۔ سکینہ کی دو بیٹیوں کے رشتے تو پکے ہو گئے ہیں مگر اب ان کے سسرال والے جلدی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ بس یہی بات اس کے لیے فکر کا باعث بن گئی ہے کہ اتنی جلدی دونوں بیٹیوں کو کیسے رخصت کرے۔" خالہ نے تفصیل بتائی۔
"جی خالہ! سمجھتا وہی ہے، جس کے اپنے دل پر بھی گزری ہو۔ ہماری ماں نے بھی بیوگی کی چادر اوڑھے جس طرح ہمیں پالا پوسا، ہم ہی جانتے ہیں۔ کیسی کیسی مشکلیں راہوں میں آئیں، تنہا ہی ان سے نپٹنا ہوتا ہے۔ گاڑی کا دوسرا پہیہ الگ ہو جائے تو زندگی چلتی نہیں، گھسٹنا شروع ہو جاتی ہے۔" وہ ماضی کی یادوں میں کھو گئی۔

☼ ☼ ☼

اس نے عبداللہ کے ہاتھ میں پیسے تھمائے تو وہ حیرت سے اس کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پہ لکھی حیرت صاف پڑھی جارہی تھی جس سے اس نے بہت لطف لیا اور ہنسنے لگی۔ اپنے فیصلے نے اسے ویسے ہی مطمئن اور سرشار کیا ہوا تھا۔
"یہ اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟" جب کافی دیر تک اس کی ہنسی نہ تھمی تو اس نے پوچھ لیا۔
"بس دیکھ لیں، آپ کی بیوی کتنی سمجھ دار ہے۔ شکر ادا کریں خدا کا کہ اس نے آپ کو مجھ جیسی بیوی عطا کی اور آپ کو پتا ہے نیک بیویاں خدا کا تحفہ ہوتی ہیں۔"
"آپ اپنی تعریفیں کرنا بند کریں اور مجھے بتائیں یہ رقم کہاں سے آئی؟" اب کی بار عبداللہ نے سنجیدگی سے پوچھا تو جواب میں اس نے ساری کہانی سنادی۔
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ تو صرف بیس ہزار ہیں۔" عبداللہ کے لہجے میں یقینی حیرت تھی۔
"جی یہ تو میں نے آپ کو دیے ہیں کہ آپ اپنی دکان میں اور سامان ڈلوالیں تاکہ آمدنی اور بہتر ہو سکے اور باقی کے پیسے ہم خالہ سکینہ کو دے دیں گے تاکہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادی کر سکیں۔" وہ مزید بولی۔
"پیسہ تو آنی جانی چیز ہے، کسی کے پاس آج ہے، کل نہیں ہو گا۔
موٹر سائیکل آپ بعد میں بھی خرید سکتے ہیں دیواریں ہم بعد میں بھی اونچی کروالیں گے لیکن سکینہ خالہ پہ جو مشکل گھڑی آج آئی ہے، اس کا سدباب تو آج ہی کرنا ہو گا ورنہ کل کو وہ ایک ایسا پچھتاوا بن جائے گا، جو ہر صورت ڈستا رہے گا۔"
عبداللہ یک ٹک اپنی بیوی کو دیکھے جارہا تھا، وہ جانتا تھا کہ مریم ایک اچھی اور صاف ستھری سوچ کی حامل ہے مگر اس کے اوروں کے لیے خیالات اور احساسات اتنے پاکیزہ ہوں گے یہ آج سے پہلے ادراک نہ ہوا تھا۔
"اور ویسے بھی لوگوں کی مدد کرنا اللہ کو بہت پسند ہے اور ایسے لوگ جو بظاہر تو خوشحال نظر آتے ہیں لیکن اپنی عزت کی خاطر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ان کی مدد کرنے کا حکم تو اللہ نے ہمیں دیا ہے ناں۔"
اپنی بات مکمل کر کے وہ خاموش ہو گئی۔ وہ سمجھی شاید عبداللہ کو یہ سب پسند نہیں آیا۔ وہ اپنے ہونٹ چبانے لگی، جب عبداللہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔
"اپنی خواہشات کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی مدد کرنے والے اللہ کے پسندیدہ بندے ہوتے ہیں اور مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میری بیوی بھی ایسے ہی بندوں میں شامل ہے۔"
اس کے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر اس نے کہا تو مریم کے اردگرد ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں اور شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے جنت کے باغوں کی ٹھنڈی اور تازہ ہوائیں ہوتی ہیں۔

☼

نایاب جیلانی

ایک رات کی بات



"عشوہ بیٹی! ایک بات کہوں؟" بھابھی بیگم پالک کے پتے چننے میں اس کی مدد کررہی تھیں۔ وہ جو بڑی نفاست کے ساتھ باریک باریک پالک کاٹ رہی تھی، بھابھی بیگم کے لہجے کی سنجیدگی سے کچھ ٹھٹک کران کی طرف دیکھنے لگی

"کیسی بات؟"

"کچھ خاص نہیں، کیا پتا... میرا وہم ہو۔" صاف لگ رہا تھا۔ وہ بات ٹالنے کی کوشش کررہی ہیں۔ اب کے عشوہ سچ مچ ٹھٹکی۔

"بھابھی بیگم! بتایئے نا، یوں تو میں الجھتی رہوں گی۔" وہ چھری پرات میں رکھ کران کی طرف متوجہ ہوچکی تھی۔

"کام چھوڑ کر کیوں بیٹھ گئی ہو؟ ابھی بچیاں آجائیں گی، بھوک بھوک چلاتی ہوئی۔" انہوں نے چشمہ درست کرتے ہوئے چھری خود پکڑلی تھی۔ "عروسہ کب تک آتی ہے اسکول سے؟"

"اسکول کہاں، اب تو خیر سے کالج جاتی ہے۔" عشوہ نے مسکرا کر تصحیح کی تھی۔

مکمل ناول

"ہاں! وہ ہی... مواکالج... نجانے کون سا طلسم ہے، اس چار دیواری کے اندر، بچیوں کے رنگ ڈھنگ ہی بدلنے لگتے ہیں۔" ان کی اپنی پوتی نوری بھی عروسہ کی کلاس فیلو تھی۔ عشوہ نے یہی سمجھا تھا کہ وہ اپنی پوتی نوری کی بات کررہی ہیں۔

"خیر تو ہے؟" وہ خواہ مخواہ مسکرادی۔

"ہاں بنو! سب خیر ہے۔" وہ کلس کر بولیں۔

"بھابھی بیگم! صاف صاف کہیں نا... پہیلیاں میری سمجھ میں کہاں آتی ہیں۔"

"اسی سادگی سے مجھے اندیشے لاحق ہیں... بیٹی! جوان ہوتی بچی کی ماں ہو۔ ماشاء اللہ سے عمیمہ نویں جماعت کے پرچے دے گی اس دفعہ۔ آنکھیں کھلی رکھا کرو۔ اردگرد پر دھیان دیا کرو۔" ان کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

"کیا کروں بھابھی بیگم! تین بچیاں ہیں۔ ان کے سو طرح کے کام... اوپر سے میری بوجھل طبیعت۔ میں تو اب مزید چاہتی نہیں تھی، مگر اللہ کی رضا... پھر یہی سوچ لیا کہ کیا پتا، وہ رحیم رب مہربانی کردے۔ تین بیٹیاں ہیں۔ کیا پتا، اس دفعہ بیٹا ہوجائے۔ آپ سے بھلا کون سی بات چھپی ہے۔ عمر نے کیسا طوفان اٹھادیا تھا کہ مزید بچہ نہیں چاہیے۔ گھر میں اتنے دن بدمزگی رہی تھی۔" عشوہ نے بجھے بجھے لہجے میں بتایا۔

"تمہاری کون سا عمر بیت گئی ہے۔ ابھی سولہ کا سن بھی نہیں لگا تھا۔ جب دادی نے بیاہ دیا۔ یوں لگتا ہے، ابھی کل کی بات ہے۔ کالج کے دوسرے سال میں تو عمر تھا۔ ادھر عمر کے ماں باپ تو تھے نہیں۔ خالہ جنت مکانی عروسہ کی ماں کلثوم کو شوق چڑھا تھا عمر کو دولہا



بنانے کا۔ ابھی تک یاد ہے مجھے۔ عمر شادی کے لیے مانتا ہی نہیں تھا۔ گھر سے بھاگ جانے کی دھمکیاں تک دیں۔ مگر کلثوم نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ اس کے سر پر سہرا سجا کر ہی دم لیا۔ بھانجے کی "خوشی" دیکھنے کا شوق تھا۔ بیماری نے کلثوم کو چاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اب تو کلثوم کو گئے ہوئے بھی کئی برس بیت گئے۔ دیکھو! وقت بیتتے پتا ہی نہیں چلا۔" بھابھی بیگم نے تاسف سے آہ بھری۔ عشوہ خود بھی حیران حیران سی بیتے ماہ و سال کو سوچنے لگی۔

"اب' تم پالک چڑھالو۔ بچیاں بھی آتی ہوں گی۔ اپنا خیال رکھا کرو۔ چہرہ تو بالکل اُتر گیا ہے۔ ان شاء اللہ اس دفعہ بیٹا ہی ہوگا۔" فارغ بیٹھنا انہیں کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ "ٹوکری سے آلو لے آؤ' میں چھیل دیتی ہوں۔"

"جی۔۔۔" وہ آلو اٹھا کر لے آئی تھی۔ ساتھ ساتھ چائنیز رائس کے لیے بھی تیاری کر رہی تھی۔ عمر کو لنچ میں چاول کھانا پسند تھا۔ بچیاں بھی شوق سے کھا لیتی تھیں۔ وہ اپنے لیے آلو پالک بنا رہی تھی۔ جبکہ اور کسی کو سبزیوں سے خاص رغبت نہیں تھی۔ خصوصاً" عروسہ تو گوشت میں بھی سبزی دیکھ کر خوب ناک بھوں چڑھاتی تھی۔ اکثر جس روز وہ اپنی پسند کا مینو ترتیب دے لیتی تو عمر بچیوں کو اور عروسہ کو باہر کھانا کھلانے لے جاتا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی پسند کو اہمیت دینا ترک کر چکی تھی۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ عمر اور بچیاں گھر کے کھانے کو ترجیح دیں۔

"بھابھی بیگم! آپ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں؟" وہ پالک چڑھا کر آئی تو کچھ یاد آنے پر پھر سے پوچھنے لگی۔

"آں۔۔۔ ہاں۔" بھابھی بیگم آلو' چھیل کاٹ چکی تھیں۔ اب کچھ ٹٹولنے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح وہ کنفیوز ہوگئی۔

"عشوہ! یہ عروسہ بیٹی کچھ بدلی بدلی نہیں دکھنے لگی؟"

"کیا مطلب؟" عشوہ توقع کے عین مطابق پریشان ہوگئی۔

"بیٹی! برا مت ماننا۔ بچی پر دھیان رکھو' یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ عمر کی خالہ زاد ہے۔ تم اس کی بھابھی ہو۔ ماں جیسا پیار بھی تم ہی نے اسے دیا ہے۔ یہ بننے اور بگڑنے کی عمر ہوتی ہے۔ کچی پکی سی عمر۔ ہر چمکتی چیز جی کو بھاتی ہے۔" انہوں نے عام سے لہجے میں بہت خاص بات کی تھی۔

"جی۔۔۔" وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"تمہارے بھائی کی کوئی خیر خبر آئی؟" بھابھی بیگم کو کچھ خیال آیا تو پوچھنے لگیں۔

"فون تو تقریباً" پندرہ بیس دن میں کئی مرتبہ کرتا ہے۔" عشوہ کی آواز بھرا سی گئی۔ فائق اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ اے لیول کے بعد باہر گیا تو پھر پلٹنے کو دل ہی نہ چاہا۔ اس کے چلے جانے کے بعد پہلے جان چھڑکنے والی دادی چل بسیں۔ بابا بھی نہ رہے۔ اب میکے کے نام پر صرف ایک بھائی کا آسرا تھا اور وہ بھی پردیس میں نجانے کون کون سی ڈگریاں اکٹھی کر رہا تھا۔ نجانے یہ جنون' یہ شوق' یہ علم حاصل کرنے کی پیاس' یہ کتابوں سے عشق اس نے خاندان میں سے کس "علم دان" سے چرایا تھا۔ عشوہ کے بابا اور امی تو واجبی سے تعلیم یافتہ تھے۔ خود عشوہ کی اس وقت شادی کردی گئی تھی' جب نویں جماعت کی نئی نکور کتابوں اور بیگ کو دیکھنے اور برتنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔

بابا اور دادی کو جانے کی جلدی تھی۔ شاید اسی لیے عشوہ کو گھر بار کا کر گئے۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ بابا اور دادی کا یہ فیصلہ اس کے حق میں بہتر ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ ننھیال اور ددھیال میں اس کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

"عشوہ بیٹی! کہاں گم ہوگئیں؟" بھابھی بیگم نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔ وہ سوچوں کے بھنور سے باہر آئی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ آپ بتائیے' نوری کے رشتے کا کیا بنا؟"

"میرا بس چلے تو شام سے پہلے اسے نمٹا دوں' مگر نوری کی ماں کو اسے پڑھانے کا "چاہ" چڑھا ہے۔" بھابھی بیگم کے بھی اس کی دادی جیسے خیالات تھے۔ انہیں بھی اس کی شادی کی بہت جلدی تھی۔ آئے دن رشتے کروانے والیوں کی مٹھی گرم کیے رکھتی تھیں۔

"تم بھی عروسہ کے سلسلے میں ہاتھ پاؤں ہلاؤ۔ جتنی جلدی ہوسکے' فرض ادا کردو' یہی بہتر ہے۔" ان کا انداز ناصحانہ تھا' بہت کچھ جتاتا ہوا مگر عشوہ کی سادگی۔

"میں اکیلی تو کچھ نہیں کرسکتی۔ عمر کو بھی تو دیکھنا چاہیے۔ اپنے دفتر میں' دوستوں میں۔۔۔ حلقہ احباب میں۔" عشوہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم عمر سے بات کرو۔ ابھی سے کوشش کروگی تو بات کہیں بنے گی۔" انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔ "رنگ روپ بھی کیا غضب کا ہے۔"

"ماشاء اللہ سے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اسی پل عمیمہ اسکول سے آگئی تھی۔ عموریہ اور ایمن اس کے پیچھے تھیں۔ صبح تو عمر ہی ان چاروں کو اسکول' کالج ڈراپ کرتا تھا۔ آج کل بچیوں کے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ سو وہ تینوں ہی گیارہ بجے وین پر آجاتی تھیں۔ عروسہ تقریباً" تین بجے عمر کے ساتھ واپسی آتی تھی۔ عمر عموماً" بچیوں کو وین پر آنے جانے نہیں دیتا تھا۔ پک اینڈ ڈراپ اسی کی ذمہ داری تھی مگر جب بچیوں کے ماہانہ ٹیسٹ شروع ہوجاتے تو پھر روٹین ڈسٹرب ہوجاتی تھی۔

"خیر سے پڑھ آئی ہو؟" بھابھی بیگم نے عمیمہ کے سلام کا جواب دے کر محبت سے پوچھا۔

"جی دادی بیگم!" وہ ان کے قریب اچک کر تخت پر بیٹھ گئی اور اپنے جوگرز اتارنے لگی۔

"ماشاء اللہ سے عمیمہ بھی عروسہ کے برابر دکھنے لگی ہے۔ رنگ روپ اور اٹھان اچھی ہے۔ عشوہ! یہ تو تمہاری دوسری تصویر ہے۔" بھابھی بیگم کو خوبصورتی بہت بھاتی تھی۔ کچن میں مصروف عشوہ مسکرادی۔ عمیمہ منہ ہاتھ دھو کر یونیفارم بدلنے کے بعد چھوٹی بہنوں کے کپڑے تبدیل کروا کر اس کے پاس کچن میں آئی تھی۔

"ماما! کچھ ہیلپ کروا دوں؟" وہ بڑی ہمدردی سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں میری جان! میں کرلیتی ہوں۔" عشوہ کو اپنی بیٹی کے خیال رکھنے کے انداز بہت پسند تھے۔ وہ عادتوں اور مزاج میں اپنی ماں جیسی تھی۔ حساس' نرم دل۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے' "بیٹیاں ماؤں کا پرتو ہوتی ہیں۔"

صبح کا آغاز جس افراتفری کے عالم میں ہوتا تھا۔ تنہا عشوہ بوکھلا کر رہ جاتی تھی۔ اوپر سے طبیعت بھی بوجھل۔ عروسہ تو خود نجانے کیسے تیار ہو کر ناشتے کی میز تک آتی تھی۔ کچن میں مدد کا تو سوال ہی ناممکن تھا۔ چھوٹی دونوں کو بہلا پھسلا کر اٹھانا بھی جان جوکھوں کا کام تھا۔ اور اب تو یہ ذمہ داری خود بخود عمیمہ نے اٹھالی تھی۔ ایمن اور عموریہ کو برش کرانا' منہ ہاتھ دھلوانا' یونیفارم الماری سے نکال کر دینا' بال بنانا اور اس کے بعد وہ کچن میں ماں کے عین پشت کے پیچھے آکھڑی ہوتی تھی۔

"ماما! کچھ ہیلپ کروا دوں؟"

"ہاں' میری جان! پاپا کے لیے آملیٹ پلیٹ میں نکال کر لے جاؤ۔ بہنوں کے لیے دودھ بھی گلاس میں ڈال کر مائیکرو ویو میں رکھو۔" اس پل عشوہ کو اپنی بیٹی پر ٹوٹ کے پیار آجاتا تھا۔

"ماما! سلاد کے لیے سبزیاں میں کاٹتی ہوں۔" اسے سوچوں میں گم دیکھ کر عمیمہ نے چھری اس کے ہاتھ سے پکڑلی۔

"ایسی ہوتی ہیں بیٹیاں!" بھابھی بیگم کچن میں نجانے کب آکھڑی ہوئیں۔ "بن کہے ہر درد' ہر تکلیف کو جان لینے والی بیٹیاں' احساس اور خیال کرنے والی' اللہ آنگن میں چہکتی ان تتلیوں کے بخت

بھی بلند کرے۔" انہوں نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے تھے۔ وہ گھر جانے کے لیے کھڑی تھیں۔

"دادی بیگم! کھانا کھا کر جائیے گا۔" عمیمہ نفاست سے کھیرا کاٹتے ہوئے بولی۔

"دادی صدقے جائے۔ اب چلتی ہوں بیٹا! کس وقت کی تیری ماں کے پاس آئی بیٹھی ہوں۔ اب دیکھو! گھڑی تین بجانے والی ہے۔" بھابھی بیگم نہال ہو کر بولیں۔

"آپ کی وجہ سے ہی تو میری ماما کا دل لگا رہتا ہے۔ آخر پندرہ سالوں کا ساتھ ہے۔" عمیمہ نے سمجھ داری سے کہا۔ ادھر عشوہ حیران ہی تو رہ گئی یعنی اس کی بیٹی اس حد تک ماں کو جانتی تھی۔ اسے خبر تھی کہ بھابھی بیگم سے ملاقات اور بات چیت عشوہ کو ہلکا پھلکا کر دیتی ہے۔ وہ ذرا سا بھی پریشان ہوتی تو بچیاں دوڑی دوڑی بھابھی بیگم کو بلا لاتی تھیں۔

"یہ آلو پالک تو لیتی جائیے۔" عشوہ نے جلدی جلدی تھمن کا دودھیا پیڑہ شیشے کے پیالے میں رکھا اور گرم گرم سالن سے پیڑے کو چھپا دیا۔

"ہاں! نوری کے لیے دے دو۔ ابھی برتن اٹھا کے' خوشبو سونگھتی آدھمکے گی۔" وہ پوتی کی مانگنے تانگنے کی عادت سے سخت عاجز تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے پیالا انہیں پکڑایا۔ ان کے چلے جانے کے بعد عمیمہ برتن میز پر لگا رہی تھی جب عمر اور عروسہ بھی آ گئے۔

"جلدی کرو' مجھے واپس بھی جانا ہے۔" عمر نے ہمیشہ کی طرح آتے ساتھ ہی جلدی جلدی کا شور مچا کر اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔

"ابھی لائی۔" وہ پھلکے اتار رہی تھی۔

"کیا کرتی ہو' پورا دن۔۔۔ ابھی تک کھانا بھی نہیں بنایا۔" عمر کا پارہ ہمیشہ چڑھا رہتا تھا۔

"بھابھی بیگم سے نشست رہی ہو گی۔" عروسہ نے شرارتاً عشوہ کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ رہی تھی۔

"وہ تو بال بچوں سے فارغ ہو چکی ہیں۔ تم ہی کچھ خیال کر لیا کرو۔" عمر کو تو غصہ کرنے کے لیے بہانہ چاہیے ہوتا تھا۔ عشوہ پھلکے اتار کر باہر آئی تو عمیمہ ڈش میں چاول' رائتہ اور سلاد وغیرہ میز پر رکھ رہی تھی۔

"کون؟" عشوہ کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔

"بھابھی بیگم اور کون۔" وہ طنزیہ بولا۔

"یہ روٹی لیں آپ۔" عشوہ نے تین گرم گرم پھلکے اس کے سامنے رکھے۔

"روٹی چاول کے ساتھ کھانی ہے؟ سالن کہاں ہے؟" عمر کے طنز عشوہ کو پانی پانی کر دیتے تھے۔

"پاپا! آلو' پالک ہیں۔ لے آؤں؟" عمیمہ اسی طرح عشوہ کے سامنے ڈھال بن جاتی تھی۔

"لے آؤ۔۔۔" وہ چائنیز رائس کی طرف متوجہ تھا۔ مگر روٹی بھی اسے ضرور چاہیے ہوتی تھی۔

"فروٹ سیلڈ نہیں بنایا؟" عروسہ نے بھی منہ بنا لیا۔

"سیلڈ تو ہے نا۔" عمیمہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"پر فروٹ سیلڈ نہیں ہے نا۔" وہ مزے سے رائس کھا رہی تھی۔

"عروسہ! ہماری چاکلیٹس؟" عموریہ اور ایمن نے ٹھنک کر کہا۔ صبح شاید عروسہ نے انہیں چاکلیٹس کا لالچ دے کر اپنے جوتے صاف کروائے تھے۔ وہ اسی طرح بچیوں کو مختلف لالچ دے کر کام نکلوا لیتی تھی۔

"سوری سویٹیز! مجھے یاد نہیں رہا تھا۔" اس نے ہمیشہ کی طرح عذر تراشا۔

"عروسہ! آپ ہمیشہ چیٹ کرتی ہیں۔ ہم آپ سے نہیں بولیں گے۔ کٹی ہے ہماری طرف سے۔" عموریہ اور ایمن کے پھولے پھولے سرخ گال تپ اٹھے۔ آنکھوں میں معصومانہ سا اشتیاق ماند پڑ گیا۔

"او کے۔" عروسہ نے ہتھیار پھینک دیے۔ "عمر بھائی! شام کو واپسی پر کٹ کیٹ کے پیکٹس لے آئیے گا۔"

"آپ نے کہا تھا۔ اپنی پاکٹ منی سے لائیں گی۔" ایمن نے آنکھیں مٹکا کر عروسہ کو یاد دلانا چاہا۔

"اف۔۔۔ کتنی تیز ہو تم دونوں۔" عروسہ قل قل ہنسنے لگی۔

"آپ کی طرح۔" عموریہ برجستہ بولی تھی۔ عمر کو یہ برجستگی قطعاً" نہیں بھائی تھی۔ اس کے ماتھے پر ایک ناگوار سلوٹ ابھر آئی۔

"بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔۔۔ ایٹی کیٹس اور مینرز تمہیں چھو کر نہیں گزرے۔ کتنی مرتبہ سمجھایا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے چونچیں بند رکھا کرو۔" عمر نے بچیوں کو بری طرح سے ڈپٹا تھا اور وہ دونوں بسورتے ہوئے اپنی اپنی پلیٹ پر جھک گئیں۔

"کیا تربیت کر رہی ہو تم ان کی۔۔۔؟" عمر کی توپوں کا رخ اب عشوہ کی طرف تھا۔

"عمر! بچیاں ہیں۔" وہ منمنا کر رہ گئی۔

"یہ بچیاں کل کو بڑی ہوں گی۔۔۔ عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں۔۔۔ سمجھایا کرو انہیں۔۔۔ یہ فرض تمہارا ہے۔" وہ کھانا کھا چکا تھا۔ نیپکن سے ہاتھ پونچھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "اپنے جیسا گنوار ہی بنانا۔۔۔ یہی امید ہے مجھے تم سے۔"

"عمر۔۔۔!" عشوہ کے حلق میں نوالہ پھنس کر رہ گیا۔ وہ پھر سے آفس چلا گیا تھا۔ بچیاں باپ کی ڈانٹ کو اس کے جاتے ہی بھلا کر کھیل کود میں مصروف ہو گئی تھیں۔ عروسہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی جبکہ عشوہ ہاتھ میں پکڑا نوالہ لیے گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔ بڑے شوق سے تیار کیا گیا آلو پالک کا سالن جوں کا توں میز پر رکھا تھا۔ اس کی بھوک مر گئی تھی۔

اور یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ ان پندرہ سالوں میں اسے اب تک عادی تو ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ اس حساس دل کا کیا کرتی جو ہر گھاؤ پر نئے سرے سے تڑپ اٹھتا تھا۔ عمر کے سرد رویے کو سوچتے سوچتے وہ کچھ سال پہلے چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

عشوہ کا تعلق متوسط طبقے کے ایسے گھرانے سے تھا جن کا کنبہ قدرت کی طرف سے بہت مختصر رہا تھا۔ مہنگائی کے اس دور میں دادی کو اپنے بیٹے کے وسائل سے نہ صرف آگاہی تھی بلکہ وہ اخراجات کی اس جنگ میں بیٹے کا ساتھ بھی بھرپور دیتی تھیں۔

دادی بہت محنتی خاتون تھیں۔ جلد سازی کا کام بہت مہارت سے کرتی تھیں۔ بہت سلیقہ مند اور کفایت شعار خاتون تھیں۔

امی اور بابا کی ایک ہی خواہش تھی اپنا گھر بنانے کی' جو کبھی نہ پوری ہوئی۔ امی فائق کی پیدائش پر کچھ پیچیدگی ہو جانے پر وفات پا گئی تھیں۔

یوں عشوہ اور فائق' دادی کی مہربان گود میں سما گئے تھے۔ دادی کی تربیت نے عشوہ کو حد درجہ' صابر' قانع اور سنجیدہ مزاج کر دیا تھا۔ جس عمر میں لڑکیاں جگنوؤں اور تتلیوں کے پیچھے بھاگتی تھیں' وہ اس عمر میں فائق کے لیے ہلکان رہتی۔ دادی اسے بھگائے رکھتیں۔

"فائق گلی میں نکل گیا ہے۔ اسے پکڑ کر لاؤ۔"

یا پھر۔

"فائق کے کپڑے سرف میں بھگوئے ہیں۔ انہیں دھو دو۔" وہ بوڑھی دادی کی ناتوانی محسوس کر کے خاصی ذمہ دار ہو گئی تھی۔ فائق کو نہلاتی۔ کپڑے پہناتی۔ اس کے لیے آلو کے چپس بناتی۔ چھوٹے چھوٹے کام کرتے وہ بہت طاق ہوتی چلی گئی تھی۔ دادی آلو کی بھجیا بنانے کا طریقہ بتاتیں اور وہ مشاقی سے مسالے ملاتی۔ دادی تخت پر بیٹھے ہوئے آواز لگا کر بتاتی جاتیں۔

"آدھا چمچہ نمک' ایک چمچہ مرچ' آدھی چٹکی زیرہ اور مٹھی بھر کٹا ہوا ہرا دھنیا ڈال کر ذرا دیر کو ڈھک دو۔"

روٹی پکانے کی باری آئی تو دادی نے چولہے کے پاس کھڑا کر دیا۔ "یوں پیڑہ بناؤ۔ اب بیلن سے بیلتی جاؤ۔ ذرا دبا کر بیلو۔ اب احتیاط سے اٹھاؤ اور توے پر ڈالو۔"

آٹھویں تک وہ گھر کے سارے کاموں میں طاق ہو گئی۔ دادی سینا پرونا بھی سکھا دیا۔ گھر سنبھالنے کا سارا سلیقہ خود بخود آتا چلا گیا۔

ابھی نویں کی کتابیں بابا لائے ہی تھے کہ دادی نے جھٹ پٹ اس کا رشتہ طے کر دیا۔ اس نے سنا تو گم صم ہی رہ گئی۔ بابا بھی اس رشتے کے حامی تھے۔

دادی نے بالا ہی بالا تمام کام نمٹا لیے۔ پیٹیاں اور صندوق کھلنے لگے۔ نجانے کب کب کی خریدی گئی چیزیں برآمد ہوئیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی چیز۔ فرنیچر' کراکری اور الیکٹرونکس کا سامان۔

دادی کی کفایت شعاری کام آئی تھی۔ کمیٹی کی محفوظ رقم سے شادی کے سارے اخراجات با آسانی پورے ہوئے۔

آس پڑوس کی خواتین نے دادی سے دبی زبان میں کہا بھی۔ "ابھی عشوہ کی گڑیاں کھیلنے کی عمر ہے۔ دو چار سال اور ٹھہر جائیں۔"

"آپ نے صحیح کہا۔" دادی نے بڑے ہی تلے انداز میں جواب دیا تھا۔ "آج میں ہوں۔ کل آنکھیں بند کر جاؤں گی۔ زندگی کا بھلا بھروسا ہی کیا ہے۔ گود میں کھیلتے بچوں کو ان کی ماں چھوڑ گئی۔ یہ تو میں تھی۔ ان بچوں کو سمیٹ لیا۔ اگر میرا دم بھی نہ رہا تو یہ پھول سے بچے کہاں جائیں گے۔ رسول اللہ کا بھی یہی حکم ہے۔ بیٹیوں کو جلد از جلد گھر بار کا کر دو۔ میں نے عشوہ کا بھلا سوچا ہے۔"

اور یہ سچ ہی تھا۔ دادی کی دور اندیشی نے ثابت کر دیا تھا کہ اس وقت کا یہ فیصلہ کتنا بہترین رہا۔

کلیاں توڑنے اور جگنو پکڑنے والی کچی سی عمر تھی۔ اس کی آنکھیں حیرانی سے چمکتی دمکتی چیزوں کو دیکھا کرتیں۔۔۔ گلابی' دودھ جیسے گالوں پر زری کے کام والے جھلمل کرتے کپڑوں اور زیورات کو دیکھ کر شفق اتر آتی۔ شنگرفی ہونٹ آپوں آپ مسکرا اٹھتے۔

ایک روز دادی اسے بازار لے گئیں۔ دوپٹے رنگوائے' جوتے خریدے۔ پھر محمد بوٹا کے گھر لے گئیں۔ دادی کا دور پرے کا بھانجا تھا۔ ان کی بیوی بھابھی بیگم نے چٹاخ چٹاخ عشوہ کے رخساروں کو چوما۔

"خالہ جی! آپ کی پوتی تو رج رج کے سوہنی ہے۔ تب ہی میں کہوں' کلثوم نے آپ کی چوکھٹ کیوں پکڑ لی ہے۔"

بھابھی بیگم کی تعریف نے عشوہ کو بری طرح سے شرما دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جب دادی نے بھابھی بیگم کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ واپس آئیں تو ہاتھ میں ننھی سی سوئی تھام رکھی تھی۔

دادی نے بسم اللہ کے بعد کچھ اور پڑھ کر سوئی پر پھونکا' پھر دوبارہ بھابھی بیگم کے ہاتھ میں سوئی تھما دی۔

"لو حلیمہ! اب ناک میں چھید کرو۔"

"ہائے' نہیں۔۔۔" عشوہ دہل کر رہ گئی۔ "دادی اماں! مجھے درد ہوگا۔ میں ناک میں چھید نہیں کرواؤں گی۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

"نہ میری بچی! درد کاہے کا۔ حلیمہ کے ہاتھ میں تو جادو ہے۔ ایک لمحہ بھی نہیں لگے گا۔ فٹافٹ سوئی اندر چلی جائے گی۔" دادی نے عشوہ کو خوب ہی پچکارا۔

"نتھ کے بغیر دولہن سجتی کہاں ہے۔" بھابھی بیگم اس کے قریب بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے پیار سے عشوہ کی ناک پر انگلی رکھی۔ "لونگ تو خوب سجے گی۔ ننھی سی ناک پر' اوپر کو اٹھی ہوئی۔"

"بھابھی بیگم!" عشوہ نے خوف زدہ ہو کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"میں تو ناک دیکھ رہی ہوں۔" بھابھی بیگم نے اسے تسلی دی تھی اور پھر اسی پل سوئی مطلوبہ نشان سے ایک جھٹکے میں اندر چلی گئی تھی۔ عشوہ کو ہلکی سی چبھن کے علاوہ قطعاً" درد نہیں ہوا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اس کی ناک میں بغیر تکلیف کے سوراخ ہو گیا ہے اور اس بات پر بہت خوش تھی کہ اب وہ چھوٹی سی نتھ پہن سکتی ہے' جو مخملی ڈبیا میں بند پڑی تھی۔

محمد بوٹا' دادی کے بھانجے ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیوی گھر کی پہلی بہو ہی نہیں اس محلے کی بھی پہلی بہو تھیں۔ چار دیوروں اور چار نندوں کی بھابھی کے علاوہ اہل محلہ کی بھی "بھابھی" بن گئیں۔ یہ لقب اتنا مشہور ہوا کہ لوگ بھابھی بیگم کا اصل نام ہی بھول گئے تھے۔

بچے تو بچے بڑے تک "بھابھی بیگم" کے نام سے ہی پکارنے لگے۔ اکثر تو شوہر کے منہ سے بھی بھابھی بیگم ہی پھسل جاتا تھا۔ جس پر وہ خود کو لعن طعن کرتے۔

بھابھی بیگم فطرتاً" بہت سادہ مزاج ہر ایک کے دکھ درد کو دل سے محسوس کرنے والی خاتون تھیں۔ ساس کے مرنے کے بعد سب دیوروں اور نندوں کو پڑھایا لکھایا تھا۔ شادیاں بھی کیں۔۔۔ اس دوران اپنے بچے بھی شادی کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ پچھلے سال دادی' بھابھی بیگم کے دوسرے بیٹے کی شادی میں شریک ہوئی تھیں۔ عشوہ بخار کی وجہ سے جا نہیں سکی تھی۔ ویسے بھی وہ کم کم ہی گھر سے نکلتی تھی۔ اس طرح بھابھی بیگم سے عشوہ کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ عشوہ کو یہ میدے سے گندھی خاتون' بہت پسند آئیں۔

دادی نے اسے بتایا تھا۔ "یہ تمہاری پڑوسن ہوں گی۔"

"جی۔۔۔" عشوہ کے خاک بھی پلے نہیں پڑا تھا۔

"ادھر دیکھو!" رکشے میں بیٹھنے سے پہلے دادی نے بھابھی بیگم کے برابر بنے دو منزلہ کوٹھی نما مکان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ عمر کا گھر ہے۔۔۔ یعنی تمہارا گھر۔"

"دادی اماں!" عشوہ کے دل میں خوب ساری گدگدی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں پھیلنے لگے۔ مگر وہ "سی" کی آواز کے ساتھ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئی۔

"چپکی رہو۔ بولو گی تو درد ہوگا۔ ہنسو گی تو اور بھی درد ہوگا۔" دادی نے تنبیہہ کی تھی۔ گھر آئے تو فائق نے بتایا۔

"دادی اماں! مہمان آئے ہیں۔" وہ گلی میں کھیل رہا تھا۔ کپڑے اور ہاتھ مٹی میں لتھڑے تھے۔ عشوہ ناک میں اٹھنے والی ٹیسیں بھلا کے فائق کو زبردستی گھسیٹ کر گھر لائی تھی۔ دادی تو مہمانوں کا سنتے ہی اندر چلی گئی تھیں۔

"کون آیا ہے؟" وہ فائق کا منہ اور ہاتھ دھلاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تمہاری ساس ہیں اور ان کی گود میں بھاں بھاں کرتی بچی۔" فائق نے منہ بنا کر بتایا۔ اسے روتے دھوتے بچے پسند نہیں تھے۔

"خالہ جی آئی ہیں۔" کلثوم عمر کی سگی خالہ اور چچی بھی تھیں۔ عروسہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور ان کی شادی کے تقریباً" چودہ برس بعد ہوئی تھی، مگر بدقسمتی سے باپ کی شفقت سے محروم رہی تھی۔ عمر کے چچا عروسہ کی پیدائش سے دو ماہ پہلے وفات پا گئے تھے۔ خود عمر بھی والدین کے معاملے میں بدقسمت رہا تھا۔ اسے کلثوم چچی نے ہی پالا پوسا تھا اور اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر شفقت اور محبت دی تھی۔

اس نے جلدی جلدی فائق کو کپڑے پہنا کر بال بھی بنا دیے تھے۔ جب وہ چائے بنا رہی تھی تب کلثوم باورچی خانے میں اس سے ملنے چلی آئیں۔

"ارے! ناک چھیدوائی ہے۔" انہوں نے اس کی سوجی سوجی بے حد سرخ ناک کو بغور دیکھا۔ "میری بیٹی کو درد تو بہت ہوا ہوگا۔" ان کے لہجے میں واضح تفکر تھا۔

"جی خالہ جی! بہت درد ہوا... مگر ناک میں سوراخ بھی ضروری تھا نتھ کے لیے۔" اس کی معصومیت پر کلثوم نہال ہو کر رہ گئیں۔

"اندر تو آؤ... تمہیں شادی کا جوڑا دکھاؤں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر وسطی کمرے میں لے آئیں۔ پلنگ پر ڈھیر سارے شاپر اور ڈبے رکھے تھے۔ خالہ جی نے ایک بڑا سا ڈبا کھول کر اس کے سامنے کیا۔ عشوہ کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے خیرہ ہو گئیں۔ اتنے خوبصورت کام والا مہنگا... بہت ہی نفیس اور منفرد... کپڑا اتنا ملائم اور ہلکا تھا گویا ریشم... دوپٹے پر جھلملاتا کام... عشوہ کا دل بری طرح سے دھک دھک کرنے لگا۔

"یہ میں پہنوں گی۔" اس کے دل نے گویا سرگوشی کی۔

"یہ دیکھو..." کلثوم ایک ایک ڈبا اسے کھول کر دکھاتی چلی گئیں۔ "میں نے سوچا تھا کہ عشوہ کو ساتھ لے جاؤں گی مگر پھر یہ بات کچھ مناسب نہیں لگی۔" وہ دادی کو بتا رہی تھیں اور دادی کا اثبات میں ہلتا سر کلثوم کی سوچ کی تصدیق کر رہا تھا۔

"اب چلتی ہوں... عمر گھر آگیا ہوگا۔ بھوک بھوک چلانے لگتا ہے۔ بہت غصہ بھرا ہے اس لڑکے میں۔" کلثوم اب سامان سمیٹ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے عشوہ سے کہا۔ "یہ ڈبے اٹھا کر رکھ لو بیٹی!"

"عمر سے کہا تھا۔ حاجی صاحب سے کوارٹرز کا کرایہ پکڑ لائے۔ نجانے گیا بھی ہے یا نہیں۔" وہ گویا خود کلامی کر رہی تھیں۔ جوہر کالونی میں چھ کوارٹرز پر مشتمل بلڈنگ عمر کے والد نے اچھے وقتوں میں تعمیر کروائی تھی جس کا ماہانہ کرایہ اتنا زیادہ تھا کہ کلثوم کو اخراجات پورے کرنے میں کبھی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

"بہت شوق تھا عمر کی شادی کرنے کا مجھے... حالانکہ سب ہی نے عمر کی شادی کا سن کر حتی المقدور مشوروں سے نوازا تھا کہ عمر ابھی ناسمجھ ہے۔ شادی کی عمر کہاں ہے۔ ذمہ داریاں کیسے اٹھائے گا اور بھی نجانے کیا کیا۔ مگر میں نے کسی کی بات پر کان نہیں دھرے۔" وہ دادی کو دھیمی آواز میں بتا رہی تھیں۔

"کلثوم! عمر کا بھی سنا تھا کہ شادی کے لیے مان نہیں رہا۔" دادی کی آواز کلثوم کی آواز سے بھی دھیمی تھی۔ عشوہ کے اسٹور کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔

"خالہ جی! آپ فکر مت کریں... صرف اسی بات پر ضد کر رہا تھا کہ اس کی تعلیم نامکمل ہے۔ کیریر بنانا ہے۔ بہت سا پڑھنا ہے۔ اس کے علاوہ تو کوئی اعتراض نہیں اسے۔" کلثوم نے دادی کی فکر اور پریشانی کو کم کرنا چاہا۔

"آپ جی کو غم بالکل نہ لگائیں۔ ایسی موہنی صورت ہے عشوہ کی۔ دیکھ کر سارا غصہ وصہ بھول جائے گا۔" کلثوم نے نرمی سے دادی کے دونوں ہاتھ دبائے۔ دادی کے خدشات شاید کم ہو گئے تھے تاہم عشوہ کے دل میں پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔

"ہائے! انہیں تو بہت غصہ آتا ہے۔ مجھے ڈانٹیں گے۔" وہ تکیے کے نیچے رکھی عمر کی تصویر کو پھر سے بغور دیکھنے لگی تھی۔ یہ تصویر کلثوم اسے دے کر گئی تھیں۔

"تصویر میں تو بہت اکھڑ اکھڑ سے لگتے ہیں۔" اس نے خوف زدہ ہو کر سوچا۔ یہ تصویر ایک لاابالی سے کالج بوائے کی تصویر تھی تاہم تصویر کے برعکس وہ خاصا ذمہ دار بھی تھا۔ چھوٹی عمر سے سنجیدگی اور تنہائی ساتھی بن گئی تھی۔ ہاں! وہ بے حد غصیلا تھا۔ اس کو بہت غصہ آتا تھا اور یہ اس کی شخصیت میں واضح کمی تھی۔ شاید والدین، بہن بھائی نہ ہونے کی وجہ سے یا پھر کلثوم اس کی ہر جائز ناجائز مان لیا کرتی تھیں، اسی وجہ سے وہ بے حد ضدی ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ خود پسند بھی۔ اپنی "میں" سے نکلنا اسے گوارا نہیں تھا۔ اور اسی "میں" نے اسے ہمیشہ عشوہ سے ایک فاصلے پر رکھا تھا۔ اول روز سے قائم اس فاصلے کو پندرہ سالوں کی رفاقت بھی پاٹ نہیں سکی تھی۔

حالانکہ شادی کے روز پہلی مرتبہ اسے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ سرخ عروسی لباس میں سجی سنوری سی عشوہ نے دھڑکنوں میں تلاطم مچا رکھا تھا۔ تیکھے نقوش رکھنے والے قدرے اکھڑ اکھڑ سے عمر فاروق کے چپکے چپکے سے عشق میں مبتلا عشوہ کو اسے روبرو دیکھنے کا تجربہ خاصا مشکل ترین لگ رہا تھا۔

"بچی سے نرمی سے بات کرنا اور یہ پکڑو۔" انہوں نے ایک درمیانے سائز کی مخملی ڈبیا زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

"یہ کیا ہے؟" عمر نے برا سا منہ بنا کر پوچھا۔

"عشوہ کے لیے چین ہے۔" چچی امی نے دلار سے کہا۔

"تو خود ہی مہارانی صاحبہ کو دے دیجیے گا۔" اس نے صاف جھنڈی دکھائی۔

"بگلے! دلہن کو یہ تحفہ تم ہی کو دینا ہے۔" چچی امی کو ایسے نازک وقت میں جی بھر کے ہنسی آگئی۔

"میں کیوں دوں... خواہ مخواہ سر چڑھ جائے گی۔" دوستوں کی پڑھائی پٹیاں بھی یاد آگئی تھیں اور وہ ان کی جلن اور حسد کو سمجھے بغیر سب کچھ ذہن نشین کر کے آیا تھا۔ خصوصاً" اس کا قریبی دوست اور کلاس فیلو دانش تو جل بھن کر کباب ہو گیا تھا۔

"تمہاری ماؤں کو تو ہمارا احساس تک نہیں... ورنہ ہم بھی ایک عدد بیوی کے شوہر ہوتے۔ تم خوش نصیب ہو... کل کو تمہارے جتنے ہی تمہارے بیٹے ہوں گے۔ بڑے بھائی لگو گے ان کے... میرے پھوپھی زاد بھائی خالد کی طرح..." وہ سیخ کباب بنا جا رہا تھا۔ پہلی مرتبہ عمر بھی کچھ اترایا، وہ جو سمجھ رہا تھا کہ اس کے دوست خوب ہی اس کا مذاق اڑائیں گے، ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ الٹا وہ حسد و رشک سے مغلوب ہو کر رہ گئے تھے۔ عمر کو اپنی یہ اہمیت خاصی بھائی تھی۔ اس کی انا اور "میں" کی بھی بہت تسکین ہوئی۔

"دیکھو! بیوی کے غلام مت بن جانا۔" دانش نے اس کے کان بھرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ادھر چچی امی نجانے کیا کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"تحمل سے بات کرنا بچی سے۔"

"پھر بچی!" وہ بھنا اٹھا۔

"بچی ہی تو ہے..." چچی امی بھی ناراض سی ہو گئیں۔ "اب جاؤ بھی۔" انہوں نے زبردستی اسے کمرے میں دھکیلا جب وہ چلا گیا تو وہ سوچنے لگی تھیں۔ "خود بھی تو بچہ ہے عمر۔ خیر! اس کی عمر میں بھائی صاحب (عمر کے والد) ایک بچے کے باپ بن گئے تھے۔ سنبھل جائے گا آہستہ آہستہ۔" وہ اسی بات پر مسرور تھیں کہ انہوں نے اپنے سارے ارمان جی بھر کے پورے کیے ہیں۔ جب سے انہیں کینسر تشخیص ہوا تھا۔ تب سے وہ خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔

اس گھر کے لیے انہیں عشوہ جیسی نرم، حلیم اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والی لڑکی چاہیے تھی اور انہیں یقین تھا کہ عشوہ ان کے بعد نہ صرف اس گھر کو بلکہ عمر اور عروسہ کو بھی سنبھال لے گی، کیونکہ وہ جو ہر

شناس تھیں۔ اور انہوں نے سیپ میں بند "موتی" کو پرکھ لیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"بہت شوق تھا تمہیں شادی کرنے کا۔" ان الفاظ کو سن کر عشوہ دھک سے رہ گئی۔ وہ اس کے سامنے ہی تو بیٹھا تھا پُرشوق نظروں سے دیکھتا ہوا۔ عشوہ کو ایک تسلی تو ہو چکی تھی یعنی کہ وہ پیا کو بھائی تھی۔ کیا یہ اس کے جیسی قناعت پسند لڑکی کے لیے کم تھا؟

"جی..." اس کے ہونٹ ایک دوسرے سے گویا جڑ کر رہ گئے تھے۔

"نہ تو میں بھاگا جا رہا تھا اور نہ تم... پھر نجانے کیوں چچی امی نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔" اس نے منہ کے زاویے بگاڑ کر کہا۔

"دو چار سال بعد کر لیتیں تو کیا حرج تھا۔ میں بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا۔" عمر کا تاسف کسی طور پر کم نہیں ہو رہا تھا۔ اور عشوہ نے بے حد خوف کے عالم میں بے ساختہ جھک کر عمر کے پیروں کو دیکھا تھا جو کہ بیڈ سے نیچے لٹک رہے تھے۔ عمر اس کی نظروں کے تعاقب میں خود بھی ذرا سا جھک گیا۔

"یہ پیر سلامت ہیں۔ ان کی بات نہیں کر رہا ہوں۔" وہ گویا سمجھ گیا تھا۔

"تو پھر...؟" اس کی آنکھوں میں واضح سوال تھا۔

"اپنی اسٹڈیز اور جاب کی بات کر رہا ہوں۔ خیر! چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ لو تمہارا گفٹ۔" ایک ڈبیا اچھلتی ہوئی اس کی گود میں آ گری تھی۔

"ایسے تحفہ دیا جاتا ہے۔" اس کی نم آنکھوں نے سوال کیا۔

"اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ اب نکالو جلدی سے۔" وہ ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔

"کیا؟" اس کے لب بے ساختہ وا ہوئے۔

"میرا گفٹ۔"

"مگر میں تو نہیں لائی۔" وہ گھبرا سی گئی۔

"کیوں...؟" عمر کو غصہ آ گیا۔ "تمہیں کسی نے نہیں دیا؟"

"نہیں..." وہ اس کے طعنے سے خوف زدہ ہو گئی۔

"تو پھر چچی امی کو بھی یہ چین نہیں دینی چاہیے تھی۔ ادھر واپس دو۔" عمر نے جھپٹنے کے انداز میں ڈبیا کو پکڑا۔

"کیا کرنے لگے ہیں...؟"

"کچھ خاص نہیں۔" وہ ڈبیا کھول کر ڈیزائن دیکھنے لگا تھا۔ پھر اس نے چین کا لاک کھول کر اپنے گلے میں پہن لی۔

"مجھے سوٹ کر رہی ہے؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں..." اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا..." عمر نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"جیولری عورتوں کے لیے ہوتی ہے۔" نجانے کیسے عشوہ کے لبوں سے پھسل گیا۔

"اتنا کچھ تو لاد رکھا ہے۔ ابھی بھی بس نہیں ہے۔" عمر نے تاسف سے کہا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ قدرے منہ پھٹ۔

"نہیں... میں اس لیے نہیں کہہ رہی۔"

"مجھے تو کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔" عمر کو اسے ڈرانا اور خوف زدہ دیکھنا خوب بھلا لگ رہا تھا اور وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کر رہا تھا جو عشوہ کو خوف زدہ کرتیں۔ بلند آواز میں بول کر اسے تنگ کرنا، دہلانا عمر کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ عادت پختہ ہوتی چلی گئی۔ عشوہ کی بوکھلاہٹیں اسے غضب ناک کر دیتی تھیں۔ ہمہ وقت اس کی پیشانی پر سلوٹیں رہنے لگی تھیں۔

چچی امی نے اپنی تمام تر نفاست عمر میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ ویسے بھی وہ تنہا اتنے سال تک چچی امی کی محبتیں سمیٹتا رہا تھا۔ پہلے عروسہ اور پھر عشوہ نے اس محبت کو تقسیم کیا تو عمر کچھ اور اکھڑ گیا۔ چچی امی اسے گھر لا کر کچھ بے فکر ہو گئی تھیں۔ زیادہ تر عروسہ کو سجانے سنوارنے میں لگی رہتی تھیں۔ وہ بیمار تھیں۔ مگر عشوہ نے دیکھا تھا جب تک وہ زندہ رہیں ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہیں۔ خود کو بیمار سمجھ کر بستر پر بھی

لیٹ کر انہوں نے خواہ مخواہ نہ خود کو پریشان کیا، نہ دوسروں کو۔ چچی امی اس کے لیے بہترین ساس اور رہنما ثابت ہوئی تھیں۔ جو محبت اور توجہ انہوں نے عمر کو والدین کی وفات کے بعد دی تھی اسی محبت سے انہوں نے عشوہ کو بھی نوازا تھا۔

گھر میں مختصر سے افراد تھے۔ چچی امی، عمر اور عروسہ۔

عمر صبح کالج روانہ ہو جاتا تھا۔ عروسہ یا تو سوتی تھی یا پھر کھیلتی کودتی۔ چچی امی، عروسہ کو اپنے بڑھاپے کی اولاد سمجھتی تھیں۔ اکثر عشوہ کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاتیں۔ چونکہ عمر کی والدہ اور چچی دونوں سگی بہنیں تھیں اور دونوں میں بلا کا اتفاق تھا۔ اسی لیے چچی امی اور اس کی امی دونوں نے ایک گھر میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ یہ گھر عمر کے والد نے تعمیر کروایا تھا۔ تب ان کے حالات بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔

عمر کو تعلیم سے دلچسپی تھی۔ اور اسے پڑھتا دیکھ کر عشوہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتی تھی۔ خود وہ بھی بہت سا پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر وقت نے کچھ اور نصاب پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

شادی کے دسویں مہینے عمیمہ اس کی گود میں آ گئی۔ ابھی عمر کو سمجھنا اور پڑھنا شروع کیا تھا۔ عمر کو جاننے کی کوشش ہی کی تھی جب عشوہ کی مصروفیت کا دائرہ کچھ پھیل گیا۔ چھوٹی سی بچی، گھر کی ذمہ داری، چچی امی کی بیماری... عروسہ کی الگ سے دیکھ بھال اور پھر عمر کے سدا کے نخرے، دس دس منٹ بعد، جوس، اسکوائش اور الم غلم کی فرمائش۔ پڑھنے کے دوران اسے کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا تھا۔

عروسہ کی اسکولنگ بھی عشوہ کے لیے بڑا امتحان تھی۔ وہ ایک ضدی اور نخریلی بچی تھی۔ بالکل عمر کی طرح۔ صبح کے وقت عمر اور عروسہ اسے پھرکی کی طرح گھما ڈالتے تھے۔ اوپر سے عمیمہ بھی اگر کبھی وقت سے پہلے اٹھ جاتی تو عشوہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ حالانکہ عمیمہ بہت صابر بچی تھی۔ عمر چیخ چیخ کر اسے بوکھلا کر رکھ دیتا تھا۔

"آج میرا ٹیسٹ ہے۔ مجھے وقت پر کالج پہنچنا ہے۔ تم ڈھنگ کا ناشتا بھی بنا کر نہیں دے سکتیں۔ میں نے اس لیے تو شادی نہیں کی تھی۔" ہر بات کی تان شادی پر آ کر ہی ٹوٹتی تھی۔ اگر کپڑے ٹھیک سے پریس نہ ہو پاتے یا پھر جوتوں کو پالش کرتے ہوئے چمک نہ آ پاتی تب بھی عمر کے یہی بیان جاری ہوتے تھے اور اب تک اس کی یہ عادتیں اتنی پختہ ہو چکی تھیں کہ چاہ کر بھی کچھ تبدیلی آنا ناممکن تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ عموریہ اور ایمن نے عشوہ کی مصروفیات کچھ اور بڑھا دی تھیں۔ عمر یونیورسٹی سے فراغت کے بعد خوش قسمتی سے گورنمنٹ جاب سے منسلک ہو گیا تھا۔

عمر کی بے رخی، بے اعتنائی کا وہ ہی حال تھا۔ اور جو وقت کے ساتھ ساتھ گریڈ بھی بڑھ رہے تھے تب ہی تو اس کی گردن میں مستقل سریا فٹ ہو گیا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے سرکتا جا رہا تھا۔ بچیوں کی مصروفیات اور گھربار کے جھمیلوں میں گم ماہ و سال کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔

ان پندرہ سالوں میں عمر کے تلخ، کڑوے، تیکھے ہر طرح کے رویے اس کے دل پر کیسے کیسے نشان چھوڑ گئے تھے۔ عمر کو کبھی ایسی فرصت کے لمحات میسر نہیں آئے تھے کہ وہ اس کے دل پر پڑے آبلوں کی مسیحائی کر لیتا۔

اب تو خیر سے عمر کو وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ وہ گھڑی ٹھہر کر وہ اس کی بات ہی سن لیتا۔ اس کے سر پر ہمیشہ عجلت سوار رہتی تھی۔ عشوہ کو کوئی بھی گھریلو مسئلہ یا بچیوں کی کوئی پرابلم ڈسکس کرنا ہوتی یا شیئر کرنا ہوتی تو وہ نجانے کتنی دفعہ تمہید باندھنے کی کوشش کرتی تھی۔ جوں ہی وہ اصل مسئلے کی طرف آتی، عمر کو کوئی نہ کوئی ضروری کام یاد آ جاتا تھا۔ اور وہ بغیر اس کی بات سنے بھاگ نکلتا۔ عشوہ بے چاری اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی تھی اور یہ تو ہمیشہ سے ہوتا تھا۔ کون سا نئی اور انوکھی بات تھی۔ ہمیشہ عمر کو اپنی کہنے اور اپنی منوانے کی عادت تھی۔ مقابل کی بات کو تو کبھی اس نے سننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔

دل کے بڑے بوجھ تو کم کرنے کے لیے وہ بہت سرسری انداز میں بھابھی بیگم سے بہت سی باتیں کہہ سن لیتی مگر پھر بھی دل میں ہمیشہ ایک حسرت پھانس بنی چبھن دیتی رہی تھی۔ عام عورتوں کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کا شوہر اسے بہت نہ سہی تھوڑی سی اہمیت تو دے مگر اہمیت تو وہاں جنم لیتی ہے جہاں دل میں محبت کی کچھ گنجائش نکلتی ہو۔

ان پندرہ سالوں میں بارہا عشوہ کو احساس ہوا تھا کہ عمر کے دل میں وہ رائی برابر جگہ نہیں بنا سکی یا پا سکی۔ بات تو صرف بوند برابر تھی۔ دل تو صرف ایک نظر التفات کا طلب گار تھا۔ چند ایک شیریں بولوں کا خواہش مند تھا۔ وہ تو جھوٹ موٹ بھی اوپری دل کے ساتھ کسی نازک، حساس دل کا احساس کرنے کا روادار نہ تھا۔ بقول عمر کے منافقت تو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ بھلا اسے عشوہ کا دل رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اور وہ جوان پندرہ سالوں میں عمر کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہلکان ہو رہی تھی، اپنے لیے دو گھڑی چند لمحے اور کچھ ساعتیں مانگ رہی تھی۔ مگر ہوا کیا؟ بارہ سال بعد اس کے پھر سے پریگننٹ ہونے کی خبر نے عمر کو نہ صرف ٹھٹکا دیا تھا، بلکہ حد درجہ بوکھلا بھی دیا۔ ایمن خیر سے بارہ سال کی ہو رہی تھی اور عشوہ تو دل میں بیٹے کی خواہش پر بھی حسرت کے آنسو بہا کے صابر ہو چکی تھی جب اللہ نے اس کے مرجھائے اور بجھے بجھے دل کو پھر سے پر امید کر دیا۔ ادھر وہ شکرانے پڑھنے، نیاز بانٹنے، قرآن خوانی کے بعد سجدہ شکر ادا کرتے نہ تھک رہی تھی جب عمر کے پتھریلے فیصلے نے عشوہ کا نازک دل کرچی کرچی کر دیا۔ وہ نہ صرف سخت بھنایا ہوا تھا بلکہ کچھ بوکھلا بھی رہا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو جس عمر میں وہ چوتھی مرتبہ باپ بن رہا تھا۔ اس عمر میں تو آج کل لڑکوں کے سر پر محض سہرا سجانے کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ بتیس، تینتیس سال کی عمر میں بہترین جاب کے ساتھ وہ ایک کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔ خوب صورت، نازک اندام سی بیوی، تین ذہین اور پیاری بیٹیاں، گھر میں ہر طرح کا سکھ، خوش حالی اور راحت کے باوجود عمر جیسا ناشکرا انسان ماضی میں اپنی جلد بازی کے کیے گئے اس فیصلے پر پچھتا رہا تھا۔ ویسے بھی بغیر کسی چاہ اور شوق کے جو چیز میسر آ جاتی ہے۔ اس کی اہمیت اور حیثیت پانے والے کی نظر میں ذرہ بھر نہیں رہتی۔

"یہ سب کیا ہے عشو!" وہ اس کی رپورٹس دیکھ کر چیخ اٹھا تھا اور اسے ایسی نظروں سے گھور رہا تھا گویا اس سارے معاملے میں وہ اکیلی قصوروار ہے۔

"کیا ہے؟" عشوہ کا اطمینان قابل دید تھا۔ وہ بے حد مسرور تھی۔ اسے گویا یقین تھا کہ دل میں دبی برسوں کی خواہش اس دفعہ تو ضرور پوری ہو جائے گی۔ وہ اللہ کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہوئی تھی۔

"ختم کروا دو اس سلسلے کو۔ تماشا بنوانا ہے کیا...؟ اور چار سال بعد عمیمہ کو اگلے گھر بھجوانے کی تیاری پکڑو۔ اب اس عمر میں یہ سب زیب دیتا ہے؟"

اس کا لہجہ انتہائی کڑوا تھا۔ اور وہ محض اس سلسلے سے چھٹکارا پانے کے لیے جواز ڈھونڈ ڈھونڈ کے پیش کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ کچھ عرصہ پہلے تک تو وہ خود کو تین بیٹیوں کا باپ بھی قطعاً "نہیں" سمجھتا تھا۔ بلکہ اس بات پر اسے فخر بھی تھا اور کہتا تو وہ ٹھیک ہی تھا۔ اگر کبھی بچیوں کے اسکول چلا جاتا تو عمیمہ کی فرینڈز تو کیا ٹیچرز اور پرنسپل تک ٹھٹک کر پوچھتی تھیں کہ کیا آپ عمیمہ کے بھائی ہیں؟ اور کچھ ایسا ہی خیال پرنسپل صاحبہ کا عشوہ کے بارے میں بھی تھا۔ مگر عشوہ کی تعریف سننا تو عمر کو کبھی گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں سن کر انجان ظاہر کرنے لگتا تھا گویا کسی اجنبی کے بارے میں بات کی جا رہی ہے۔ عشوہ تو کیا اب تو بہت حساس سی عمیمہ بھی باپ کے رویے پر چونکنے لگی تھی۔

"عمر!" عشوہ گویا دھک سے رہ گئی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" صدمے کی شدت سے اس کی آواز پھٹ سی گئی۔

"کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی ہے؟ جو کہہ دیا ہے، اچھی طرح سے سمجھ لو۔" وہ سخت تلملا رہا تھا۔ عشوہ پھر بھی بے یقین کھڑی تھی۔

"مگر کیوں؟" عشوہ کے بھل بھل آنسو گرنے لگے۔ "کتنے ظالم ہیں آپ عمر! کوئی اپنی اولاد کے بارے میں اس طرح بھی سوچتا ہے؟"

"یہ رونا دھونا بند کرو۔ تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ آنسوؤں سے کس قدر چڑ ہے۔" عمر نے ناگواری سے سوں سوں کرتی عشوہ کو ٹوکا۔ اسے آفس جانے کی جلدی تھی ورنہ وہ عشوہ کے چودہ طبق روشن کر دیتا۔

"آپ بھی اچھی طرح سے سن لیں۔ میں ہرگز بھی یہ بد عمل نہیں کروں گی۔" وہ بیڈ روم کی چیزیں ٹھکانے لگا رہی تھی۔ عمر آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ صرف ٹائی کی ناٹ لگانا تھی اور یہ گرہ لگانا عمر کو آتا تھا نہ عشوہ کو۔ عشوہ کو تو وہ اتنا بوکھلا دیتا کہ وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔

"بد عمل؟" عمر الماری میں سے شرٹ کے ساتھ میچ کرتی ٹائی نکالتے ہوئے چونکا۔ "یہ برا عمل ہے؟ اور جو تم ملک کی آبادی بڑھانے کے پلان بنا رہی ہو۔ محکمہ منصوبہ بندی والوں کے لیکچر کی طرف تم بھی کبھی دھیان دے لیا کرو۔" اس کا انداز صاف جھاڑنے والا تھا۔

"ہونہہ! اور جو سترہ، اٹھارہ کروڑ تک کی اس ملک کی آبادی ہے۔ وہ میں نے ہی تو بڑھائی ہے۔" وہ سلگ اٹھی۔

"تمہارے جیسی جاہل عورتوں کی بے عقلی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ آج پاکستان کس قدر خوش حال ہوتا۔" اسے کوئی بھی ٹائی پسند نہیں آ رہی تھی۔ بیڈ پر اس نے ہر رنگ کی ٹائی کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ اب اس ڈھیر کو سمیٹنا تو عشوہ کو ہی تھا۔ اگر وہ عمر کو ذرا سا بھی ٹوک دیتی تو وہ پوری الماری تلپٹ کر کے ہی آفس سدھارتا۔ عشوہ کا سمجھانا بجھانا یا مشورہ دینا تو عمر کو ذرا بھی نہیں بھاتا تھا۔ وہ اسے کم فہم اور جاہل سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک وہ ہی عورت دانش مند، خرد مند اور فہم و فراست والی تھی جس کے پاس ڈھیر ساری تعلیمی اسناد جمع تھیں۔ علاوہ ازیں بھابھی بیگم سے لے کر عشوہ تک سب عورتوں کو اس نے ایک ہی لسٹ میں شمار کر رکھا تھا۔

"بغیر کسی معمار کے پاکستان کیسے خوش حال ہو سکتا ہے؟ اور آپ جیسے معمار بھی جاہل عورتوں کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ بہت دور جانے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ گھر میں مثال موجود ہے۔ آپ خود کو اور فائق کو ہی دیکھ لیجیے۔" عشوہ کا انداز طنزیہ نہیں تھا مگر پھر بھی عمر گویا بل کھا کر رہ گیا۔

"بہت چلنے لگی ہے تمہاری زبان۔ یہ نہ ہو، کسی دن کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ دوں۔ بھابھی بیگم کی کمپنی میں بیٹھنا کم کر دو۔ ساری پٹیاں ان ہی کی سکھائی پڑھائی ہیں۔" عشوہ کے منہ سے کوئی بھی سمجھ داری کی بات اگر پھسل ہی جاتی تو عمر سے برداشت کہاں ہوتی تھی۔

وہ ایک ٹائی پسند کر چکا تھا اور اب عروسہ کو آوازیں دے رہا تھا۔ چند سال پہلے عمر کی ٹائی کی ناٹ لگانے کی ذمہ داری عروسہ کے سر آن پڑی تھی۔ اور عجیب بات تھی کہ عروسہ جیسے تیسے بھی ناٹ لگا دیتی، عمر نے یہ کبھی اعتراض نہیں کیا تھا، جبکہ عشوہ بے چاری کی تو وہ درگت بنا کر رکھ دیتا تھا۔

"جس عورت کو ٹائی کی گرہ تک لگانا نہیں آتی۔ اس عورت کا بھلا فائدہ ہی کیا؟" وہ بھنا کر یہ تا ٹائی کے دفتر چلا جاتا تھا۔ عمر کے روز، روز کے جھگڑے سے تنگ آ کر اس دن عروسہ نے ٹائی اٹھائی اور ان دونوں کے قریب آ گئی اور پھر یہ اس کا معمول ہی بن گیا۔

"ہٹیے، عشوہ جی! آپ کو تو خوامخواہ بوکھلا کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ بھلا کون سا مشکل کام ہے۔" اس نے جھٹ پٹ ٹائی کی ناٹ اس قدر نفاست سے لگائی کہ عمر تو کیا عشوہ تک حیران رہ گئی۔

"یہ جنریشن ہر لحاظ سے آگے ہے۔" اس نے سر ہلا کر گویا تسلیم کر لیا۔ عمر، عروسہ کے اس کارنامے پر دل کھول کر داد دیے جا رہا تھا۔

"خالی خولی تعریف سے کام نہیں چلے گا۔ باتوں سے صرف عشوہ جی بہل سکتی ہیں ہمیں ہرگز نہیں۔ نکالیے ہمارا انعام۔" وہ بڑے شاہانہ انداز میں کہہ رہی تھی، عشوہ کو ہنسی آ گئی۔

"صبح صبح فقیروں کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔ ایک

دفعہ بھابھی بیگم کو لیتے سنا تھا۔ یہ لو! پورے پچاس پیسے۔" عمر نے والٹ کے بجائے دراز سے فالتو پڑے چند سکے نکال کر عروسہ کی ہتھیلی پر رکھنا چاہے۔

"عمر بھائی!" عروسہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ "میں ایمن یا عموریہ نہیں ہوں۔"

"اچھا۔۔۔" عمر سوچ میں گم ہوا۔ "پھر کتنے چاہئیں؟"

"پورے ٹو تھاؤزنڈ۔" عروسہ نے گلابی ہتھیلی پھیلا کر مان بھرے لہجے میں کہا۔

"ٹو تھاؤزنڈ؟" اب بدکنے کی باری عمر کی تھی۔ "عروسہ بی بی! ایک ذرا سا کام کیا ہے اور اتنی اجرت؟؟"

"یہ اتنا سا کام اپنی بیگم سے کروالیتا تھا۔" عروسہ قل قل ہنسنے لگی۔

"اچھا مذاق ہے۔" عمر نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"نکالیے بھی۔۔۔" عمر پھر سے والٹ چیک کرنے لگا۔ پیسے نکال کر عروسہ کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے خیال آیا تو پوچھنے لگا۔

"بائی دا وے، ابھی پچھلے ہفتے آپ نے پورے تین ہزار لیے تھے، وہ کہاں گئے؟؟"

"عمر بھائی! ایک تو آپ کو کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ بتایا تو تھا میری فرینڈ کی برتھ ڈے تھی۔ گفٹ دینا تھا اسے۔"

وہ نیلے نوٹ مٹھی میں دبا کر باہر بھاگ گئی۔ ابھی اسے کالج کے لیے تیار ہونا تھا۔ ادھر عمر بھی لاپروائی سے لیپ ٹاپ کا بیگ اٹھائے باہر نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو سویٹی!" عمر نے لیپ ٹاپ کا بیگ درمیانی میز پر رکھا اور خود قدرے جھک کر چٹاخ چٹاخ ایمن کے کئی بوسے لینے کے بعد سیدھا ہو گیا۔ آج بڑے دنوں بعد اسے سب سے لاڈلی اور چھوٹی بیٹی کا خیال آیا تھا۔ عمر کے "لاڈ" بھرے انداز کو دیکھ کر بھی ایمن کے وجود میں جنبش نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہنوز سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"ایمن بیٹا! کیا اسکول سے چھٹی مارنے کا ارادہ ہے؟" وہ ایمن کی ہر نبض سے واقف تھا۔ اکثر اسکول نہ جانے کے لیے بھی وہ بہانے بنا لیتی تھی۔ پیٹ میں درد اٹھنے لگتا اور کبھی پورا جسم ٹھنڈا ہونے کے باوجود ایک سو تین بخار ہو جاتا۔

"نہیں۔۔۔" بالآخر ایمن نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔

"تو پھر؟" عمر استفہامیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ اس کے سرخ سرخ گالوں کے ڈمپل بھی خاموش تھے۔ آنکھیں بھی خفا خفا سی تھیں۔ عمر کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"پاپا! ہماری آپ سے کٹی ہے۔" ایمن نے سادہ انداز میں جتا کر کہا۔

"شہزادی عالیہ! کیا وجہ جان سکتا ہوں؟" اس پل وہ قطعاً "مختلف" لگ رہا تھا۔ اپنی اکھڑ فطرت کے بالکل برعکس۔ بیٹیوں میں سے بھی صرف ایمن کو ایسی توجہ اور محبت سے نوازا جاتا تھا۔ کچن کی کھڑکی میں سے منظر صاف دکھائی دے رہا تھا اور نہ جانے کیوں ہر دفعہ ہی یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ خوشی کے ساتھ دل کچھ بھر بھی آتا تھا۔ آنکھیں نم ہو جاتیں اور ماضی کی بھول بھلیوں میں وہ کسی ایک بھی خوشگوار منظر کی تلاش میں سرگرداں تھک سی جاتی تھی، مگر ذہن کی اسکرین ہنوز سپاٹ رہتی۔ کوئی رنگ، بہت چاہنے کے باوجود بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"آپ جانتے ہیں پپا! ہم کیوں ناراض ہیں۔" ایمن نے بسور کر سامنے رکھا دودھ کا گلاس ہاتھ سے قدرے دور کھسکا دیا۔

"اچھا۔۔۔" عمر کو سوچنا ہی پڑا۔ مگر یہ کیا؟ ایمن کی ناراضی کی کوئی بھی وجہ اس کی یادداشت میں محفوظ نہیں تھی۔ ویسے بھی ایمن اور عروسہ دونوں کو روٹھنے کا بلکہ گھڑی گھڑی روٹھنے کا مرض لاحق تھا۔ یہ اور بات تھی کہ ایمن کسی نہ کسی وجہ سے اور عروسہ بغیر کسی وجہ کے بھی کئی کئی گھنٹے روٹھنے کا شغل فرماتی تھی۔ پھر عمر ان کو مناتا تھا۔

"پاپا! آپ ہماری برتھ ڈے سیلیبریٹ نہیں

کرتے۔ آپ ہماری برتھ ڈے سیلیبریٹ کریں۔" ایمن نے کہا تو عشوہ کے ساتھ ساتھ آملیٹ اور پراٹھے رغبت سے کھاتی عروسہ بھی چونک گئی۔

"ایمن! یہ کیا بے ہودگی ہے۔" عشوہ نے سنبھل کر ایمن کو بری طرح سے ڈپٹا۔ "خاموشی سے دودھ کا گلاس اٹھا کر پیو۔۔۔ میں تم دونوں کے لنچ باکسز لاتی ہوں۔"

"ہم نے کچھ غلط کہا ہے؟" ایمن کی سبز آنکھیں شفاف پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔ "آپ نے کبھی ہمارا برتھ ڈے سیلیبریٹ نہیں کیا۔ ہماری فرینڈز ٹھیک ہی کہتی ہیں۔" وہ سوں سوں کرتے ہوئے بغیر رکے بولتی چلی گئی۔

"کیا کہتی ہیں تمہاری بے ہودہ فرینڈز؟" عشوہ جو کچن کی طرف مڑنے لگی تھی، پلٹ کر واپس آ گئی۔

"یہی کہ ہم بیٹے کی جگہ غلطی سے آ گئے ہیں، سو اسی لیے۔۔۔"

"ایمن!" عشوہ کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس کا اٹھتا ہاتھ دیکھ کر عمر درمیان میں بول پڑا۔

"تم اپنا کام کرو۔ یہ میرا اور ایمن کا معاملہ ہے۔" اس نے رکھائی سے عشوہ کی طرف بغیر دیکھے کہا۔

"یہ آپ کا اور ایمن کا معاملہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ہم سب کا مشترکہ مسئلہ ہے۔" اس کی بھرائی آواز اس کے جذبات کی شدت کو ظاہر کر رہی تھی۔

عشوہ چاہ کر بھی ایمن کی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی۔ ایک دفعہ کوشش کی بھی تھی، مگر اس وقت عمر غصے میں آگیا تھا اور عروسہ نے بھی رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ اب بھی وہی ہوا تھا۔ عروسہ نے ایک دم رونا شروع کر دیا۔ عمر روٹھی روٹھی ایمن کو بھول کر عروسہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"عروسہ! فار گاڈ سیک، یہ کیا بچپنا ہے؟ خاموش ہو جاؤ! ایمن تو بچی ہے، کچھ بھی کہہ سکتی ہے، تم نے خوامخواہ دل پر لے لیا ہے، ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"میں کب منع کر رہی ہوں؟ شوق سے بچی کی خوشی پوری کر دیجیے۔ میرا دل تو ویسے ہی بھر آگیا ہے۔"

عروسہ کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی تھی۔ اب کے عشوہ بھی بوکھلا کر رہ گئی۔

"عروسہ گڑیا! چپ کرو نا، ایمن تو بس۔۔۔"

عمر اٹھ کر عروسہ کے قریب آگیا اور گھٹنوں کے بل دوزانو بیٹھ گیا۔ عروسہ کے ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اور وہ بہت نرمی، بہت پیار سے اسے سمجھا رہا تھا "چچی امی کی وفات کا دن ہمارے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے۔ تم دل چھوٹا مت کرو۔"

عمر کے سمجھانے بجھانے کا اتنا اثر ہوا تھا کہ عروسہ نے آنسو پونچھ لیے تھے اور اب وہ پھر سے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھانے لگی تھی۔ عمر بھی ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ایمن بھی عروسہ کو روتا دیکھ کر اپنی ناراضی بھول چکی تھی۔ عموریہ ہمیشہ کی طرح خاموش تھی اور اسی خاموشی کے ساتھ ساتھ دوسرا پراٹھا پلیٹ میں رکھے کھانے میں مصروف تھی۔ اس کے بارے میں سب کی متفقہ رائے تھی کہ وہ کھانے اور سونے کے لیے ہی دنیا میں آئی ہے۔ باقی کے معاملات اس کی بلا سے۔ چاہے کچھ بھی ہو، اسے وقت پر کھانا چاہیے ہوتا تھا اور نیند بھی بہت ضروری تھی۔ صحیح معنوں میں وہ عمر کی ہو بہو کاپی تھی۔ نین نقوش سے لے کر عادتوں تک۔ بالکل باپ کی طرح بے حس۔

عشوہ نے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے اک گہری طویل سانس کھینچی۔ اس کی نظریں اب عمیمہ کے چہرے پر تھیں۔ مضمحل سا اداس چہرہ۔ آج وہ یونیفارم میں نہیں تھی۔ یقیناً "اسکول سے چھٹی کا ارادہ تھا۔ مگر وہ ناشتا بھی نہیں کر رہی تھی۔ اس کا پراٹھا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ دودھ کے نیم گرم گلاس پر بالائی کی تہ سی ابھر آئی تھی۔ انڈا بھی جوں کا توں پڑا تھا۔ عین اس لمحے جب عشوہ نے اپنی بھوک مٹتی محسوس کی تھی، بالکل اسی پل، اسی لمحے عمیمہ کی بھوک بھی خود بخود ختم ہو چکی تھی اور وہ محض دکھاوے کے لیے بھی ناشتا نہیں کر سکتی تھی۔ عمیمہ کی عادتیں ہی نہیں، مزاج بھی بالکل عشوہ کی طرح تھا۔

ایمن ' باپ کی انگلی تھام کر باہر نکل گئی تھی۔ عموریہ اور عروسہ بھی نیپکن سے ہاتھ پونچھ کر بلند آواز میں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔ ڈائننگ میز پر صرف عمیمہ تنہا بیٹھی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں اس حد تک گم تھی کہ اسے کسی کے اٹھ کر چلے جانے کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

"عمیمہ!" عشوہ کو بولنا ہی پڑا۔ ارد گرد ناچتی اس خاموشی سے اسے شدید وحشت ہو رہی تھی۔

"جی ماما!" وہ میز پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اس کی آواز اس حد تک مدھم تھی کہ عشوہ بمشکل ہی سن پائی۔

"ناشتا پھر سے ٹھنڈا ہو جائے گا۔" وہ ابھی ابھی اس کا ناشتا گرم کر کے لائی تھی۔

"دل نہیں چاہ رہا ماما!" عمیمہ سخت بے زار تھی۔

"کیوں نہیں چاہ رہا؟" وہ خالی برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ عمیمہ بھی اپنے سامنے رکھی ٹرے کو اٹھا کر کچن میں آگئی۔ عشوہ گندے برتن سنک میں رکھے دھونے لگی۔ عمیمہ نے صافی اٹھا کر کچن کی سلیب صاف کرنا شروع کر دی۔

"پہلے ناشتا کر لو عمیمہ!" عشوہ نے برتنوں کو صابن لگاتے ہوئے اسے ٹوکا۔

"آپ نے ناشتا کیا ہے؟" وہ سوالیہ نظروں سے ماں کا چہرہ تکتے ہوئے بولی۔ عشوہ نے بے ساختہ نظر چرالی تھی۔ اب وہ اسے اپنی خرابی طبیعت کا بھلا کیا بتاتی۔ انڈا' پراٹھا کھانے کو تو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ عمیمہ نے سلیب صاف کر کے چولہے بھی رگڑ رگڑ کر ان کی چکناہٹ دور کر دی تھی۔ اب وہ ہاتھ دھونے کے بعد بریڈ کے پیس نکال کر سینکنے لگی۔ ساتھ تازہ چائے بھی بنا رہی تھی۔ عشوہ نے سمجھا شاید وہ اپنے لیے کچھ الگ سا ناشتا بنانا چاہتی ہے۔ عمیمہ نے بہت اہتمام کے ساتھ سلائس پر پنیر' جام اور شہد کی تہ لگائی تھی۔ چائے مگ میں ڈالی۔ پھر وہ عشوہ کا گیلا' ٹھنڈا ٹھار ہاتھ تھام کر کرسی تک لے آئی۔

"یہاں بیٹھیے اور ناشتا کیجیے۔" وہ سلائس اس کے ہاتھ میں زبردستی تھما کر بولی۔ "اگر دل نہ چاہے انڈا پراٹھا کھانے کو تو کبھی کبھی اپنی پسند کے مطابق بھی مینیو ترتیب دے لیتے ہیں۔"

"اف... سیانی بی!" عشوہ کھل کر مسکرا دی۔ "ویسے یہ پنیر اور جیم کا مکسچر کافی ٹیسٹی ہے۔"

اس نے بھوک نہ ہونے کے باوجود دو سلائس رغبت سے کھا لیے تھے اور اب وہ تیسرا سلائس اٹھا رہی تھی۔

"تم بھی لونا۔" وہ بہت ہی میٹھی نظروں سے اپنی ہمدرد اور حساس طبیعت کی بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ ایسے مضبوط ستونوں کے باوجود بھی وہ خود کو کمزور عمارت سمجھتی تھی۔ بھلا کیوں؟ اس قدر خلوص اور محبت کے باوجود بھی دل میں اور محبت کی طلب تھی بھلا کس لیے؟

"میں پراٹھا اور انڈا لوں گی۔" وہ اپنی ٹرے اٹھا لائی۔ بہت دنوں بعد عشوہ نے ایسا مزے دار ناشتا کیا تھا ورنہ تو بچوں کا بچا کچھا کھا کر ہی صبر شکر کر لیتی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ میں آئندہ آپ کو ناشتا کروا کے ہی اسکول جایا کروں گی۔" عمیمہ نے اپنا نیک خیال ظاہر کیا تھا۔ چائے کے سپ لیتی عشوہ مسکرا دی۔

"ماما! آپ کو اپنی ہیلتھ کے لیے ضرور کانشس ہونا چاہیے' کیونکہ آپ ہیں تو ہم ہیں۔" عمیمہ بھی ماں کی فرحت بھری کمپنی کو بہت انجوائے کر رہی تھی۔ عشوہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یقیناً" وہ بھابھی بیگم کی مہربانی سے ماں کی موجودہ حالت سے اچھی طرح سے آگاہ ہو چکی تھی۔ تاہم فطری جھجک کے باعث وہ ماں سے کھل کر یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ ان دنوں آرام کرے۔ وہ تو عشوہ سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ ان دنوں میں وہ گھر رہنا چاہتی ہے' تاکہ ماں کا گھریلو امور میں ہاتھ بٹا سکے۔

"ماما! ایک بات کہوں؟" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے عشوہ سے اجازت لینا چاہی۔

"بولو' بیٹا! اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے۔" عشوہ ناشتا کر چکنے کے بعد پھر سے صفائی ستھرائی میں مصروف ہو گئی تھی۔ عمیمہ نے بھی ڈسٹنگ والا کپڑا اٹھا لیا تھا۔ اب وہ رگڑ رگڑ کر ڈائننگ میز صاف کر رہی تھی۔

"ماما! بابا آپ کا خیال نہیں رکھتے۔"

عشوہ گویا دھک سے رہ گئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ عمیمہ اپنی سوچ کو لفظوں کا پیراہن بھی پہنا دے گی۔ بہت دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ عمیمہ کسی الجھن میں تھی اور آج اس الجھن کی وضاحت بھی ہو گئی تھی۔

"اتنا خیال تو رکھتے ہیں... اور کیسے خیال رکھا جاتا ہے؟" وہ نہیں چاہتی تھی کہ عمیمہ کا معصوم ذہن ماں اور باپ کے درمیان موجود اس ان دیکھے فاصلے کو محسوس کرے۔

"ماما! کیا آپ کو نہیں لگا کہ ایمن کی ننھی سی خوشی سیلیبریٹ نہ کر کے آپ کچھ غلط کر رہے ہیں؟" وہ دھیرے دھیرے موضوع کی طرف آ ہی گئی تھی۔ اس کا انداز بلا کا پر سوچ تھا۔

"شاید ہاں۔" عشوہ کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔

ایمن کی ننھی سی اس خوشی کے لیے ایک دفعہ چند سال پہلے عشوہ نے ہلکا پھلکا سا اہتمام کیا تھا۔ مگر ہوا کیا؟ یہ سوچنا ہی اذیت کے ایک سلسلے کو آواز دیتا تھا۔

مسئلہ صرف یہ تھا کہ ایمن کی پیدائش کا دن اور چچی امی کی برسی کا دن ایک ہی تھا۔ سالگرہ منانا کوئی اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ مگر جوں جوں ایمن بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اس بات کو واضح محسوس کرنے لگی تھی۔ اپنی سہیلیوں کے علاوہ جب گھر میں عروسہ یا پھر عموریہ اور عمیمہ کی برتھ ڈے دھوم دھام سے منائی جاتی تو ایمن کا حساس ہونا بھی بنتا تھا۔ وہ کئی مرتبہ اس موضوع پر عشوہ سے معصومانہ سی لڑائی بھی کر چکی تھی اور اس کی اسی خوشی کو مدنظر رکھتے ہوئے عشوہ نے قرآن خوانی اور نیاز وغیرہ بانٹنے کے بعد چپکے سے کیک بھی منگوا لیا۔ چاٹ اور بریانی کے ساتھ آئس کریم کے علاوہ ایمن کا فیورٹ پزا بھی منگوا لیا تھا۔ عمر کے آنے سے پہلے ایمن بھی خوشی خوشی تیار ہو گئی۔ مگر ہوا کیا؟ سب سے پہلے تو عروسہ میز پر سجے چھوٹے سے پائن ایپل کیک کو دیکھ کر گنگ رہ گئی تھی۔ اور پھر جو اس نے رونا شروع کیا تو اس کے آنسوؤں میں عمر اور عشوہ دونوں ہی بہہ کر رہ گئے۔ ادھر ایمن ہکا بکا کھڑی تھی۔ عمر نے آؤ دیکھا' نہ تاؤ' لہرا کر ایک زوردار قسم کا تھپڑ عشوہ کے منہ پر دے مارا۔

"احمق عورت! تمہیں کیک منگواتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ آج چچی امی کی برسی کا دن ہے۔ دل ویسے ہی صبح سے بوجھل ہے اور تم نے یہ تماشا لگا دیا ہے۔ حالانکہ منع کیا تھا کہ ایمن کا برتھ ڈے نہیں منایا جائے گا۔ تمہیں کم از کم عروسہ کے جذبات کا تو خیال کرنا چاہیے تھا۔ یہ محبت تھی تمہیں چچی امی سے؟ صبح سویرے سوگ منا کر دو گھڑی لوگوں میں دکھاوا کر لیا اور شام کو جشن منانے لگ گئیں۔ افسوس ہو رہا ہے مجھے تمہاری سوچ اور اس گھٹیا پن پر۔"

وہ بری طرح سے دہاڑ رہا تھا۔ ایمن باپ کے سخت لہجے کو سن کر تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ عمیمہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے اور عروسہ تو ویسے ہی دھواں دھار روئے جا رہی تھی۔

"عمر!" عشوہ تو بچیوں اور عروسہ کے سامنے اس عزت افزائی پر تھرا اٹھی۔ آنسوؤں کی یلغار اور توہین کے احساس نے اس کی آواز کو کپکپا کر رکھ دیا۔ اس سے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ لرزتی ٹانگوں پر بمشکل اپنے وجود کا بوجھ اٹھائے اپنے کمرے میں آئی تھی۔ نہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا اسے روتے ہوئے۔

بوجھل پپوٹوں والی سرخ آنکھوں کو کھولتے ہوئے بمشکل اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ تقریباً" سوا گیارہ بجے عمر سونے کی غرض سے کمرے میں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر عشوہ کچھ حیران ہوئی تھی' مگر اس نے اپنی حیرانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"اگر تم اس خیال سے روٹھی بیٹھی ہو یا ناراضی کا ڈھونگ رچایا ہے کہ میں تمہیں مناؤں گا تو محترمہ! اس خوش فہمی میں مبتلا مت ہوں۔" اس نے ہمیشہ والے

مخصوص مغرورانہ انداز میں کہا۔

"مجھے ایسی خوش فہمیاں لاحق نہیں ہوتیں۔" وہ سر سے لے کر پیروں تک سلگ اٹھی۔

"یہ برگر اور کولڈ ڈرنک تمہارے لیے ہے 'کیونکہ یہ تمہارے لیے عمیمہ نے پیک کروایا تھا۔" عمر نے صاف جتا بھی دیا تھا۔ اسے واقعی دل رکھنا نہیں آتا تھا۔ عشوہ کے دل میں پھانس سی چبھی۔

"ظاہر ہے میری بیٹی کو ہی میرا خیال آسکتا ہے۔ بھلا آپ سے یا عروسہ سے ایسی امید کی بھی نہیں جاسکتی۔ عروسہ کا اور آپ کا خون جو ایک ہے۔" بہت چاہنے کے باوجود وہ ان کے خون میں شامل خود غرضی کو جتا نہیں پائی۔

"ناک ناک کر حملے کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں جھانکو! کیا آج کا تمہارا عمل درست تھا؟" معاً" وہ اس کی طرف ٹرے کھسکاتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"کوئی گناہ سرزد ہوگیا تھا مجھ سے؟" وہ گویا پھٹ پڑی۔ "بچیوں کا بھی لحاظ نہیں کیا۔" اسے پھر سے اپنی توہین کا خیال آگیا۔

"نہ جانے کیوں مجھے غصہ آگیا تھا۔" وہ شاید شرمندہ ہوا تھا' مگر یہ شرمندگی کم از کم عشوہ کو نظر نہیں آسکتی تھی۔

"تم نے بھی تو ٹھیک نہیں کیا۔ عروسہ کا دل دکھا ہے۔ آج کے روز کیک کاٹنا ضروری تھا۔ کل یا پرسوں تک کا میں خود بھی پلان بنا رہا تھا۔ ایمن اور اس کی فرینڈز بھی خوش ہو جاتیں۔"

"تو آپ مجھ سے کہہ دیتے۔ مگر آپ بھلا کیوں کہتے۔ ناک نیچی ہو جاتی آپ کی۔ مجھے کچھ بتانا یا مشورہ کرنا آپ کو بھلا کیسے گوارا ہو سکتا ہے۔"

"ارے! جانے بھی دو' بس کرو' غصہ مت کھاؤ' کھانے کے لیے یہ برگر ہے نا۔" عمر کا لہجہ کچھ خوشامدی سا ہو گیا تھا اور عشوہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ عمر کب اور کس وقت اپنی انا کے گنبد سے باہر نکلتا ہے اور اپنی سطح سے کس وقت نیچے آتا ہے۔ سو وہ جذبات کے اس دھارے میں بہہ کر اپنی اہمیت جتانے کا موقع ہرگز بھی نہیں کھونا چاہتی تھی اور نہ ہی عمر کی خوشامدی باتوں اور میٹھی نظروں کے جھانسے میں آکر اپنی لمحہ بھر ملنے والی اہمیت کو ضائع کرنے کا تصور کر سکتی تھی۔

"کھاؤ نا یار!" وہ زبردستی پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھما رہا تھا۔ "ایمن کا برتھ ڈے اگلے سال منائیں گے ان شاء اللہ۔" وہ اسے پھر سے باتوں کے بہلاوے میں الجھانا چاہتا تھا۔ اور ایمن کو تو اس نے یقیناً" خوش کر ہی دیا تھا۔ میوزیکل باکس' کلرز اور نئے نکور بیگ لے کر دیے تھے۔ اوپر سے باہر کا ایک چکر بھی لگا لیا تھا یعنی آؤٹنگ کا کوٹہ بھی پورا ہو چکا تھا' سو اسے خفا خفا بیوی کا خیال بھی آ ہی گیا تھا۔ جسے وہ ہمیشہ والی عجلت' کے تحت اور غصے سے مغلوب ہو کر ناراض کر چکا تھا۔ اگرچہ عشوہ کو منانا اتنا اہم بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی اسے اسلام آباد جانا تھا۔ چچی امی کی کوئی نصیحت یاد نہیں تھی' مگر ایک بات اس نے ہمیشہ ذہن میں بٹھا رکھی تھی کہ سفر پہ جاتے وقت گھر والوں اور اپنے سے وابستہ لوگوں کی ناراضی دور کر کے ـــ ہنسی' خوشی رخصت ہونا چاہیے 'کیا پتا یہ آپ کا آخری سفر ہی ہو۔

"آپ نے مجھ پر ہاتھ کیوں اٹھایا؟" عشوہ سخت مشتعل تھی۔

"اتنی سی بات کو بڑھانا چاہتی ہو؟" وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے بیڈ پر چت لیٹ گیا۔

"یہ اتنی سی بات ہے؟" عشوہ گویا پھٹ پڑی۔ "جب چاہا بے عزت کر دیا' جب چاہا دھتکار دیا۔ جب مرضی ہوئی تو پکڑ کر پہلو میں بٹھا لیا۔"

"پہلو میں کہاں ہو' دس فٹ دور بیٹھی طنز کے تیر پھینک رہی ہو۔" عمر نے مصنوعی آہ بھری۔

"تو آپ پر کون سا اثر ہو رہا ہے؟"

"قریب آؤ گی تو اثر ہو گا نا۔" اس کا انداز اب بھی دل جلانے والا مغرورانہ قسم کا تھا۔ عشوہ کا دل بری طرح سے راکھ ہوا۔

"ہونہہ! کسی کی خاندانی ملازمہ نہیں ہوں۔" اپنی

توہین پر وہ اس طرح سے کڑھتی رہتی تھی۔

"اپنی حیثیت کا تم نے خود ہی تعین کر رکھا ہے۔ اگر میں کچھ کہوں گا تو تمہیں یقیناً" برا لگے گا۔"

"بغیر چاہ کے بیوی مل گئی' بغیر خواہش کے اولاد مل گئی۔ پکا ہوا پھل جھولی میں آگرے تو اس کی قدر معلوم نہیں ہو سکتی۔" وہ اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔ عمر ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

عشوہ کو طبیعت کے بھاری پن نے کچھ چونکا تو دیا تھا' مگر وہ پھر بھی بے یقین سی تھی۔ وہموں میں پڑ رہی تھی۔ بھلا بارہ سال بعد کسی خوش خبری کی امید کی جاسکتی تھی۔ مگر مہربان رب نے اپنی مہربانی اور فضل کا سایہ کر دیا تھا۔

صبح صبح جی بری طرح سے متلا رہا تھا۔ بچیوں کو اسکول بھیج کر وہ بھابھی بیگم کی طرف آگئی تھی۔ بھابھی بیگم تو فوراً" تیار ہو گئیں' چہرہ کھل اٹھا تھا۔

ڈاکٹر سے تصدیق کروا کر ہی وہ گھر لوٹی تھیں۔ بھابھی بیگم کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ عشوہ کو تخت پر بٹھا کر خود وہ کچن میں گھس گئی تھیں۔ بچیوں کے گھر آنے کا وقت بھی قریب تھا۔ عموریہ اور ایمن بھوک کی بہت کچی تھیں اور عروسہ تو ان دونوں پر بھاری تھی۔ بھابھی بیگم کی مہربانی سے گھر میں موجود سبزی تیار ہو گئی تھی۔ آٹا تو عشوہ سویرے ہی گوندھ لیتی تھی' سو بھابھی بیگم نے جھٹ پٹ پھلکے اتار دیے تھے۔ پودینے کی چٹنی بھی پیس دی۔ البتہ سلاد عشوہ نے بنا لیا۔

اس کی طبیعت خاصی بے زار تھی۔ کچن کے کام سے ہی ابکائی آنے لگتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آگے چل کر نہ جانے کیسے وہ ساری گھر گرہستی کو سنبھال سکے گی۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی' جب بچیاں اور عروسہ بھی آگئی۔ بھابھی بیگم نے تو علی الاعلان کہہ دیا تھا۔

"چاروں لڑکیاں غور سے سن لو! اپنے اپنے کام اب خود کرنے ہیں تم لوگوں کو۔"

"مگر کیوں؟" سب سے پہلے عروسہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "عشوہ جی' کہیں جا رہی ہیں؟" اس کا حیران ہونا بھی فطری تھا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ شاید عشوہ کہیں جا رہی ہے۔ اور عشوہ کا کہیں بھی جانے کا تصور ان سب کے لیے سوہان روح تھا۔ عروسہ تو ان گنت کاموں کے متعلق سوچ کر ہی کانپ کانپ گئی۔

"عشوہ کہیں بھی نہیں جا رہی۔" بھابھی بیگم نے پھر سے اعلان کیا۔

"تو پھر ہمیں کس بات کی سزا سنائی جا رہی ہے؟" عروسہ نے فق چہرے پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ کام سے اس کی جان جاتی تھی۔

"خیر سے عشوہ کو اب آرام کی ضرورت ہے۔" بھابھی بیگم کا لہجہ خود بخود دھیما ہو گیا۔ وہ عروسہ کی طرف متوجہ تھیں۔ تاہم سر جھکائے کھانا کھاتی عمیمہ کا پورا دھیان ان دونوں کی گفتگو کی طرف تھا۔ عشوہ ان کی باتوں سے بے نیاز نہانے کے لیے چلی گئی تھی۔ اسے سخت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہائے! بھابھی بیگم! خیریت تو ہے؟" عروسہ عادتاً" دہل اٹھی۔

"سب خیریت ہے۔" بھابھی بیگم نے نہال ہو کر کہا۔

"تو پھر آرام کیوں؟ میرے تو ٹیسٹ ہونے والے ہیں۔ مجھ سے گھر کے کام تو بالکل نہیں ہوں گے۔" عروسہ خوامخواہ روہانسی ہو گئی۔

"ارے گنتی کے دن ہیں۔ خیر سے فراغت کے بعد اپنی گھر گرہستی خود ہی سنبھالے گی۔ کاہے کو مری جا رہی ہو۔" انہیں غصہ آگیا۔ ویسے بھی ان کا غصہ خاصا مشہور قسم کا تھا۔

"کیسی فراغت؟" عروسہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ بھلا کیا ضرورت تھی اس جھنجھٹ کی۔ پھر سے ریں ریں کا سلسلہ۔ عروسہ کو شدید کوفت ہوئی۔ وہ کلس کر سوچتی رہی۔

"خیر سے عمیمہ کا بھائی ہونے والا ہے' بس دعا کرنا' اللہ تم سب کو میٹھا میوہ دے۔" عروسہ کو بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ نہ صرف عشوہ کا ہاتھ بٹائے بلکہ اس کا خیال بھی رکھے۔

"میٹھا میوہ؟" عروسہ نے مصنوعی چونکنے والے انداز میں کہا۔ ادھر عمیمہ بھی ٹھٹک گئی تھی۔ دل میں اک انوکھا سا احساس جاگا۔

"تو اور کیا' تین بیٹیوں کے بعد ہو گا۔ میٹھا میوہ ہی ہوا نا۔" وہ پرانے خیالوں کی مالک تھیں۔ بیٹوں کی آمد پر خوش ہونے والی۔

"لو جی! پھر سے سیاپا۔" اس نے بے زاری سے سوچا اور نیند سے بند ہوتی آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی تھی۔ بھابھی بیگم اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ ساری نصیحتیں بے کار گئی تھیں۔ کھانے کے جھوٹے برتن گویا ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ یونیفارم اور کتابیں صوفے اور کارپٹ پر بالترتیب بکھری پڑی تھیں۔ یقیناً" عشوہ کے علاوہ کسی اور نے اس پھیلاوے کو ہرگز نہیں سمیٹنا تھا مگر ان کی سوچوں کے برعکس ایک نرم ہاتھ ان کے کندھے سے مَس ہوا تھا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ عمیمہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"دادی بیگم! میں ہوں نا' ماما کا ہاتھ بٹایا کروں گی' آپ ان سے کہیے گا' کام کی فکر نہ کریں۔"

"دادی صدقے۔" بھابھی بیگم گویا نہال ہو کر رہ گئیں۔ "ایسی سعادت مند بیٹیاں دل کو ٹھنڈا کر دیا ہے بیٹی۔" اسی پل عشوہ بھی نہا کر آگئی تھی۔ اور اب پھرتی سے برتن سمیٹنے لگی' عمیمہ نے ماں کو روک دیا۔

"ماما! رہنے دیں میں کر لیتی ہوں۔"

"نہیں! تم سو جاؤ' صبح کی اٹھی ہوئی ہو' میں برتن دھو لیتی ہوں۔" عمیمہ پانچ بجے عشوہ کے ساتھ ہی اٹھ جاتی تھی۔ بہنوں کے کپڑے وغیرہ پریس کر دیتی۔ جوتے باہر نکال کر رکھتی۔ اسکول بیگ کو کھول کر چیک کرتی۔ اگر کوئی چیز کم ہوتی تو خود ہی بیگ میں لا کر ڈال دیتی۔ عشوہ کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ عمیمہ اپنی نیند دن کے وقت ضرور پوری کر لیا کرے۔

"آپ تو ہم سے بھی پہلے اٹھ جاتی ہیں۔ آپ کے لیے بھی دن میں کچھ گھنٹے سونا ضروری ہے۔" وہ ماں کی بات سنی ان سنی کر کے پھیلاوا سمیٹنے کے بعد برتن دھونے لگی تھی۔

بھابھی بیگم کے چلے جانے کے بعد عشوہ بھی گیٹ بند کر کے کچن میں آگئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ رات کے کھانے کی تیاری بھی کر لے۔ آج عمر لنچ کرنے نہیں آیا تھا۔ اب ڈنر تو لازمی اس کا من پسند ہونا چاہیے تھا اور عمر کی پسندیدہ ڈشز بناتے ہوئے اسے دانتوں پسینہ آجاتا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ عمر کو نہ صرف کھانا پسند آیا تھا بلکہ جناب کا موڈ بھی کافی خوشگوار تھا۔ اور اسی خوشگوار موڈ میں بچیوں سے گپ شپ کی جا رہی تھی۔

"سمر ویکیشنز میں ہم کہاں جائیں گے پپا!" کھانا کھاتے ہوئے اچانک ایمن کو اپنی فرینڈز کے ساتھ ڈسکس کیا گیا' آج کل کا سب سے بڑا مسئلہ یاد آگیا تھا' سو فوراً" بے قراری سے پوچھنے لگی۔

"جہاں ایمن کہے گی' وہیں جائیں گے۔" عمر کسی نہ کسی طور ایمن کا دل رکھ ہی لیتا تھا۔

"ایمن کو چھٹیوں کے یہ تین مہینے چڑیا گھر بھجوا دیں' یہ اپنے فرینڈز کے ساتھ خاصا انجوائے کرے گی۔" عروسہ نے اس کی ننھی سی ناک دبا کر چھیڑا۔

" ZOO میں آپ کے بھی تو فرینڈز رہتے ہیں۔" وہ بھی تو ایمن تھی' بلا کی حاضر جواب۔

"بہت بولنا آگیا ہے تمہیں۔" عروسہ نے اس کے گال زور سے کھینچے تھے' ایمن بلبلا کر رہ گئی۔

"عروسہ گندی ہیں۔"

"ایمن تو بڑی اچھی ہے۔" عروسہ نے طنزیہ کہا۔ "سوائے ٹھنکنے کے اور کوئی کام نہیں۔"

"اور عروسہ کو باتیں بنانے کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا۔"

ان دونوں کی ہمیشہ والی تکرار شروع ہو گئی تھی۔ جس سے عمر خاصا چڑتا تھا۔ اسی وجہ سے آئے دن عشوہ کی

سختی آئی رہتی تھی کہ ایمن اور عروسہ چونچیں لڑانے سے باز نہیں آتی تھیں اور سارا قصور عشوہ کی تربیت کے کھاتے میں لکھ دیا جاتا' حالانکہ یہ تو ان کی معصومانہ سی لڑائیاں تھیں۔ جن کا آغاز ہمیشہ عروسہ کی طرف سے ہی ہوتا تھا' مگر عمر سے ڈانٹ کے وقت وہ صاف بچ جایا کرتی تھی۔

"ایمن صاحبہ! آپ موضوع سے ہٹ رہی ہیں۔" عروسہ سے بات نہیں بن پائی تھی۔ اپنی کام چوری کے متعلق وہ زیادہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ "آپ سمر ویکشنز کے بارے میں گفتگو فرما رہی تھیں۔"

"تو اور کیا۔" وہ پھر لاڈ سے عمر کے ساتھ چپکی۔ "پاپا! ہم چھٹیاں گزارنے کہاں جائیں گے۔ نہ ہماری نانو ہیں' نہ نانا ہیں' نہ دادو' نہ دادا... ماموں ہیں تو اتنی دور' ان کے پاس ہم جا نہیں سکتے۔ پھر ہم کہاں جائیں؟ ہماری ساری فرینڈز اپنی آنٹیز اور نانو کے گھر جائیں گی۔"

"ہم آپ کو مری لے چلیں گے... پورے ون منتھ کے لیے۔ اب خوش؟" ایسی فیاضی وہ ایمن کے لیے کبھی کبھی دکھا ہی دیتا تھا۔

"تھینکس پپا!" ایمن خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ اور اسی پرجوش انداز میں عموریہ سے چپک رہی تھی' جب عمیمہ کی ٹھہری ٹھہری سنجیدہ سی آواز سن کر چپکی رہ گئی۔

"ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ماما کیسے جائیں گی؟"

"عشوہ جی کو کون سا ڈر لگے گا اور پھر بھابھی بیگم اور غوثیہ آنٹی (نوری کی امی) ہیں نا۔ کیوں عمر بھائی!" عروسہ کے بھی دل کی مراد گویا بر آئی تھی۔ سو وہ بھی خوب جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی تھی اور دل ہی دل میں فرینڈز پر دھاک بٹھانے کے بھی پروگرام بنائے جا رہے تھے۔ وہ کافی شوخ طبیعت کی مالک تھی۔ ملنے گلنے کی شوقین' گھومنے پھرنے کی دلدادہ۔ عمیمہ کو اچانک ہی عشوہ کی موجودہ حالت کا خیال آیا تھا۔ اسی لیے بچیوں کو فی الحال اس نے ٹال دیا۔

"ہم اگلے سال مری چلیں گے... کیوں پاپا!" وہ اپنی پلیٹ صاف کر چکی تھی۔ اب نیپکن سے ہاتھ صاف کر رہی تھی' مگر اس کی ساری توجہ باپ کی طرف تھی۔ عمر نے عمیمہ کی طرف دیکھ کر سر ہلا دیا۔

"نہیں! ابھی جانا ہے' اگلا سال بہت دور ہے۔" ایمن نے بچوں جیسے ضدی پن سے کہا۔

"ایمن! خاموشی سے کھانا کھاؤ' ورنہ بہت مار پڑے گی۔" عشوہ کو بولنا ہی پڑا تھا۔ وہ صاف محسوس کر رہی تھی کہ ایمن کے علاوہ عروسہ کو بھی اگلے سال تک کے پروگرام پر سخت تاؤ آیا تھا۔ اس نے کھانا ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر اٹھ کر چلی بھی گئی۔ جبکہ عموریہ اور عمیمہ برتن سمیٹنے لگی تھیں۔ وہ معمول کے کام ختم کر کے کھڑکیاں' دروازے اچھی طرح سے لاک کرنے کے بعد دودھ کا گلاس لے کر اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔



وہ بیڈ روم میں آئی۔ عمر آفس کے کام میں مصروف تھا۔ عشوہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد معمول کی تسبیحات پڑھ کے واپس آئی۔ عمر نے اپنا کام سمیٹ لیا تھا اور اب ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ دودھ کا گلاس بھی خالی ہو چکا تھا۔ سو پہلے وہ خالی گلاس اٹھا کر کچن میں دھو کر رکھ آئی۔ رات کو گندے برتن رکھنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ بہت چھوٹی عمر سے ہی دادی اماں نے اسے گر کی باتیں گرہ میں بندھوا دی تھیں۔ یہاں آکر بھی اس نے اپنا معمول ترک نہیں کیا تھا اور کلثوم کو اس کی یہی عادتیں پسند تھیں۔ کلثوم کو کبھی اسے ٹوکنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ وہ سارا سلیقہ اور قرینہ اپنی دادی اماں سے وراثت میں لے کر آئی تھی۔ کلثوم جب تک زندہ رہی تھیں' اس سے ہمیشہ خوش رہیں۔

"آپ بچیوں کو جھوٹا لارا مت لگایے گا۔ ان کی چھٹیاں تو کچھ دنوں تک شروع ہو جائیں گی' مگر ظاہر ہے' میں سفر نہیں کر سکتی فی الحال... عید کی چھٹیوں

میں بھی جانا ناممکن ہے' پھر کبھی سہی' گھومنا' پھرنا اتنا ضروری بھی نہیں۔"

"تو میں کون سا تمہیں ہنی مون پر لے جانے کے لیے تیار بیٹھا ہوں۔" مجال ہے جو عمر کبھی دل رکھنے کی بات کرے۔

"پندرہ سال بعد مجھے ہنی مون پر جانے کا کوئی شوق بھی نہیں' جب وقت تھا' تب لے کر نہیں گئے۔" شکوہ لبوں سے پھسل ہی گیا تھا۔ اگرچہ عشوہ نے فوراً" لب بھینچ لیے تھے' مگر کمان سے نکلا تیر بھلا واپس آسکتا تھا۔ عمر نے ایک مرتبہ پھر سے گردن موڑلی۔

"یہ بھی میرا ہی قصور ہے؟" عمر نے طنزیہ نظروں سے اسے گھورا۔ "جب بھی کہیں آنے جانے کا پروگرام بنانے کا ارادہ ہوتا' کبھی عمیمہ بیمار ہوجاتی' کبھی عموریہ کو نمونیہ ہوجاتا اور کبھی ایمن کے آنے کی تیاریاں۔"

"نہیں جی! آپ بھلا کیونکر قصوروار ہیں' سارے فساد کی جڑ تو میں ہوں۔" اس نے لوشن کی بوتل کو زور سے ڈریسنگ پر پٹخا۔

عمر ایک دفعہ پھر چینل سرچنگ میں مصروف ہوگیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریموٹ کو قبضے میں کرلیا۔

"پہلے میری بات سن لیجئے! مجھے سونا ہے۔ آپ بے شک پوری رات بیٹھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرتے رہیے گا۔"

"سونے کے علاوہ تو تمہیں کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔" وہ اس کے ہاتھ سے ریموٹ لینا چاہتا تھا' مگر عشوہ نے غصہ کے مارے ریموٹ تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ دن بھر ایک پل کے لیے بھی کمر نہیں ٹکا سکتی تھی۔

عشوہ اس الزام پر تڑپ اٹھی تھی۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی' صبح چار بجے کی اٹھی ہوئی رات گیارہ بجے بھی نہ سوتی۔

"یہ تم عورتوں کا ایک بڑا ہتھیار ہے' تھک گئے' ٹوٹ گئے' مرگئے۔"

عمر تکیے کے نیچے سے ریموٹ نکال ہی چکا تھا۔ اور ایک دفعہ پھر سے عمر کو ٹی وی کی طرف متوجہ ہوتا دیکھ کر عشوہ تپ اٹھی۔

☼ ☼ ☼

جوں جوں اس کے دن قریب آرہے تھے' عمر کا موڈ بھی بگڑتا جارہا تھا۔ اس کی طبیعت کی بے زاری نے عمر کو بھی خاصا بے زار اور چڑچڑا کردیا تھا۔ طبیعت کے بوجھل پن کی وجہ سے عشوہ پر عجیب سی سستی طاری رہتی تھی اور نیند بھی ہروقت حاوی رہنے لگی تھی۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوپاتا تھا' سو عمر کا غصہ کرنا بھی بنتا تھا۔ انہی بوجھل اور اداس دنوں میں بچیوں کی چھٹیاں ہوگئی تھیں اور عشوہ کا بوجھ خود بخود بٹنے لگا تھا۔ عمیمہ اور عموریہ دونوں مل کر صفائی ستھرائی بھی کرلیتی تھیں۔ برتن بھی دھودیتی تھیں۔ کپڑے اگرچہ عشوہ کو خود دھونے پڑتے تھے۔ تاہم استری عمیمہ کرلیتی۔ حتیٰ کہ سبزی وغیرہ بھی بنادیتی۔

بھابھی بیگم عمیمہ اور عموریہ کو خاصی ذمہ داری سے کام کرتے دیکھ کر بے حد خوش ہو کر عشوہ سے کہتی تھیں۔ "دیکھو! اللہ نے بیٹیاں دی ہیں تو آج انہوں نے بوجھ بھی تو بانٹ لیا ہے نا۔"

اس دن عشوہ نے کالے چنے صبح سے بھگو دیے تھے' تاکہ پکانے سے پہلے کچھ نرم ہوجائیں اور خود وہ کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی تھی۔ مگر اس کمبخت نیند نے برے وقت میں حملہ کردیا تھا۔ جب وہ اٹھی تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ عشوہ کے تو مارے خوف کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ عمر بس آنے ہی والا تھا' بلکہ آچکا تھا۔ لاؤنج میں سے عمر کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں اور کچن میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر اس وقت وہ کسی ہوٹل سے کھانا منگوانے کی بات کر بھی لیتی تو عمر نے زمین آسمان ایک کردینا تھا۔

"سارا دن بستر توڑتی ہو۔۔۔ اور کوئی کام نہیں ہوتا' پھر بھی لنچ تک تیار نہیں ملتا۔ آئندہ آفس سے اٹھ کر نہیں آؤں گا۔"

وہ جانتی تھی۔ اس کا تھوڑی دیر آنکھ لگ جانے والا گناہ کم از کم آج کی تاریخ میں معاف نہیں ہوگا۔

لرزتے قدموں سے جوں ہی وہ باہر آئی' اسے باہر کا ماحول دیکھ کر خاصا جھٹکا لگا تھا۔ وہ سب لاؤنج میں کارپٹ پر بیٹھے تھے۔ عمیمہ نے دسترخوان چن کر کھانا لگا رکھا تھا۔ وہ دو قدم چل کر مزید آگے آئی تو عمر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شام تک سوتے رہنا تھا' اب تم کچن سے ریٹائرڈ ہوجاؤ عشوہ! دیکھو تو عمیمہ نے یہ قورمہ اور چاول بنائے ہیں۔ اور اللہ کی قسم! اتنے ٹیسٹی ہیں کہ میاں جی کے ریسٹورنٹ کا قورمہ یاد آگیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا' عمیمہ اتنی اچھی کوکنگ بھی کرسکتی ہے۔"

عمر نے عمیمہ کے ماتھے پر بوسہ دے کر ایسے بے ساختہ انداز میں تعریف کی تھی کہ عمیمہ کے ساتھ عشوہ بھی اندر تک مسرور ہوگئی۔ بھلا آج تک عمر نے کب کسی کی تعریف کی تھی۔ ہاں! نقص نکالنے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ عشوہ نے قورمہ اور چاول چکھے تو واقعی عمر کی بات پر یقین آگیا۔ عمیمہ نے فرسٹ ٹائم بغیر کسی سے پوچھے اتنا اچھا کھانا بنالیا تھا۔ سو عشوہ کا ماں ہونے کے ناتے سیروں خون بڑھ گیا۔

"قورمہ کیسے بنایا ہے بیٹا!" وہ عمیمہ کے قریب ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ماما! دادی بیگم سے پوچھ کر آئی تھی۔" عمیمہ کو جھوٹ بولنا مناسب نہیں لگا تھا۔ سو اس نے سچ بتادیا۔

"پھر بھی دیکھو عشوہ! فرسٹ ٹائم اس نے قورمہ بنایا ہے اور وہ بھی اتنا خوش ذائقہ۔" عمر سارا کریڈٹ اپنی بیٹی کو ہی دینا چاہتا تھا۔ عمیمہ بہت خوش بھی تھی اور اپنی تعریف پر شرما بھی رہی تھی۔

"پاپا! میں نے ہیلپ کروائی تھی۔ پیاز میں نے کاٹی' اتنے آنسو آئے تھے' اور مرچیں بھی میں نے کاٹی تھیں۔ ابھی تک انگلیوں پر لگ رہی ہیں اور باقی سب اپیا نے کیا۔ روٹی بھی اپیا نے بنائی۔" عموریہ بھی ٹھنک کر کچھ تعریف وصولنا چاہتی تھی۔ عمر نے بھی پھر تعریف کرنے میں کنجوسی نہیں کی تھی۔ یہ ساری کنجوسیاں صرف عشوہ کے لیے تھیں۔

"تب ہی میں کہوں' سبز مرچ اور پیاز میں الگ سا ٹیسٹ کیوں محسوس ہورہا ہے۔" عمر آج واقعی موڈ میں لگ رہا تھا۔ ویسے بھی بادشاہ سلامت کے موڈ بدلنے کا پتا نہیں چلتا تھا۔

"تو پھر آئس کریم تو پکی ہوئی۔" عموریہ کھانے' پینے پر تو مرتی تھی۔

"بالکل پکی۔" عمر نے انہیں بے طرح۔۔۔ خوش کردیا تھا۔

"پپا جان! ہم بھی ایک بات سوچ رہے ہیں۔" ایمن نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد بڑے مدبرانہ انداز میں کہا تھا۔

"کون سی بات؟"

"ہم سوچ رہے ہیں کہ کوئی ڈش بنانا سیکھ لیں' تاکہ آپ ہماری بھی تعریف کریں۔" اس نے گال پر انگلی رکھ کر اتنے بے ساختہ انداز میں کہا تھا کہ عشوہ اور عمر ایک ساتھ ہنس پڑے۔

"ہم آپ کی ویسے ہی تعریف کردیتے ہیں شہزادی عالیہ! آپ کچن کو رونق بخش کر اپنی ننھی سی جان پر ظلم مت کیجئے گا۔" عمر نے ایمن کی ننھی سی ناک دبا کر کہا۔ وہ ہنس پڑی۔

عشوہ نے مسکراتے ہوئے بلا ارادہ ہی عروسہ کی طرف دیکھا تھا اور اس کے چہرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ عجیب کھوئی کھوئی سی کیفیت طاری تھی اس پر۔ یوں لگتا تھا کہ وہ یہاں موجود ہونے کے باوجود بھی موجود نہیں ہے۔ کسی اور جہاں' کسی اور نگر میں محو پرواز ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سوچ کی پرچھائیاں تھیں' نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی' کس خیال میں تھی۔

عشوہ کو اس کا کھویا کھویا سا انداز بہت عجیب لگ رہا تھا۔ تاہم اس وقت اس نے اسے ٹوکنا یا بلانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی عشوہ نے بہت دفعہ اسے خاموش خاموش اور کھویا کھویا پایا۔ آج کل ایمن کے ساتھ اس کی کھٹی میٹھی لڑائیاں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔

عروسہ کی بھی چھٹیاں ہوچکی تھیں۔ مگر ان دنوں وہ

گھر میں ہونے کے باوجود گویا گھر میں نہیں تھی۔ اس کا سارا دن نوری کے گھر میں گزرتا تھا۔ جبکہ عشوہ چاہتی تھی کہ ان دنوں وہ بھی کچھ گھرداری سیکھ لے یا پھر کسی ٹریننگ سینٹر سے کوکنگ بیکنگ کا کورس وغیرہ کرلے۔ اس کا ارادہ تھا کہ عروسہ کے ساتھ عمیمہ کو بھی دو، تین گھنٹے کے لیے بھیج دیا کرے گی۔ جب اس نے عروسہ سے یہی بات کی تو وہ بےزاری سے بولی۔

"موڈ نہیں بن رہا بھابھی! ابھی فی الحال ریسٹ کرنے کا ارادہ ہے۔ ابھی تو کالج سے جان چھوٹی ہے۔"

"دو، تین گھنٹے کی تو بات ہے۔" عشوہ اسے ہر صورت قائل کرنا چاہتی تھی۔

"عمر بھائی مان جائیں گے؟"

"میں ان سے بات کرلوں گی۔" عشوہ مطمئن تھی۔

"تو پہلے بات کرلیں، عین ممکن ہے کہ وہ انکار کردیں۔" عروسہ کا انداز کچھ استہزائیہ سا تھا۔ عشوہ کو برا لگا۔

"میں نے پچھلے سال بھی تمہارے لیے ان سے بات کی تھی۔ اس کام کے لیے وہ اعتراض ہرگز نہیں کریں گے۔"

"پھر بھی... آپ کے مجازی خدا کا مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی۔" عروسہ ایک میگزین کی ورق گردانی کررہی تھی، مگر اس وقت بھی عشوہ پورے یقین سے کہہ سکتی تھی کہ عروسہ ذہنی طور پر یہاں حاضر نہیں تھی۔ وہ اس کی باتوں کے جواب بغیر سوچے سمجھے دے رہی تھی۔

"دیکھو بیٹا! اگلے گھر بھی جانا ہے۔ یہیں تو نہیں بیٹھے رہنا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اپنی ماں نہیں تھی تو بچی کو کچھ سمجھایا، سکھایا بھی نہیں۔" عشوہ نے مشین لگا رکھی تھی۔ مشین کا بزر بجا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ کپڑے نکال کر کھنگالنے، نچوڑنے کے بعد الگنی پر پھیلا کر وہ واپس آئی تو عروسہ ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ اب کے عشوہ سچ مچ ٹھٹک گئی۔ نہ جانے کیا مسئلہ تھا۔ اسے کیا پریشانی تھی؟ آج سے پہلے عشوہ اسے یوں گم صم دیکھ کر جھجکی تو ضرور تھی۔ تاہم اس نے اس قدر سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا تھا۔ مگر اس وقت تو وہ خاصی پریشان ہوگئی تھی۔ تبھی اس کے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"میں تمہیں کچھ دنوں سے کافی پریشان دیکھ رہی ہوں۔ اگر کوئی پرابلم ہے تو شیئر کرلو۔" عشوہ کے لہجے میں ہمیشہ والی نرماہٹ تھی۔ عروسہ کچھ اور گھبرا گئی۔

"نہیں بھابھی! پرابلم کیسی۔"

"پھر اتنی چپ چپ کیوں ہو؟"

"آپ کو ایسا فیل ہوتا ہے، میں تو پہلے کی طرح ہوں۔" اس نے مصنوعی بشاشت کا مظاہرہ کیا۔ مگر عشوہ بچی تو نہیں تھی جو بہل جاتی۔

"عروسہ! اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتا دو۔ میں تمہاری ماں، بہن، بھابھی سب کچھ ہوں، کیا پتا تمہاری پریشانی دور کردوں۔"

"آپ مجھ پر شک کررہی ہیں؟" عروسہ کو غصہ آگیا۔

"اب بات کو غلط رنگ مت دو۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟" عروسہ چڑ گئی۔

"اعتماد کیوں نہیں، مگر نہ جانے کیوں دل کو دھڑکا لگا رہتا ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

"چلو! نہیں بتانا چاہتیں، تمہاری مرضی۔ کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ سلاد بنالو۔ اس طرح خاموش خاموش بیٹھو گی، پھر تو میں چونکوں گی ضرور۔" عشوہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

بڑے دن ہوئے تھے بھابھی بیگم نے چکر نہیں لگایا تھا اور نہ ہی نوری یا پھر غوثیہ باجی ادھر آئی تھیں۔ عشوہ سوچ رہی تھی کہ کسی دن وقت نکال کر غوثیہ باجی کی خیریت معلوم کر آئے گی۔ غوثیہ باجی بھابھی بیگم کی دوسرے نمبر والی بہو تھیں۔ ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ ان کا بیٹا عمر، نوری اور شوزی سے

بڑا تھا۔ آج وہ ناشتے کے ساتھ ہی کچن کا کام سمیٹنے کے بعد سالن بھی پکانے لگی تھی' جب عمیمہ بھی چپکے سے آگئی۔

"ماما! میں سالن بنالیتی ہوں۔"

"نہیں بیٹا! تم کچھ دیر بیٹھ کر پڑھ لو۔ اگر ہوم ورک کرنا ہے تو کرلو' بس چکن تو پکانا ہے' فٹافٹ بنالوں گی۔" وہ پیاز کاٹ رہی تھی۔ عمیمہ لہسن اٹھالائی۔

"میں لہسن چھیل دوں۔ سنا ہے لہسن چھیلنے سے نیل بھی مضبوط ہوتے ہیں' ان میں چمک بھی آجاتی ہے۔" عشوہ مسکرادی۔

"میری خواہش آپ جانتی ہیں بھلا کیا ہے؟" وہ نفاست سے لہسن چھیلتے ہوئے بولی۔ عشوہ نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"کیا؟"

"آپ کی ساری خوبیاں میں چرالینا چاہتی ہوں۔" عمیمہ نے ایک بہت انوکھی بات کہہ دی تھی۔ وہ کچھ پل کے لیے تو بیٹی کا چہرہ دیکھتے ہوئے ساکت ہوگئی۔

"مجھ میں بھلا کون سی خوبی ہے؟" وہ سنبھل کر گویا ہوئی۔ عمیمہ کی اس عجیب سی خواہش نے اسے بے حد حیران ہی تو کردیا تھا۔

"آپ میں اتنی خوبیاں ہیں جن کا کوئی حساب نہیں۔ ہم پراؤڈ فیل کرتے ہیں کہ آپ ہماری ماں ہیں۔ ہماری فرینڈز آپ کو اور پاپا کو دیکھ کر رشک کرتی ہیں۔ آپ ساری دنیا کی ماؤں سے زیادہ سویٹ ہیں ماما!" عمیمہ نے بے حد بے ساختگی کے عالم میں اس کے رخسار چوم لیے۔ اس والہانہ انداز نے عشوہ کی آنکھوں کو پرنم کردیا تھا۔

"ہر بچہ اپنی ماں کے لیے ایسے ہی محسوسات رکھتا ہے میری جان!" وہ اس کے گال چوم کر اٹھ گئی۔

"اس بات سے انکار نہیں' میں مانتی ہوں' مگر آپ پھر بھی بہت سویٹ ہیں۔" عمیمہ نے لہسن چھیل لیے تھے۔ اب وہ ڈھیروں سرخ سرخ ٹماٹر کاٹنے لگی تھی۔ اسی پل عروسہ نے کچن میں جھانکا۔

"بھابھی! میں نوری کی طرف جارہی ہوں' کھانا ادھر ہی کھالوں گی۔ ایمن کو میرے پیچھے نہ بھیجئے گا۔" وہ چلی بھی گئی' جبکہ عشوہ اسے پکارتی رہ گئی۔

"عمر خفا ہوں گے عروسہ! واپس آجاؤ' یہ کون سا وقت ہے کسی کے گھر جانے کا' لوگ اپنے کام کاج میں مصروف ہیں۔ بھلا نوری ہمارے گھر دو دو' تین تین چکر لگاتی ہے کیا؟" عروسہ بھلا تھی کہاں' جو اس کی تقریر کا جواب دیتی۔ وہ پیاز گولڈن کرتے ہوئے مسلسل بڑبڑاتی رہی تھی۔

"میں روٹی بناؤں؟" عمیمہ اب فریج سے آٹے کا پیالا نکال رہی تھی۔

"نہیں! میں کرلوں گی' تم اب جاؤ۔" اس نے زبردستی عمیمہ کو کچن میں سے باہر نکالا تھا۔

اس نے کھانا بناکر میز پر لگادیا تھا اور پھر خود نہانے چلی گئی۔

ابھی تک عمر آفس سے نہیں آیا تھا۔ وہ لنچ کے لیے لازمی گھر آتا تھا۔ مگر اس وقت گھڑی کی سوئیوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر عشوہ سے رہانہ گیا تو ایمن سے بولی۔

"جاؤ! عروسہ کا موبائل لے کر آؤ۔ عمر کو کال تو کروں۔ ابھی تک نہیں آئے۔"

"اپنا سیل عروسہ ساتھ لے گئی ہے۔" ایمن نے کارٹون دیکھتے ہوئے بتایا۔ عشوہ جھنجلا کر فون اسٹینڈ تک آئی تھی۔

"پڑوس میں جانا تھا۔ موبائل ساتھ لے کر جانے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے عمر کے نمبر پر کال کی تھی۔ تقریباً" چوتھی بیل پر عمر نے کال ریسیو کی۔

"خیریت؟" وہ کچھ جلدی میں تھا۔ اسی لیے چھوٹتے ہی بولا۔

"آپ لنچ کے لیے نہیں آئے؟"

"آج نہیں آسکوں گا۔ آفس میں کچھ کام ہے۔" اس نے مصروف سے انداز میں بتایا۔ "بچیوں نے کھالیا؟"

"نہیں! آپ کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔" عشوہ نے وضاحت کی۔ ایمن تو بالکل بھی عمر کے بغیر کھانا

نہیں کھاتی تھی اور اس بات سے عمر اچھی طرح آگاہ تھا۔

"احمق عورت! انہیں ابھی تک بھوکا بٹھا رکھا ہے۔" حسب معمول عمر کو غصہ آگیا۔

"آپ کو خبر تو ہے' ایمن آپ کے بغیر کھانا نہیں کھاتی۔" اس کا غصہ اس نے شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اتارلیا۔

"ابھی میں نہیں آسکتا۔ بچیوں کو کھانا کھلادو۔"

"آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟" عشوہ نے اس کی مصروفیت کے پیش نظر جلدی سے پوچھا۔

"بیس منٹ کی بریک ہوئی ہے۔ ابھی بس کھانے ہی لگا ہوں۔"

"اچھا! پھر اللہ حافظ۔" عشوہ نے فون رکھنے سے پہلے ویٹر کی آواز کے ساتھ کچھ اور بھی آوازیں سنی تھیں۔ زنانہ اور مردانہ آوازیں۔ شاید عمر اپنے اسٹاف کے ساتھ کسی ہوٹل میں موجود تھا۔ سو عشوہ نے فون رکھ کر کھانا لگانا شروع کردیا۔

بچیاں کھانا کھاچکی تھیں۔ عمیمہ نے برتن بھی سمیٹ لیے تھے۔ سو عشوہ ظہر کی نماز ادا کرنے لگی۔ معمول کی تسبیح' تلاوت کے بعد وہ اٹھ کر باہر آئی۔ بچیوں کے کمرے میں جھانکا تو تینوں کو سوتا پاکر وہ عروسہ کے کمرے میں آگئی۔ وہ ابھی نوری کے گھر سے نہیں آئی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ بیرونی گیٹ بند کرکے بھابھی بیگم کی طرف آگئی۔ بھابھی بیگم اپنے مخصوص تخت پر بیٹھی تھیں۔ عشوہ کو دیکھ کر گویا کھل اٹھیں۔

"میری بیٹی کیسے راستہ بھول آئی ہے؟"

"راستہ تو اچھی طرح سے یاد ہے بھابھی بیگم! مگر فرصت کا لمحہ بھر میسر نہیں۔" وہ ان کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گئی۔

"یہ تو ٹھیک کہا۔" انہوں نے فوراً" تائید کی تھی۔ "عروسہ بھی تو ابھی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتی۔ بچیوں کے ساتھ چوتھی بچی بن جاتی ہے۔"

"کام تو کافی بٹ گیا ہے۔ عمیمہ اور عموریہ خاصا خیال رکھتی ہیں۔ بس طبیعت کے بوجھل پن کی وجہ سے میں گھر سے نکل نہیں پاتی۔" اس نے سادگی سے وضاحت کی۔

"ماشاءاللہ عمیمہ بہت سمجھ دار ہے۔" غوثیہ باجی کچن سے نمودار ہوئی تھیں۔ کچھ خفا خفا سی دکھائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئیں۔ عشوہ نے بھی ان کے رویے پر زیادہ غور و فکر کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ورنہ غوثیہ باجی کے تیور دیکھ کر ٹھٹک ضرور جاتی کہ ان کی پیشانی پر خاص ناگواری سی سلوٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اور وجہ نجانے کیا تھی۔ اگر وہ غور کرتی تو پھر وجہ ڈھونڈنے کا خیال بھی آتا۔

"بہت دن ہوئے ہیں۔ آپ نے چکر نہیں لگایا؟" عشوہ بھی شکوہ کیے بغیر نہیں رہ پائی تھی۔

"بس بیٹی! کچھ گھریلو پریشانی تھی۔ دل ہی نہیں مانتا کہیں آنے جانے کو۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"کیسی پریشانی؟" عشوہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"نوری کے رشتے کی کہیں بات نہیں بن پارہی۔ بس اسی وجہ سے خاص پریشانی ہے۔" انہوں نے صاف صاف بتادیا تھا۔ "آج کل لوگ بس اچھی شکل پر مرمٹتے ہیں۔ اخلاق' تمیز' خلوص سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔"

"نوری کی بات ایک جگہ چل رہی تھی؟"

"جواب دے دیا ہے ان لوگوں نے۔ انہیں کوئی اونچی' لمبی' گوری چٹی لڑکی پسند آگئی تھی۔" وہ بجھے بجھے لہجے میں بولی تھیں۔ "اب اپنی عروسہ کو ہی دیکھ لو! ابھی بات چلاؤ۔ دس رشتے آپڑیں گے۔ بس جی' اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے۔"

"اللہ بہتر کرے گا بھابھی بیگم! آپ فکر نہ کریں۔ جو کوئی اس کے جوڑ کا ہوگا۔ راستے بدل بدل کر ادھر آنکلے گا۔" اس نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"پوتیوں کی فکر نے آنکھوں سے نیندیں چرالی ہیں۔ غوثیہ بھی کچھ پریشان ہے۔ اوپر سے بیٹا بھی مانو ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔" ان کی مبہم سی بات عشوہ کے

پلے نہیں پڑی تھی۔

"نوری کہاں ہے؟" اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ عروسہ بھی تو نظر نہیں آرہی تھی۔

"میرے کپڑے سلائی کررہی تھی۔ ابھی سونے کے لیے اٹھی ہے۔ میں نے سوچا، کچھ آرام کرلے۔ سویرے کی مشین کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔" بھابھی بیگم نے ململ کے دوپٹے سے سر لپیٹتے ہوئے بتایا۔

نوری بے حد سلیقہ مند، سگھڑ اور گھر گرہستی کو سنبھالنے والی لڑکی تھی اور کچھ بھابھی بیگم کے زیر تربیت اور بھی ہر فن میں طاق ہوگئی تھی، مگر یہ دنیا اور اس کے "معیار" پر پورا اترنا کہاں آسان تھا۔ وہ خود کو ہی اگر دیکھ لیتی تو حیران ہوجاتی۔ صورت، سیرت میں بے مثال، ہر فن میں طاق، ہر کام میں ماہر، بس تعلیم کے معاملے میں کمی رہ گئی تھی اور یہ کمی گویا اس کی پوری زندگی پر محیط ہوگئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اگر تعلیم یافتہ ہوتی تو ضرور عمر کے دل پر راج کرتی۔ بس اسی ایک کمی کی وجہ سے وہ خود کو ان چاہی تصور کرتی تھی۔

اور ادھر نوری میں بھلا کیا کمی تھی۔ اچھے تعلیمی ادارے سے پڑھ رہی تھی۔ سلیقہ مند، سمجھ دار۔ بس رنگ روپ میں خاصی کم تھی اور اسی وجہ سے ٹھکرائی جارہی تھی۔ عشوہ بس تاسف سے سوچتی رہ گئی۔

"عروسہ کیا کررہی ہے؟ آج صبح کا اس نے چکر نہیں لگایا؟" بھابھی بیگم، عروسہ کا پوچھ رہی تھیں جبکہ اس کا دل تو گویا دھک سے رہ گیا۔

"کیا مطلب؟ عروسہ یہاں نہیں آئی؟" وہ گویا پوری جان سے کانپ کر رہ گئی، مگر بھابھی بیگم پر کچھ ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ البتہ اس کے پورے وجود پر عجیب سی بے چینی چھاگئی تھی۔ دل تھا کہ فکر کے مارے سینے میں قلابازیاں کھا رہا تھا۔

"عروسہ یہاں نہیں آئی تو پھر کہاں گئی ہے؟" اس کا بس نہیں چل رہا تھا گویا سر پر پیر رکھ کر بھاگ نکلتی اور کہیں سے بھی اسے ڈھونڈ کر گھر لے آتی۔

"یا اللہ! میں کیا کروں؟ عمر تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ عروسہ اتنے گھنٹوں سے کہاں غائب ہے؟"

وہ بھابھی بیگم سے معذرت کرکے اٹھ آئی۔ گھر آکر اس نے عروسہ کے نمبر پر کئی مرتبہ ٹرائی کیا، مگر فون بھی بند تھا۔ پھر اس نے فرداً "فرداً" اس کی ساری سہیلیوں کے گھر فون کیے۔ مگر وہ نجانے کہاں تھی؟ بغیر بتائے کدھر چلی گئی تھی؟

جوں جوں وقت آگے گزر رہا تھا۔ عشوہ کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ دل تھا کے اندیشوں میں گھرا اور بھی سہما رہا تھا۔ اپنی اس پریشانی کو وہ بھابھی بیگم سے بھی شیئر نہیں کرسکی تھی۔ بھلا انہیں بتاتی بھی کیا؟ وہ عروسہ کے بارے میں کیا سوچتیں۔ گھر کی بات گھر سے باہر نکل جاتی تو پھر کیا عزت رہ جاتی۔

سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی چولیں ہلنے لگی تھیں۔ پریشانی کے مارے چکر آرہے تھے۔ تنگ آکر اس نے عمر کے موبائل پر کال کردی تھی مگر عمر کا نمبر بھی آف جارہا تھا۔ وہ پھر سے عروسہ کے نمبر پر ٹرائی کرنے لگی۔ اب وہ کبھی عروسہ کو کال کرتی تھی اور کبھی عمر کو۔ ہر تین منٹ بعد وہ یہی عمل دہرا رہی تھی۔ ایک بار، دوبار، بار بار، کئی بار۔ بس ایک ہی ٹیپ شدہ جواب "مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہورہا۔" عشوہ کی تو گویا جان نکلی جارہی تھی۔ نمبر ڈائل کرکرکے اس کی انگلیاں گھسی جارہی تھیں۔ خوف کے مارے دل بند ہونے کے قریب تھا۔ جب اس کے وحشت زدہ دل میں ایک وسوسہ بالکل اچانک بیدار ہوگیا۔ اس وسوسے کے نمو پاتے ہی گویا عشوہ پورے قد سے ڈھے گئی تھی۔

"کیا عمر اور عروسہ ایک ساتھ ہیں؟ دونوں گھر نہیں آئے۔ دونوں کے نمبر آف ہیں؟ دونوں سے بات نہیں ہو پارہی؟ کیا یہ سچ ہے؟" اس کی ناگن جیسی سوچوں نے گویا اسے ہی ڈس لیا تھا۔ وہ ایک دم نیل نیل ہوگئی تھی۔

"کیا یہ سچ ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟" یہ سوال اسے کوڑوں کی طرح لگ رہا تھا۔ اور ہر کوڑے کی ضرب اسے کراہنے اور چلانے پر مجبور کررہی تھی، مگر وہ کسی

پتھر کی مورت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ گویا اس کے وجود میں جان تک باقی نہیں تھی۔ وہ سانس تک نہیں لے رہی تھی۔ اس کی دھڑکنیں تک خاموش تھیں، مگر وہ پھر بھی زندہ تھی۔ حالانکہ زندہ رہنے کو دل اب آمادہ بھی نہیں تھا، مگر پھر بھی اسے زندہ رہنا تھا۔ اپنے ساتھ اس عظیم دھوکا دہی کے مرتکب لوگوں کے گریبان تک پہنچنا تھا۔ وہ ایسے منظر سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس طرح دنیا سے پردہ پوش نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنے مجرموں کی ہر حال میں رسوائی چاہتی تھی اور اس کے لیے عشوہ عمر کا زندہ رہنا ضروری تھا۔

اور جب وہ ان زہر آلود سوچوں کے سمندر میں غرق ہوتی مایوسی کی آخری حد تک پہنچی ہوئی تھی تب بہت چپکے سے عروسہ اس کے قریب آرکی۔

"بھابھی...!"

"تم..." عشوہ کے لہجے میں عجیب سی پھنکار تھی۔ "کہاں گئی تھیں تم؟"

وہ گویا بل کھا کر اٹھی۔ غصے اور توہین کے احساس نے عشوہ کے حواس چھین لیے تھے۔ وہ عروسہ کا خوب صورت چہرہ نوچ لینا چاہتی تھی، مگر ایک دم گویا اس کی تمام تر ہمتیں کسی نے سلب کرلی تھیں۔ اس سے بولا ہی نہ گیا۔ کچھ پوچھا ہی نہ گیا۔ وہ بس ٹکر ٹکر عروسہ کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ حالانکہ وہ ایک پورا پرچہ تیار کیے بیٹھی تھی۔ مغلظات کا ایک طوفان اس کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، مگر اس کے ہونٹ گویا کسی نے سوئی کے ساتھ بے دردی سے سی دیے تھے۔

"میں اپنی ایک دوست کے گھر گئی تھی۔" اس کے لہجے کی کپکپاہٹ میں جھوٹ صاف عیاں تھا۔

"تم... تم جھوٹ بول رہی ہو۔" عشوہ نے بمشکل بولنا چاہا تھا مگر بول نہیں پائی۔ دکھ، صدمہ، درد اور نجانے کون کون سی منزل سے وہ اس پل گزر رہی تھی۔ مان ٹوٹا تھا یا اعتبار ٹوٹا تھا۔ تاہم اس کا دل پاش پاش ضرور ہوچکا تھا۔

"بھابھی پلیز!" وہ ہاتھ اٹھا کر تلخی سے بولی۔ "میرے سچ اور جھوٹ سے آپ کو کیا لینا دینا ہے۔ میرے معاملات میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ رکھائی سے کہہ کر اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔ عشوہ کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اس میں نہ ہمت تھی، نہ حوصلہ بھلا وہ کیسے عروسہ اور عمر کے سامنے ڈٹ جاتی۔

☼ ☼ ☼

دن چپکے سے گزرتے چلے گئے تھے۔ عشوہ کو گویا ایک چپ کی چاٹ لگ گئی تھی۔ دل میں خاموشیاں کیا اتری تھیں۔ لب ہنسنا اور بولنا ہی بھول گئے تھے۔ ایسے ہی اداس اور ویران دنوں میں فائق کی فون کال گویا اسے پھر سے زندہ کرگئی تھی۔

اس دن بھی وہ معمول کے کام کاج میں مصروف تھی، جب عموریہ نے چیخ کر اسے آواز دی۔

"ماما! جلدی آئیے۔ ماموں کا فون ہے۔"

"فائق کا فون؟" اس کے ہاتھ سے وائپر گر گیا تھا۔ اور وہ نہ جانے کس طرح سے فون تک کا فاصلہ طے کرکے آئی تھی۔ ریسیور ہاتھ میں لیا تو گویا اشکوں کی جھڑی لگ گئی تھی اور جب وہ رو رو کر دل کی ساری بھڑاس نکال کر ہلکی ہوگئی تو پھر فائق نے بولنا شروع کیا۔

"کمال ہے آپا! تم نے تو پہلے ہی رونا دھونا شروع کردیا ہے۔ تاکہ میں اپنے آنے کا ارادہ بدل لوں۔ میری کنجوس دل آپا کا اللہ بھلا کرے۔ آپا! میں کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔ تم رو رو کر مجھے اپنی غربت کی داستان سنانے کی تیاری مت پکڑو۔" دوسری طرف فائق اس کے بھرے بھرے دل کی وجہ سمجھے بغیر اپنی سنانے لگا تھا۔

"پگلے! میرا دل تو تیری آواز سن کر بھر آیا تھا۔ سو بسم اللہ کرکے آؤ۔ میرا تمہارے بغیر بھلا اور ہے ہی کون... اور یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔" اس نے فی الفور اپنے آنسو پونچھ دیے۔

"اللہ کی پناہ! یہ آنسوؤں کا دریا اگر خوشی کا تھا تو پھر غم کے سمندر کے بھلا کیا کہنے... آپا! نہ رویا کرو میری

جان! کہیں پاکستان میں سیلاب ہی نہ آجائے۔" فائق نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

"مسخرے! یہ بتاؤ، کب آؤ گے؟ سچ، میرا دل بڑا اداس ہو رہا ہے، بس اپنی صورت آکر دکھا جاؤ۔" اس کے حلق میں پھر سے آنسو اٹکنے لگے۔

"اپنے اداس دل کو ذرا خوش رکھنے کی کوشش کرو... اور آؤں گا تو میں تب جب مجھے تم اچھی سی کوئی خبر سناؤ گی۔"

"کیسی خبر!" اس نے آنکھ کا کونا بے دردی سے مسل دیا۔

"میری دلہن تلاش کرنے کی خبر، کوئی اچھی سی گڈ نیوز، یعنی کہ میری ولاری آپا اپنے بجیلے بھائی کے لیے ایک فل ٹائم میڈ دریافت کر چکی ہے۔ تاکہ میں آکر نکاح پڑھوالوں۔" وہ اپنے ازلی شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔

"کیا سچ...؟ میں تمہارے لیے لڑکی دیکھوں فائق؟" عشوہ کا بجھا بجھا اندیشوں میں گھرا دل گویا کھل اٹھا۔

"انگریزی تو نہیں بولی آپا! جو تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔" فائق نے گویا دہائی دی۔

"اچھا، بتاؤ... لڑکی بھلا کیسی ہونی چاہیے؟" وہ عروسہ اور عمر کی طرف سے دیے گئے۔ گھاؤ کو بھول کر قدرے بشاشت سے بولی۔

"بس لڑکی ہونی چاہیے، کوئی شو پیس نہیں۔ گھر کا کام کاج جانتی ہو، مطلب کھانا پکانا۔" فائق نے وضاحت کی تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے، تم بے فکر ہو جاؤ۔" عشوہ نے دل سے کہا۔

"میں تو ہمیشہ سے بے فکر ہوں۔ غم پالنے کا کام تمہارے ذمے لگا رکھا ہے۔ ویسے آپا! تم بھی زیادہ فکریں مت پالا کرو۔ ٹینشن ہمیشہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، لینے کی نہیں۔"

وہ اپنے لاابالی انداز میں کہہ رہا تھا۔ عشوہ کے دل میں کانٹا سا چبھا۔ درمیان ایک دفعہ پھر عروسہ اور عمر کی طرف چلا گیا تھا۔ ہمہ وقت اسے بس ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا کہ اگر ایسا ویسا کچھ ہو گیا تو پھر اس کا اور اس کی بچیوں کا کیا بنے گا؟

"سچ آپا!" فائق دلار سے بولا۔ "بہت یاد کرتا ہوں میں تمہیں۔"

"اب مکھن مت لگاؤ۔" عشوہ ہنس پڑی۔

"میں تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈوں؟" وہ ایک مرتبہ پھر یقین دہانی چاہ رہی تھی کہ فائق بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا تھا۔

"لڑکی کہیں گم ہے، جو تم ڈھونڈنے کی مہم پر نکلنے کی اجازت چاہ رہی ہو آپا؟" فائق بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"میری پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کر لو گے؟ یہ نہ ہو میں سارے معاملات طے کر لوں اور تم انکار کر دو۔" عشوہ اس سے ہر بات کلیئر کر لینا چاہتی تھی۔ ظاہر ہے وہ کسی کی زندگی کے ساتھ بھلا کیونکر کھیلتی۔

"نہیں آپا! مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔" اب کے فائق سنجیدہ ہوا تھا۔

"اچھا! ایک لڑکی ہے میری نظر میں۔" عشوہ کچھ سوچ کر پرجوش ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ اپنی تمام تر فکر و پریشانی بھلا چکی تھی۔

"صرف ایک لڑکی؟" فائق کو گویا دل کا دورہ پڑ گیا۔

"بکو نہیں۔"

"نہ جی، آپ خفا کیوں ہوتی ہیں، جیسے آپ کی مرضی۔" فائق نے فوراً تابعداری کا مظاہرہ کیا تھا۔

عشوہ کافی دیر اس کی بونگیوں سے لطف اندوز ہوتی رہی تھی۔ فائق سے بات کر کے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ جلتے دل کو گویا قرار آگیا تھا۔ فون رکھ کر جوں ہی وہ ہٹی تو پہلی نظر عمر سے ٹکرائی تھی۔ وہ بڑی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عشوہ کے دل میں عمر کے لیے نفرت ایک دم پھر سے اٹہ آئی۔ وہ کترا کر اس کے قریب سے گزر جانا چاہتی تھی، جب عمر کے سلگتے لہجے اور آواز کو سن کر ٹھٹک گئی۔

"فائق کو کم از کم مہینے میں ایک مرتبہ ضرور فون

کر لینا چاہیے۔ تمہاری صحت کے لیے اس کے فون ناگزیر ہو گئے ہیں۔ پھر عید کے عید نہیں، بلکہ ہر مہینے ہی تمہارے چہرے پر بھولی بھٹکی مسکراہٹ ہم مسکین لوگ بھی دیکھ لیا کریں گے۔"

"آپ نے مجھے دیکھ کر کرنا بھی کیا ہے؟ آپ کے دیکھنے کے لیے بے شمار سامان موجود ہے۔" وہ سر سے لے کر پیر تک سلگ گئی تھی۔

"کبھی کبھی سمجھ داری کی بات بھی کر لیتی ہو۔" اس نے عام سے انداز میں اسے چڑانا چاہا تھا۔ تاہم عشوہ نے بات کو اپنے ہی پیرائے میں لے لیا۔

"میں اور میری اوقات کیا ہے۔"

"سیانے لوگ اپنی اوقات پہچان ہی لیتے ہیں۔" وہ طنزیہ بولا۔

"پورے پندرہ سال سے اپنی اوقات اور حیثیت کا تعین لگا رہی ہوں۔" عشوہ نے بھرائی آواز پر بمشکل قابو پا کر کہا۔

"تو پھر نتیجہ کیا نکلا؟" وہ بھنویں اچکا کر پوچھ رہا تھا۔

"نتیجہ صفر... ہم تو نہ تین میں ہیں نہ تیرہ میں۔"

اسے ایک دم اپنی توہین کے احساس نے زرد کر دیا تھا۔

"بھائی لطیفے سنا رہا تھا؟" اب کے عمر نے موضوع بدل کر طنز کرنا شروع کر دیے تھے۔

"ہاں..."

"ہمیں بھی سنا دو... ہم بھی تھوڑی دیر کے لیے ہنس کھیل لیتے ہیں۔ دو، تین کلو ہمارا بھی خون بڑھ جائے گا۔"

"آپ تو آل ریڈی لوگوں کا خون چوس چکے ہیں۔ مزید خون بڑھا کر بھلا کرنا ہی کیا ہے؟" اس نے کشنز کے کورز اتارنے شروع کر دیے۔

"کچھ تمہیں ادھار دے دوں گا، آج کل تمہارا بلڈ پریشر لو ہو رہا ہے نا۔"

"میں آپ کے خودغرض خون سے ایسے ہی بھلی ہوں۔" اس نے کلس کر سوچا۔

"جی نہیں! کوئی نہیں، ہماری ماما کے بارے میں ایسے مت بولیے۔" ایمن پتا نہیں کب وہاں آئی تھی۔

"اگر بولوں تو پھر کیا کرو گی؟ اور اگر تمہاری ماما سے لڑائی کروں تو پھر کیا کرو گی؟" وہ جان بوجھ کر ایمن کو چھیڑ رہا تھا۔

"تو ہم آپ کو گھر سے نکال دیں گے۔" ایمن نے گویا فیصلہ سنا دیا تھا۔ عشوہ کے ہاتھ سے جھاڑو چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"ماں اتنی پیاری ہے کیا؟" عمر نے صدمے کی شدت سے سنبھل کر پوچھا۔ اس کے اتنے لاڈ پیار کے باوجود ووٹ ماں کی طرف ہی تھا۔

"جی... ہمیں ماما ساری دنیا سے پیاری لگتی ہیں۔ ہم اپنی ماما کے بغیر نہیں رہ سکتے۔" ایمن نے انگلی اٹھا کر گویا وضاحت کی تھی اور ساکت کھڑی عشوہ کو بیٹی پر گویا ٹوٹ کے پیار آگیا تھا۔ وہ اتنے مضبوط ستونوں پر کھڑی تھی اور اس کے باوجود کئی طرح کے خدشات نے اس کی راتوں کی نیندیں تک چرالی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ شک کے بیج کو دل میں جنم دے کر اپنے اور عمر کے درمیان فاصلے نہیں بڑھانا چاہتی تھی۔ اگرچہ فاصلے تو ان کے درمیان پہلے سے ہی بے شمار موجود تھے مگر رشتے کے اس بھرم کو وہ بغیر کسی ثبوت کے محض ایک شک کی بنا پر بھلا کیسے توڑ دیتی، سو وہ تحمل کے ساتھ تیل کی دھار دیکھ رہی تھی۔

بچیوں کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ عشوہ کی مصروفیت کا دائرہ پھر سے پھیل گیا تھا۔ وہی مصروف ترین روز و شب کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ صبح سویرے ایک مخصوص ہنگامہ مچا رہتا۔ آج پھر عمر کو ٹائی نہیں مل رہی تھی۔ شرٹ کی استری بھی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ مسلسل صبح سے بڑبڑائے جا رہا تھا۔

"کبھی خود بھی استری کو ہاتھ لگا لیا کرو۔ مفت کی نوکرانیاں مل گئی ہیں۔"

"کون؟ کن نوکروں کی فوج بھرتی کر رکھی ہے؟" عشوہ نے پلٹ کر تیکھے چتونوں سے اسے گھور کر

پوچھا۔

"عمیمہ اور عروسہ اور بھلا کون؟"

"عروسہ کون سے پہاڑ توڑتی ہے؟" عشوہ کا تو مارے اشتعال کے برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر کبھی پانی تک نہیں پیا تھا۔ کبھی کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ پھر بھی عمر کی ہمدردیاں عروسہ کے ساتھ تھیں۔ عشوہ تو پہلے سے ہی بھری بیٹھی تھی' اسی لیے بھڑک اٹھی۔

"سارا دن کولہو کے بیل کی طرح تو جوتے رکھتی ہو۔" اسے اشتعال دلوا کر گویا عمر کو خوب ہی لطف آنے لگا تھا' اسی لیے وہ عشوہ کو تاؤ دلانے کے لیے مزید طنز کرتا رہا۔

"اب عمیمہ سے برائے مہربانی کچن کے کام مت لیا کرو۔ اس کی اسٹڈیز کافی ٹف ہوتی جا رہی ہے۔ اسے پڑھائی کی طرف توجہ دینے دو۔ اپنی طرح اسے جاہل مت رہنے دینا۔"

"آپ کوئی عالم فاضل اپنے جیسی تعلیم یافتہ لے آتے نا... کم از کم یہ پھانس تو آپ کے دل میں سے نکل جاتی۔ اور میں بھی کوئی بھاگ کر نہیں آئی۔ اپنی چچی امی کو جا کر طعنے اور طنز سنایا کریں... یہ ان ہی کی جلد بازی کا نتیجہ ہے' جو میں آج تک اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔" وہ گویا پھٹ پڑی۔

"شادی تو میں اب بھی کر سکتا ہوں۔ تمہیں کیا خبر' دن میں کتنی کولیگز مجھے پروپوز کرتی ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ میں ایک سڑی ہوئی خاتون کا خوش مزاج' خوبرو شوہر ہوں۔"

"بڑی خوش فہمیاں ہیں اپنے بارے میں۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ عمر کو بھی آملیٹ کے ساتھ فرائی کر دیتی۔

"جناب! حقیقت پسند ہوں میں۔ اپنی تعریف خود سے نہیں کرتا۔ میری اسمارٹنس کی ایک دنیا تعریف کرتی ہے۔" وہ گلے میں ٹائی لٹکائے اب عروسہ کو آواز دینے لگا تھا۔

"عروسہ! ذرا ٹائی کی ناٹ لگا جاؤ' شریکوں کو تو ویسے ہی آگ لگی ہوئی ہے' قریب آ کر اور بھسم کریں گے مجھ غریب کو۔"

"آئندہ میں ناشتا بھی بنا کر نہیں دوں گی۔ عروسہ ہی سے بنوائیے گا' کچا پکا' بدمزا ناشتا۔" آخری فقرے اس نے زیر لب بڑبڑا کر کہے تھے' تاکہ صرف عمر ہی سن سکے' اور کسی کے کانوں تک آواز نہ جائے۔

"عروسہ کے ہاتھ کا ناشتا کر کے ڈاکٹروں کی جیبیں بھرنی ہیں کیا؟" عروسہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے عمر نے جملہ کیا۔

"اگر میری کوکنگ کے بارے میں یوں ہی ارشاد جاری کرتے رہیں گے تو پھر میں ٹائی کی ناٹ نہیں لگاؤں گی۔" وہ بھی عروسہ تھی' فوراً" دھمکیوں پر اتر آئی۔

"ایک ٹائی کی ناٹ کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے تمہیں؟ اور اسی بات پر محترمہ اکڑتی پھرتی ہیں۔" بڑے خوشگوار موڈ میں عروسہ سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ حالانکہ یہ عمر کا معمول تھا' مگر آج کل عشوہ کو ہر بات ہی بری طرح سے کھٹکنے لگی تھی۔ اس وقت بھی عمر کا عروسہ کے ساتھ ہنسی مذاق کرنا اس کے دماغ پر گویا ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگ رہا تھا۔

"جو کام مجھے آتا ہے وہ کسی اور کو نہیں آتا۔" عروسہ صاف جتا رہی تھی کہ عشوہ کو ناٹ لگانے کا سلیقہ نہیں۔ ادھر عشوہ گویا بری طرح سے راکھ ہو گئی تھی۔

"کیوں نہیں... یہ کام عشوہ بہت اچھی طرح سے کر لیتی ہے' تم خواہ مخواہ سر چڑھنے کی کوشش نہ کرو۔" عمر نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ عمیمہ ان کے لیے میز پر ناشتا لگا رہی تھی۔

"کبھی آپ بھی اٹھ کر برتن رکھنے کی زحمت گوارا کر لیا کریں۔" عمر نے ہمیشہ کی طرح سے عروسہ کو ٹوکا تھا۔ مگر اس کا ٹوکنا عشوہ کو سراسر ڈھکوسلہ لگا تھا۔ نرا ڈراما اور فریب۔

"عمر بھائی! کام کے علاوہ آپ مجھ سے ہر موضوع پر بات کر سکتے ہیں۔" عروسہ نے ٹھنک کر کہا۔ وہ سامنے

رکھے ناشتے کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ اس کا عمر بھائی کہنا بھی عشوہ کو صاف اپنا مذاق اڑاتا محسوس ہوا تھا۔ گویا عمر بھائی کہہ کر عروسہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کررہی تھی۔

"مثلاً "کیا کیا؟"

"کرکٹ، ہاکی، والی بال، فلم، ڈراما، سیاست، سیاحت اور کچھ بھی۔" اس نے کندھے اچکاکر کہنا شروع کیا تھا۔

"ماشاء اللہ! لگتا ہے، یہی سارا کچھ گھول کر تم اس بدنصیب آدمی کو کھلاؤ گی جس کے نصیب تمہارے ساتھ پھوٹیں گے۔" عمر نے دودھ کا گلاس خالی کرتے ہوئے مزے سے کہا تھا۔ عشوہ کے علاوہ اور سب کے لیے اس کی خوش مزاجی عروج پر ہوتی تھی۔

"میرا خیال ہے وہ دنیا کا خوش قسمت انسان ہوگا۔" عروسہ نے شرارتی انداز میں چہک کر کہا تھا۔ اور اس کا چہکنا پسینے میں تربتر عشوہ کو بری طرح سلگا گیا تھا۔ اس نے غصے کے عالم میں برنر زور سے بند کیا۔

"اس سے بڑا جھوٹ کوئی نہیں۔"

"یہی بڑا اور اصلی والا سچ ہے۔" عروسہ ہنسنے لگی۔ اس کی گنگناتی ہنسی کی آواز نے لمحہ بھر کے لیے عشوہ کو بھی مبہوت کردیا۔

"یعنی اصلی دیسی گھی والا؟" عمر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"دیسی گھی کا نام مت لیں، عشوہ جی کو ابکائی آجائے گی۔" وہ عشوہ کو باہر نکلتا دیکھ کر چھیڑنے والے انداز میں بولی۔

"عشوہ جی کی صورت ہی۔۔۔ خیر سے کیا کہیں، ہماری بات تو زہر کی طرح لگتی ہے جناب کو۔"

"صورت ہی منحوس ہے، بات مکمل کرلینا تھی۔ بھلا ادھوری چھوڑنے کا فائدہ۔" تپ تپ کر اس نے اپنی ساری تپش نکال دی تھی۔

"پپا! اسکول سے دیر ہورہی ہے۔" عمیمہ کو بولنا پڑا۔ وہ ابھی ابھی یونیفارم پہن کر آئی تھی۔ ہاتھ میں عموریہ اور ایمن کے اسکول بیگ پکڑ رکھے تھے۔

"اور مجھے کالج سے دیر ہورہی ہے۔" عروسہ بھی ساتھ ہی کھڑی ہوگئی تھی۔ عموریہ نے بھی اس کے پراٹھے کو للچائی نظروں سے دیکھنے کے باوجود کھانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"میں آفس سے لیٹ ہوچکا ہوں۔ کیا خیال ہے آج سارے چھٹی نہ مارلیں؟" وہ ان سب کے کھلے کھلے چہروں کی طرف دیکھ کر بولا تھا۔ بس ان میں عشوہ کا چہرہ حد پژمردہ تھا۔ وہ حد درجہ بے زار دکھائی دے رہی تھی۔ بچیوں نے فوراً "نعرہ لگایا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" سب یونیفارم تبدیل کرنے اندر بھاگ گئے۔

☼ ☼ ☼

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ شک ایک ناگ کی طرح ہوتا ہے جو آپ کی ہر خوشی کو ڈس لیتا ہے اور فکر آج کے دن کی چمکتی سنہری دھوپ پر آنے والے کل کے کالے بادلوں کے سائے پھیلا دیتی ہے۔ تنہا کڑھتے کڑھتے گویا وہ تھکنے لگی تھی۔ اس کا دل ایک ناسور بنتا جارہا تھا جو بس پھٹنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔

عمر اور عروسہ کی چھیڑ چھاڑ، بے تکلفی پہلے کی طرح قائم دائم تھی۔ عشوہ سے اب یہ رنگین منظر دیکھے نہیں جاتے تھے۔

عشوہ صحن میں آکر تازہ ہوا کے لیے بیٹھ گئی تھی، جب برابر والے گھر سے غوثیہ باجی آگئیں۔ بڑے دنوں بعد انہوں نے چکر لگایا تھا۔ وہ کچھ الجھی الجھی سی لگ رہی تھیں۔ ایسے ہی باتوں کے دوران انہوں نے دبی آواز میں عشوہ سے کہا۔

"عروسہ کی کہیں بات وات چلاؤ۔ یہ نہ ہو پانی سر سے اونچا ہوجائے اور تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے۔"

"جی!" وہ ساکت رہ گئی تھی۔

"پرائی لڑکی کی ذمہ داری بہت بھاری ہوتی ہے۔ مجھے عروسہ کے رنگ ڈھنگ ٹھیک نہیں لگ رہے۔" غوثیہ باجی بولے جارہی تھیں۔

"کیا غوثیہ باجی بھی عمر اور عروسہ کے متعلق سن گن پاچکی ہیں۔" اس کا دل گویا دھک سے رہ گیا تھا۔ اور یہی بات بہت واضح اور صاف لفظوں میں ماسی نے بھی گویا عشوہ کے منہ پر دے ماری تھی۔ ماسی کو ان دنوں ــــ عشوہ نے کپڑے وغیرہ دھونے کے لیے رکھا تھا۔ پورے محلے کا کام کرتی تھی۔ بھابھی بیگم کی صفائی ستھرائی بھی کرتی تھی۔ بلکہ زیادہ قیام اس کا بھابھی بیگم کے گھر میں ہی ہوتا تھا۔ بیوہ عورت تھی اور بے اولاد بھی ــ بھابھی بیگم بلا کی خدا ترس خاتون تھیں۔ انہوں نے اسے ٹھکانہ فراہم کردیا تھا۔

بات کچھ یوں ہوئی۔ عروسہ معمول کی طرح عمر کے کندھے سے لٹکی نہ جانے کیا فرمائش کررہی تھی۔ پہلے پہل تو عمر مان نہیں رہا تھا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر عروسہ کو لیے باہر نکل گیا۔ حالانکہ ایمن نے بھی ساتھ جانے کے لیے ضد کی تھی، مگر عمر نے اسے ڈانٹ کر خاموش کروادیا۔

"ہوم ورک کرو آرام سے بیٹھ کر۔ میں آکر تم تینوں کا ٹیسٹ لوں گا۔ جو تیاری کرنی ہے کرلو۔"

"وہ گاڑی کی چابی اٹھاکر باہر نکل گیا تھا اور عروسہ بھی اس کے پیچھے قلانچیں بھرتی بھاگ گئی تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر عشوہ کی آنکھوں میں دھواں بھر گیا۔

"عشوہ بٹی! ایک بات کہوں؟" ماسی نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بولو ماسی!" عشوہ کو اندازہ نہیں تھا۔ ماسی کون سا دھماکا کر [illegible] ورنہ اسے کچھ بولنے کا موقع ہی نہ دیتی۔ وہ یوں تو اس سے پرے نہ اڑا کر جاتی۔

"بٹی! اپنی عروسہ بٹیا کو سمجھاؤ، وہ جو کررہی ہے ٹھیک نہیں۔"

"کیا کررہی ہے؟" عشوہ چونک گئی۔

"بٹیا! منہ چھوٹا ہے، بات بڑی ہے۔" ماسی تذبذب کا شکار تھی۔ عشوہ کے گویا پورے وجود میں بے چینیاں اتر گئی تھیں۔

"ماسی! بولو بھی۔" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"بٹیا! عروسہ کو کہو! یہ سب ٹھیک نہیں۔ میں نے خود عمر باؤ کے ساتھ عروسہ کو بہت دفعہ گاڑی میں بیٹھ کر آتے جاتے دیکھا ہے، کالج یونیفارم میں۔ عروسہ کی عمر کچی ہے، ماں، باپ کا سایہ نہیں۔ بہتر یہی ہے تم ابھی سے سنبھال لو۔ معاملہ بگڑ گیا تو ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔" ماسی تو چلی گئی تھی، مگر عشوہ کو گویا جیتے جی مار گئی۔

"عمر اور عروسہ۔۔۔ چھپ چھپاکر ملنا ملانا۔۔۔ کالج یونیفارم میں، یعنی وہ کالج کے بہانے عمر کے ساتھ چلی جاتی ہے، اور عمر کو دیکھو! میری ناک کے نیچے کون کون سے ڈرامے ترتیب دیے جارہے ہیں۔۔۔ اور میں ابھی تک خاموش ہوں۔ کیا مجھے کسی بڑے نقصان کا انتظار ہے؟ میرے ہونٹ کب کھلیں گے، جب کوئی بہت بڑا حادثہ پیش آگیا؟" وہ گویا سن ہوتے دماغ کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ اور اس کے کانوں میں بھابھی بیگم، غوثیہ باجی اور ماسی کی آوازیں گویا پگھلا ہوا سیسہ بنی اتر رہی تھیں۔

"عروسہ، اور عمر۔۔۔ ان کے میل جول، ملاقاتیں۔۔۔"

"نہیں! میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی، چاہے مجھے اپنی جان کی بازی کیوں نہ لگانا پڑے۔ میں اپنا گھر اجڑنے نہیں دوں گی، بلکہ اس ناگن کا سر کچل کر اسے مار ڈالوں گی۔"

وہ گویا دہکتے انگاروں پر ننگے پیر چل رہی تھی۔ اب تو شک [illegible] گنجائش [illegible] ہی تھی۔ اس کے یقین پر مہر لگ گئی تھی۔ اور اسے بھی صرف عمر کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ پچھلے دو دن سے آفس کے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا۔ اور عشوہ گویا ایک ایک پل گن گن کر گزار رہی تھی۔ نہ جانے نیند میں کس احساس کے تحت اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ بے قراری اس حد تک بڑھی تھی کہ دوبارہ نیند مہربان ہی نہ ہوئی۔ وہ اٹھ کر ننگے پیر کچن میں آگئی۔ وہ گلاس پانی پی کر کچھ دیر کے لیے وہ لاؤنج میں ٹہلتی رہی، پھر بچیوں کے کمرے میں جھانکنے لگی۔ وہ تینوں ہی بے خبر سو رہی تھیں۔ برابر میں عروسہ کا کمرا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ اس

کے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہوگئی۔ دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ عروسہ کی آواز بالکل صاف انداز میں اس کی سماعتوں میں اتر رہی تھی۔

"میں کچھ نہیں جانتی عمر! اگر آپ نے میرے ساتھ شادی نہیں کرنی تو صاف بتادیں۔ میں آپ کی واپسی تک کا انتظار کررہی ہوں۔ مجھے دنیا کی کوئی پروا نہیں۔ ہم اسی ہفتے نکاح کرلیں گے۔ میں آپ سے کہہ بھی رہی تھی کہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ ہم شہر سے باہر نکاح کرلیتے۔" عروسہ کی بھرائی آواز میں غصے کی آمیزش صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

"دنیا والوں کی پروا کریں گے تو ہمارے دل حقیقی خوشی سے دور ہوجائیں گے۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور آپ بھی مجھ سے محبت کے دعوے دار ہیں تو پھر... لوگوں کی طرف مت دیکھیں۔"

عروسہ گویا سسک اٹھی تھی۔ عشوہ سے مزید سننا دشوار ہوگیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ سر سے لے کر پیروں تک وجود پسینے سے شرابور تھا۔

"آپ بھی مجھ سے محبت کے دعویدار ہیں عمر!"

عشوہ زندہ نہیں تھی۔ ان چند لفظوں کے کوڑوں نے اسے مار ڈالا تھا۔ عمر اس سے محبت نہیں کرتا تھا مگر وہ اس کے مزاج کے ہر رنگ سے سمجھوتا کیے ہوئے تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ عمر کی محبت میں اوائل عمری سے ہی مبتلا ہوگئی تھی۔ وہ عمر کو چاہتی تھی' بے حد و حساب' اسی لیے تو اس نے اپنی ذات کو اس گھر کی خاطر مٹادیا تھا۔ عمر سے وابستہ ہر رشتے سے محبت کی تھی۔ مگر عمر نے بھلا کس مقام پر اسے دھوکا دیا تھا؟

اگر وہ کسی دوسری عورت کو پکڑ کر لے آتا اور یہ تعارف کرواتا کہ وہ عمر کی بیوی ہے تو عشوہ کبھی "اف" تک منہ سے نہ نکالتی۔ مگر جسے اپنے ہاتھوں سے پروان چڑھایا تھا۔ اسے عمر کے برابر کھڑے دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر سے صبر اور برداشت کے اسباق یاد کرنا چاہتی تھی' مگر عروسہ کی آواز گویا لمحہ بھر میں اسے لہولہان کردیتی۔

"نہیں عروسہ! تم نے اچھا نہیں کیا۔ یوں کسی کے پیٹھ میں خنجر نہیں گھونپتے۔ میں ظالم نہیں بننا چاہتی۔ مگر تم نے مجھے ظلم کرنے پر اکسادیا ہے۔" وہ اندر ہی اندر گویا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ مگر ایک بھی آنسو اس کی آنکھ سے نہیں گر پایا تھا۔ اس بھیانک رات کا اختتام ہو ہی گیا تھا اور اسے جس صبح کا انتظار تھا۔ وہ اس کے آنگن میں اتر آئی تھی۔ عمر نے اس گھر میں قدم رکھا تو جیسے وہ نیند سے جاگ اٹھی۔ حالانکہ وہ سوئی کہاں تھی۔ بس بے خبری میں ماری گئی تھی۔

وہ عمر کے کمرے میں آنے کا انتظار کرتی رہی تھی۔ مگر عمر بیڈ روم میں آنا گویا بھول گیا تھا۔ عشوہ کو اٹھ کر باہر نکلنا ہی پڑا۔ وہ سیدھا عروسہ کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ عشوہ پھر سے لہولہان ہوگئی۔

"میں مرجاؤں گی' میں نہیں رہ سکتی' میں محبت کرتی ہوں... اور محبت کرنا جرم نہیں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں' مجھے اپنے دل کی خوشی چاہیے۔" عروسہ' عمر کے کندھے سے لگی سسک رہی تھی اور عمر اس کے بال سہلا رہا تھا۔ عشوہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی۔ تاہم اس کی آواز نے عشوہ کے پیروں تلے انگارے بچھا دیے۔

"تم فکر مت کرو' پلیز عروس! مت رویا کرو' تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔ خود کو سنبھالو' یہ کیا بچپنا ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے' مجھے عمر چاہیے۔" وہ بچوں کی طرح مچل رہی تھی۔ عشوہ کی شریان گویا پھٹنے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ وہ اپنی ٹانگیں گھسیٹتے ہوئے بمشکل اپنے کمرے میں آئی تھی' جب الجھا الجھا عمر بھی بیڈ روم میں داخل ہوا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم!" وہ ٹائی کی ناٹ کھول کر صوفے پر ڈھے گیا تھا۔ وہ سفر سے اتنا تھکا نہیں آیا تھا' جس قدر ایک بے نام سی پریشانی نے اسے تھکا ڈالا تھا۔

"کچھ چائے وغیرہ پلادو' سر میں شدید درد ہے۔" عمر اپنی کنپٹیاں دبا رہا تھا۔ پھر اٹھ کر کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو عشوہ کو ہنوز کھڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ' طبیعت تو ٹھیک ہے؟ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں' تمہارے دن بھی تو قریب ہیں' بلکہ یہی کچھ گنتی کے دن۔" وہ بولتے ہوئے اس کے قریب چلا آیا۔

"خیر تو ہے؟"

"میری ناک تلے کون سا کھیل رچا رکھا ہے؟ مجھے پاگل' احمق اور بے وقوف سمجھتے ہو کیا؟" عشوہ ایک دم گویا ضبط کی تمام ترطنابیں چھوڑ بیٹھی تھی۔

"شرم نہیں آتی عشق کے کھیل رچاتے ہوئے؟ گھٹیا آدمی! اپنے مرتبے اور مقام کو ہی دیکھ لیتے۔ عروسہ تمہاری بیٹی سے کچھ ہی بڑی ہے۔" وہ اس کا گریبان پکڑ کر چیخ رہی تھی۔

"جو تم دونوں سوچ رہے ہو' پلان کررہے ہو' میں وہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گی' اپنی جان ہار دوں گی' مگر تمہیں عروسہ سے نکاح نہیں کرنے دوں گی۔ بے حیا آدمی! نقب لگانے کے لیے اپنا ہی گھر ملا تھا؟"

چٹاخ... عشوہ کے لبوں پر گویا اس تھپڑ نے قفل لگادیا تھا' مگر دوسرے ہی پل یہ قفل خود بخود تڑخ گیا۔

"مارو' اور مارو مجھے... جتنا چاہو مار لو' مگر میں ساری دنیا کو چیخ چیخ کر اکٹھا کرلوں گی' تمہارا ایک ایک کرتوت دکھاؤں گی۔"

"بکواس بند کرو عشوہ!" عمر یک دم دہاڑا۔

"تم مجھے خاموش نہیں کرواسکتے۔" وہ زہر خند ہوئی۔

"تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟" عمر حد درجہ مشتعل ہوگیا تھا۔

"میں نے تمہارے کریہہ روپ کا ایک نظارہ دیکھ لیا ہے۔ مجھے کراہیت آرہی ہے' تمہارے وجود سے۔" عشوہ کے ہونٹ گویا زہر آلود ہوگئے۔

"تم جو سمجھ رہی ہو' ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں احمق عورت!" وہ کچھ بولنا چاہ رہا تھا' مگر چپ ہوگیا۔

"مجھے کوئی وضاحت نہیں چاہیے' میں عروسہ کو اس گھر میں رہنے نہیں دوں گی۔" وہ اپنے حواسوں میں کہاں تھی۔ عمر کی آنکھیں لہو رنگ ہوگئیں۔

"یہ گھر عروسہ کا بھی ہے' تم اسے یہاں سے کیسے نکال سکتی ہو؟" اس کے الزام در الزام نے گویا عمر کو بھی حد درجہ آگ بگولا کردیا تھا۔

"یہ گھر میرا ہے۔" وہ پھنکاری۔

"کیا جہیز میں لائی تھیں؟ یہ ہمارا گھر ہے' یعنی میرا اور عروسہ کا۔ تم کون ہوتی ہو اسے گھر سے نکالنے والی؟" عمر کے طنزیہ انداز نے اسے اور بھی گھائل کردیا۔

"یہ میرا گھر نہیں؟" وہ صدمے کی شدت سے پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔

"نہیں۔" عمر رکھائی سے گویا ہوا۔

"تو پندرہ سال میں نے ایسے ہی گزار دیے' اس گھر کی خاطر اپنی ہر خوشی اور ہر سکون کو تیاگ دیا۔ یہ پھر بھی میرا نہیں' تو پھر میں یہاں کیوں ہوں؟" وہ اس کی شرٹ پکڑے اپنے حواس چھوڑ بیٹھی تھی۔

"تو دفع ہوجاؤ یہاں سے۔" عمر چیخا۔

"تاکہ تم آرام سے شادیانے بجالو؟" وہ غصے میں تہذیب' تمیز سب بھول چکی تھی۔

"عشوہ!" عمر چلایا۔ "میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ عروسہ کے بارے میں ایک بھی نازیبا لفظ مت منہ سے نکالنا۔"

"تم دونوں غلیظ اور بے غیرت ہو۔ خود غرضی تم دونوں کے خون میں رچی ہے۔ یہ میری بدقسمتی تھی جو میں جان ہی نہیں پائی۔"

"عشوہ!" وہ گویا خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا تھا۔

"تمہیں شرم نہیں آئی۔ عروسہ سے محبت کے ڈھونگ رچاتے ہوئے؟ اسے کالج سے لے کر کہاں غائب ہوجاتے تھے؟ تم جو سمجھ رہے تھے کہ میں کچھ جان نہیں پاؤں گی' سب پتا چل گیا ہے مجھے تمہارے

گھناؤنے کاموں کا۔" اس کا ذہن گویا ایک نقطے پر ٹھہر گیا تھا۔

"تم دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔" وہ آگ بگولا ہوا تھا۔

"میں خود لعنت بھیج کر جا رہی ہوں تمہارے اس گھر پر۔ نہیں آؤں گی واپس۔ کبھی نہیں۔" عشوہ اٹھ کر روتے ہوئے ننگے پیر گھر سے نکل آئی تھی۔ غصہ حرام ہوتا ہے' ہوش و حواس سلب کر لیتا تھا۔ غصے نے عشوہ کے حواس پر بھی اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔ ورنہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی موجودہ حالت کی طرف ہی غور کر لیتی۔

جس وقت وہ بھابھی بیگم کے گھر میں داخل ہوئی۔ پورے گھر پر سناٹے کا گویا راج تھا۔ نہ جانے سب کہاں تھے۔ ایک لحاظ سے بہتر ہی تھا۔ اسے سنبھلنے کے لیے موقع مل جاتا۔ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف آگئی تھی' جب گول کمرے سے آتی آواز نے اسے بری طرح سے ٹھٹکا دیا۔

☼ ☼ ☼

عشوہ کو اک پل کے لیے لگا تھا گویا وہ پورے قد سے زمین بوس ہو جائے گی۔ اس قدر زور سے چکر آیا تھا۔ اگر وہ دیوار کا سہارا نہ لیتی تو سچ مچ ڈھے جاتی۔ اس نے ایک دفعہ پھر اپنے حواس مجتمع کر کے کچھ سننے کی کوشش کی تھی۔

"میں شادی کروں گا تو عروسہ سے۔ اگر آپ عمر بھائی سے بات نہیں کریں گی تو مجبوراً" مجھے دوسری راہ کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ یعنی میں کورٹ میرج کر لوں گا۔" یہ آواز عمر کی تھی۔ عمر امان کی۔ غوثیہ باجی کا بیٹا' بھابھی بیگم کا پوتا اور نوری کا بڑا بھائی۔

"کس قدر اتاؤلا ہو رہا ہے یہ لڑکا۔ ذرا شرم نہیں۔ جوان بہن گھر میں ہے۔ اس کی کہیں بات طے نہیں اور صاحبزادے کو [illegible] پڑی ہے۔" غوثیہ باجی سے خیالات بھی کچھ پرانے قسم ـــــ

اگر دیکھا جائے تو یہ غلط بھی تھا۔ عمر امان' نوری سے آٹھ سال بڑا تھا۔ برسر روزگار تھا۔ شکل و صورت واجبی سی تھی۔ اگر وہ شادی کے لیے اصرار کر رہا تھا تو پھر غوثیہ باجی کو نوری کا معاملہ سامنے رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر نوری کی خدانخواستہ چار' پانچ سال تک شادی نہ ہوتی تو اتنی دیر عمر امان کو بٹھائے رکھنا کہاں کا انصاف تھا۔ اسی لیے معاشرے میں برائیاں جنم لیتی ہیں۔ مگر ہم لوگ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ادھر عشوہ کے بدن میں گویا لہو تک باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے الفاظ' اس کی گھٹیا سوچ اور اس کا شک سب اس کے منہ پر آ پڑے تھے۔

مارے شرمندگی کے اس سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ جو کچھ وہ عمر سے کہہ آئی تھی۔ وہ سب واپس نہیں پلٹ سکتا تھا۔ اس کے لفظ ہی نہیں وہ خود بھی بے مول ہو گئی تھی۔ خفت' ذلت اور شرم نے اس پر بیک وقت حملہ کر دیا تھا۔

اتنی صاف ستھری' واضح اور سامنے کی بات تھی' مگر اس کے ذہن کی کھڑکی کھل ہی نہیں سکی۔ اس کا شک عمر کے ارد گرد ہی گھومتا رہا تھا۔

وہ عمر فاروق اور عمر امان میں فرق سمجھ ہی نہیں پائی۔

اور اب جو ندامتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ گویا پسینہ پسینہ ہو گئی۔ وہ عمر کا سامنا بھلا کیسے کر پائے گی۔ یہی سوچ اسے مار ڈال رہی تھی۔ جو گندے الفاظ اور مغلظات اس کے منہ سے نکل چکے تھے۔ جو کچھ وہ کہہ چکی تھی۔ وہ سب واپس تو نہیں آ سکتا تھا۔ البتہ ایک تسلی تو یہ تھی کہ عروسہ سے کوئی بھی غلط بات نہیں کی تھی ورنہ تمام عمر اس سے بھلا کیسے نظر ملا کر بات کر سکتی تھی۔

شرمندگی کا بوجھ زیادہ تھا یا پھر پچھتاوے کا۔ ایک دم ہی اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ کمر سے اٹھتی ٹیسوں نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ اور جب وہ فرش پر گر رہی تھی تب اس نے نوری کی آواز سنی۔

"امی! جلدی آیئے عشوہ بھابھی کو دیکھیں۔ ہائے' اللہ! یہ تو بے ہوش ہو گئیں۔" وہ چیخ رہی تھی۔ "آناً" فاناً" سب جمع ہو گئے تھے۔ عشوہ کو بھابھی بیگم' ڈاکٹر کوثر کے کلینک لے گئی تھیں۔ جہاں اس نے قبل از وقت فجر کے قریب ایک صحت مند سے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

شام تک اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔

واپسی پر جوں جوں گھر قریب آ رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ گھبراہٹ اور خوف نے حواس معطل کر دیے تھے۔

گاڑی رک گئی تو بھابھی بیگم نے سہارا دے کر اسے باہر نکالا۔ جوں ہی گیراج میں کھڑی عمر کی گاڑی پر ان کی نظر پڑی وہ گویا کھل اٹھیں۔

"خیر سے عمر گھر آگیا ہے۔"

"عمر رات سے گھر میں ہی موجود ہے' مگر اس نے میرا پیچھا ہی نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں ہوں کہاں؟ گھر سے نکل کر کہاں گئی؟ کدھر گئی؟ نہ میکا تھا' نہ سسرال اور نہ ہی کوئی عزیز رشتہ دار تھا۔ اس نے بھلا جانا ہی کہاں تھا؟ مگر عمر نے برابر والے گھر سے بھی اس کے بارے میں نہیں پوچھا؟"

بھابھی بیگم بچے کو گود میں چھپائے اسے لیے کمرے میں چلی آئیں۔ عمران دونوں کو دیکھ کر ٹھٹکا نہیں تھا۔ یقیناً" نوری نے اسے اطلاع دے دی تھی۔ بھابھی بیگم نے اسے بیڈ پر بٹھا کر بچے کو زبردستی عمر کی گود میں دے دیا۔

اسی پل دھاڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ عروسہ اور اس کے پیچھے تین اور گورے گورے چہرے جھانکنے لگے تھے۔

"پاپا!" ایمن گویا چیخ اٹھی۔ "یہ کون ہے؟"

"ایمن کا بھائی۔" عمر گویا کھل کر مسکرا دیا۔

"صرف ایمن کا بھائی۔" عمیمہ اور عموریہ چیخیں۔ خوشی گویا ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

"یہ تو پورا میرے جیسا ہے۔ ناک' آنکھیں اور ہونٹ بھی۔" چھوٹا سا گڈا اب عروسہ کی گود میں منتقل ہو گیا تھا۔

"جی نہیں! میرے جیسا ہے۔" ایمن چیخی۔

"شور نہیں کرو بٹیا! تمہاری ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ بھائی کو گود میں اٹھانا ہے تو اسے باہر لے آؤ۔ میں غوثیہ سے کہتی ہوں۔ عشوہ کے لیے یخنی بنا لائے۔" بھابھی بیگم بچیوں کو لے کر باہر نکل گئی تھیں۔ عروسہ بھاگتی ہوئی اس تک آئی۔

"عشوہ بھابھی! آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔ عمر کے ساتھ شادی کا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں تو اپنے اس چھوٹے سے گڈے کے ساتھ شادی کروں گی۔" وہ اس سے بے ساختہ لپٹ گئی تھی۔ بڑا ہی معصومانہ قسم کا انداز تھا۔ عمر پاس ہی کھڑا تھا۔ اس موقع پر بھی طنز کرنے سے باز نہیں آیا۔

"اور جس کے نام کی وجہ سے فساد مچا ہوا ہے' اس کو کدھر جانا ہے؟"

"بھاڑ میں جائے۔ جب غوثیہ آنٹی نہیں مان رہیں تو پھر مجھے بھی ان چاہا بن کر جانے کی ضرورت نہیں۔" اس نے ناک چڑھا کر اپنے ہنوز پرانے انداز میں کہا تھا۔ "یہ تو عمر میرے پیچھے پڑا تھا اور پھر مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔"

"اتنی عقل کہاں سے خریدی ہے؟" عمر نے پھر سے طنز کیا۔

"عمر بھائی! اس خوشی کے موقع پر تو بخش دیں۔" عروسہ کھلکھلاتے ہوئے بولی۔ "ویسے بھی سارا دن کچھ نہیں کھایا' اتنا پریشان رہے۔"

"اور جو بھابھی بیگم کے گھر سے بریانی آئی تھی' وہ کہاں گئی؟"

"وہ ہم سب کے پیٹ میں..... ویسے بھابھی! جلدی ٹھیک ہونے کی کوشش کریں۔ عمیمہ کی کوکنگ اتنی بھی اچھی نہیں ہے۔" عروسہ نے دہائی دی۔

"بھابھی! تو تم سے خدمت کروا کر ہی اٹھیں گی۔" عمر اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اور میں بھابھی کی خدمت ضرور کروں گی۔ ہمیں

اتنا پیارا تحفہ جو دیا ہے۔" وہ اس کے گال چوم کر بھاگ گئی تھی۔

وہ دل ہی دل میں ایک مرتبہ پھر سے اللہ کا شکر ادا کرنے لگی تھی کہ اس نے اسے کم از کم عروسہ کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالیا تھا۔ انسان غلط فہمی اور شک کی بنا پر بڑی بڑی غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ کچھ ایسی غلطیاں جن کا ازالہ ہونا ممکن ہی نہیں ہوتا مگر وہ پھر بھی اپنے رحیم رب کی شکر گزار تھی کہ وہ واپس اپنے ٹھکانے پر آچکی تھی۔ واپسی کے راستے کھوٹے نہیں ہوئے تھے۔ معافی کا ایک در تو کھلا تھا۔

اور وہ اپنے جرم کی سزا کے بعد معافی کی درخواست تھامے منتظر تھی، مگر سزا سنانے والا اس کی طرف متوجہ کہاں تھا اور عشوہ کی ہر ہر دھڑکن منتظر تھی۔ جب بہت دیر خاموشی ہی بولتی رہی۔ عمر نے اس کی طرف نظر نہیں کی تو وہ اٹھ کر ان کے قریب چلی آئی تھی۔ اب کے سچ مچ عمر نہ صرف چونکا تھا، بلکہ اسے کارپٹ پر بیٹھنے کی کوشش کرتے دیکھ کر چیخ اٹھا۔

"نیچے کیوں بیٹھ رہی ہو، یہاں بیٹھو۔" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قریب اس کی جگہ بنائی۔

"میں آپ کے پیروں میں بیٹھ کر معافی مانگنا چاہتی ہوں۔" عشوہ نے ڈرتے ڈرتے کہہ ہی دیا۔

"تمہاری جگہ پیروں میں نہیں ہے۔ برابر بیٹھ کر بھی معافی مانگ سکتی ہو۔" عمر کے الفاظ نے گویا اسے گنگ کردیا تھا۔ اس کا لہجہ اور انداز دونوں بلا کی نرمی لیے ہوئے تھے۔

"آپ معاف کردیں گے کیا؟" وہ کپکپاتے ہونٹوں پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

"کرنا تو نہیں چاہیے، جو کچھ مجھے سنا کر گئی ہو، برداشت سے باہر تھا، مگر اب کیا کریں، تم نے تحفہ ہی اتنا اچھا دیا ہے۔ سارے بہتان، سارے الزام بھولنا ہی پڑیں گے۔" عمر نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھی تھی، مگر سر جھکائے ہوئے۔

"میں نے آپ کے اور عروسہ کے بارے میں بہت غلط سوچا تھا۔ معافی لفظ بہت چھوٹا ہے، مگر میں پھر بھی معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ مجھے معاف کردیں، میں نے بہت گندے الفاظ استعمال کیے تھے۔ مگر میں بھی کیا کرتی۔ میں بھابھی بیگم، غوثیہ باجی اور ماسی کی باتوں کا غلط مفہوم سمجھ کر آپ پر بہتان باندھنے لگی تھی۔ میں نے سوچا ہی نہیں کہ ایک اور عمر بھی ہمارے برابر والے گھر میں رہتا ہے۔"

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ عمر ابھی اسے مزید ستانا چاہتا تھا، مگر اس کے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا۔

"بس اور کے عشوہ! اب رونا دھونا چھوڑو۔ تمہاری صحت کے لیے بہتر بھی نہیں۔ دکھ تو مجھے بہت ہوا تھا۔ عروسہ جو میرے لیے عمیمہ کی طرح ہے، بلکہ میں عمیمہ سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس کی ماں کی محبتوں کا قرض ہے، جسے میں نے ایک فرض کی طرح نبھانا ہے۔ اور پھر عروسہ کا میرے علاوہ ہے ہی کون؟ اگر میں بھی اسے پیار دینے کی کوشش نہ کروں تو پھر میکے اور ماں، باپ کے نام پر اس کے پاس کیا بچے گا؟ وقتی طور پر مجھے شدید غصہ آیا تھا۔ مگر پھر دھیرے دھیرے خود بخود اتر گیا۔" عمر نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"میں نے تمہارے لفظوں میں اور لہجے میں چھپی محبت کو محسوس کیا تو تمہارا غصہ حق بجانب لگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ عمر نے عروسہ کو پرپوز کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے، مگر غوثیہ بھابھی نوری کی وجہ سے ٹال مٹول سے کام لے رہی تھیں۔ عمر کی پسندیدگی جان کر ان کا رویہ عروسہ سے بھی بدل گیا تھا۔ عروسہ ایک، دو مرتبہ عمر کے مجبور کرنے پر اس کی بات سننے کے لیے باہر گئی تھی۔ تاہم میں اس بات سے واقف تھا۔ شاید عروسہ بھی اس کی محبت سے متاثر ہوگئی تھی۔ تاہم عمر بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ گھر والے مان نہیں رہے تھے۔ اور میری یہ خواہش تھی کہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے حل ہوجائیں۔ عمر اور عروسہ کا معاملہ سیدھا کرتے کرتے میری اپنی ناؤ ڈوبنے

لگی تھی۔ میں اس بات سے قطعاً "ناواقف تھا۔ نام کی مماثلت نے جہاں تمہیں ایک ان دیکھی آگ میں جلایا ہے۔ وہیں مجھے بھی خبر ہو چکی ہے کہ مجھے سنبھل کر ہی رہنا پڑے گا۔ کبھی دوسری شادی کے بارے میں ہرگز بھی نہ سوچوں، ورنہ تم تو میری اور اپنی جان ایک کر دو گی۔" عمر نے شرارت سے اسے دیکھا۔

عمر کی اس وضاحت سے بھی پہلے عشوہ پھول کی طرح — ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔ تمام تر بدگمانی کے بادل چھٹ گئے تھے۔ وہ جو زندگی سے ہی مایوس ہو چلی تھی، اپنی زہریلی سوچوں سے نجات پا کر پھر سے گویا تر و تازہ ہو گئی۔

"آپ اگر مجھے بھی عروسہ اور عمر کا معاملہ بتا دیتے تو میں اتنے دن انگاروں پر تو نہ سوتی۔"

"اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟" عمر نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

"میری محبت پر شک ہے؟"

"اب تو بالکل بھی نہیں۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"آپ نے کبھی مجھ پر اعتبار کیا ہی نہیں۔ اپنا سمجھا ہی نہیں۔ نہ عزت دی ہے، نہ محبت..... اگر ہمارے درمیان اتنے فاصلے نہ ہوتے تو عروسہ اور عمر کی بات آپ کے توسط سے ہی سہی، مجھ تک ضرور پہنچتی۔" وہ شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"یہ ایک الزام ہے مجھ پر..... محبت اور عزت کے بغیر پندرہ سال گزار دیے ہیں کیا؟ پاگل! محبت محبت۔ الا پنے سے محبت زیادہ ہو جاتی ہے کیا؟ رویہ، احساس، خیال اور پیار کا رشتہ محبت کو واضح نہیں کرتا؟ میرا تم سے ایک مضبوط تعلق ہے۔ میری اوائل عمری کے دنوں کی ساتھی ہو۔ میرے بچوں کی ماں ہو۔ پہلی اور آخری بیوی ہو۔ اس کے علاوہ محبت کے کون کون سے ثبوت چاہتی ہو؟" وہ اس کے ہاتھ نرمی سے تھپتھپا کر بولا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم اپنی بھڑاس مجھ پر نکال کر اپنا دل صاف کر چکی ہو۔ اگر عروسہ تک تمہارے خیالات کی ذرا بھی بھنک پڑ جاتی تو پھر تم نے میرے اس قدر قریب ہرگز نہیں بیٹھے ہونا تھا۔"

"تو پھر میں نے کہاں جانا تھا؟" وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑنے لگی۔

"رہنا تو پاس ہی تھا، مگر دور، دور..... یعنی میں اپنا بیڈ روم الگ کر لیتا۔"

"کیا سچی؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں..... میں عروسہ سے کبھی تمام عمر نظر نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ میری بہن ہی نہیں، مجھے اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اور میں شرمندگی کے اس بوجھ کو اٹھانے سے قاصر ہو جاتا۔ اب تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ ایسا کچھ ہوا تو نہیں، سو تم غم نہ کھاؤ، بلکہ خوشی مناؤ۔ اللہ نے تمہارے من کی مراد پوری کی ہے۔ ارے! وہ ہے کہاں؟ یہ ایمن اور عروسہ اس کا کچومر نکال دیں گی۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔ تم اتنے میں نام سوچ رکھو۔"

عمر گویا سر پر ہاتھ رکھ کر بھاگا تھا۔ عروسہ اور ایمن کی لڑائی ہو رہی تھی۔ دونوں ہی ایک ساتھ بچے کو اٹھانا چاہتی تھیں اور بھابھی بیگم ان دونوں کو بچہ نہیں دے رہی تھیں۔

عشوہ ان کی کھٹی میٹھی لڑائی سن کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے دل کے سارے بوجھ خود بخود ہٹ گئے تھے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ عمر جیسے انا پرست نے عشوہ کی گفتگو بلکہ نازیبا ترین لڑائی کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ شاید اتنی بڑی خوشی کے طفیل اس کی ہر غلطی کو وہ درگزر کر گیا تھا۔ جو بھی تھا، عشوہ کا دل اور گھر ٹوٹنے سے بچ گیا تھا۔ وہ جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔ اس کے دل کی ہر پھانس نکل گئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ وہ غوثیہ باجی اور بھابھی بیگم کے دل کی چبھن بھی دور کر دے گی۔

اسی شام برابر والے گھر سے مٹھائی کے ٹوکروں سمیت بھابھی بیگم اور غوثیہ باجی آئی تھیں، عمر کے لیے عروسہ کا ہاتھ مانگنے۔ عشوہ نے غور کیا تو اسے احساس ہوا، بظاہر غوثیہ باجی، عمر کے مجبور کرنے پر آتو

گئی تھیں، مگر نوری کے حوالے سے ان کے تفکرات ہنوز قائم تھے۔ شاید وہ اس بات سے خوف زدہ تھیں کہ کماؤ بیٹے کی شادی ہو گئی تو ان کی بیٹیوں کا بھلا کیا بنے گا؟

سو عشوہ نے ان کی پریشانی کو دور کرنے کے لیے ایک فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ بھابھی بیگم سے بڑی محبت سے کہہ رہی تھی۔

"میں فائق کے لیے نوری کا رشتہ باقاعدہ طور پر مانگنے کے لیے آؤں گی، مگر ابھی آپ اگر چاہیں تو ہاں کر دیں..... تاکہ میں بے قرار بیٹھے اپنے پردیسی بھائی کو خوش خبری سنا دوں۔ وہ بس کل کی فلائٹ سے پاکستان پہنچ رہا ہے۔"

ادھر غوثیہ باجی اور بھابھی بیگم کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔ مارے خوشی کے ان سے بولا نہیں گیا۔ نوری کے رشتے کی بات طے ہوتے ہی ان کا رویہ عروسہ سے بے حد اچھا ہو گیا تھا۔ ادھر عمر بھابھی بیگم سے نہ جانے کس بحث میں مصروف تھا۔

"بھابھی بیگم! کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ اس گاؤدی کا نام آپ کچھ اور رکھ لیتیں۔ یہاں تو اس گھونچو کے نام کی وجہ سے بڑے بڑے فساد اور طوفان اٹھتے اٹھتے رہ گئے ہیں۔" بھابھی بیگم ایک جیسے نام رکھنے کی وجہ تسمیہ بتانے لگیں۔

"ہم نے سوچا نام کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کلثوم کا بھانجا خوب صورت بھی ہے اور لائق بھی۔ پوتے کی پیدائش سے پہلے ہی عمر امان نام میں نے سوچ لیا تھا۔ تاکہ یہ کچھ نہ کچھ تو کلثوم کے بھانجے پر پڑے۔ شکل نہ سہی، دماغ تو اس نے تمہارے جیسا ہی لیا ہے۔" انہوں نے پرجوش انداز میں کہا۔

"پاپا! تو پھر ہم بھائی کا نام بھی عمر جونیئر رکھ لیتے ہیں۔" ایمن نے بہت پتے کی بات کی تھی۔ عروسہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلا اٹھی۔

"عمر، عمر اور عمر کی گردان ہم سے نہیں ہوتی، خبردار! جو کسی نے عمر نام رکھنے کی کوشش کی۔"

"عمر فاروق اور عمر امان ہی ہماری جان کو کافی ہیں۔"

عشوہ نے بھی ہنستے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ سب سے زیادہ تائیدی انداز میں عروسہ نے سر ہلایا۔

"یہ ننھا شہزادہ ہماری خوشیوں کو مکمل کرنے آیا ہے۔ سو اس کا نام ہوا مبشر۔ کسی کو اعتراض تو نہیں؟" عروسہ نے کھڑے ہو کر گویا اعلان کیا تھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ اعتراض کیوں ہونے لگا۔ بچے کی اکلوتی پھوپھی ہو، پہلا حق تمہارا ہے۔" غوثیہ باجی نے دلار سے ہونے والی بہو کا ہاتھ تھپتھپا کر کہا تھا۔ سب ہی کو یہ نام پسند آیا تھا۔ اب عروسہ نہ جانے کون کون سے لطیفے سنا کر انہیں ہنسا رہی تھی۔ لاؤنج میں سے قہقہوں کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں۔ عشوہ ذرا دیر کو کچن کا انتظام دیکھنے اٹھ گئی۔ کھانا ہوٹل سے منگوایا تھا۔ تاہم وہ پلیٹوں میں خود ہی نکالنے لگی۔ بچیوں کی شگفتہ ہنسی کو دل سے محسوس کرتے ہوئے وہ ایک دفعہ پھر مہربان رب کا شکر ادا کر رہی تھی۔

☼

شازیہ جمال ناز

مہک اٹھے سارے موسم

"اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔" جواہر پیرزادہ کی آواز پر اس نے جھٹکے سے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

"کہیں اس کمینے کو پتا تو نہیں چل گیا کہ میں میٹرک میں تیسری بار بھی فیل ہو گئی ہوں۔" ماہ وش پیرزادہ عرف مٹھو نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"گھر میں کسی کو بتایا؟" جواہر کے ہمدردی سے پوچھنے پر وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"ویسے مٹھو! تمہاری مستقل مزاجی کی تو داد دینی پڑے گی۔ تمہاری جگہ اگر خدانخواستہ میں ہوتا تو اب تک ہمت ہار چکا ہوتا۔ اب تو خیر سے "ہیٹ ٹرک" بھی ہو چکی ہے آگے کا کیا ارادہ ہے۔؟" جواہر نے مذاق اڑایا۔

"ختم ہو گئی تمہاری بکواس؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" جواہر کے لبوں پر پھیلتی دل جلانے والی مسکراہٹ دیکھ کر وہ چلا اٹھی۔

"ویسے ڈیر کزن! تم دل چھوٹا مت کرو۔ میرے پاس گھر والوں کو یہ اندوہناک خبر "ایک بار پھر" سنانے کے لیے ایک آئیڈیا ہے۔"

جواہر پر کوئی اثر نہ ہوتا دیکھ کر وہ خود ہی پاؤں پٹخ کر وہاں سے چلی گئی اور اپنے کمرے کا دروازہ دھاڑ سے بند کیا کہ دوسرے کمرے میں استراحت فرماتے دادا حضور اپنے بستر پر اچھل پڑے۔ شام تک جواہر کی زبانی یہ خبر سارے گھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ آنسہ ماہ وش پیرزادہ اس بار بھی میٹرک میں شان دار طریقے سے فیل ہو کر اپنی "خاندانی" خواہش کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

دادا حضور نے کبھی اسکول کی شکل نہ دیکھی۔ والد بزرگوار "غلام علی" نے اسکول میں قدم رنجہ تو فرمایا لیکن ماسٹر جی کے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود بھی کسی اڑیل گھوڑے کی طرح "چار جماعتوں" پر ہی اٹک گئے۔ دادا حضور اسی پر خوش ہو گئے کہ چلو فرزند نیک ارجمند "پڑھن لکھن" جوگا تو ہو گیا۔ غم کا پہاڑ تو اس وقت ٹوٹا جب گاؤں کے منشی کی زبانی معلوم ہوا کہ بھاگ بھاگ کر جوانی کی سرحدوں کو ہاتھ لگاتا "پڑھا لکھا" منڈا گاؤں کی الہڑ دوشیزہ پروین عرف پنو کو "عشق نامے" لکھ لکھ کر بھیج رہا ہے۔ وہی پنو جیسے مرغیاں چوری کرنے اور بیر توڑنے کے علاوہ اور کسی کام سے رغبت نہیں۔

غیرت مند ابا کے چہرے پر بجی تیر مار کہ مونچھیں مارے غیرت کے پھڑک گئیں۔ اسی دن اپنی نصف بہتر زہرہ خاتون کے ساتھ ہاتھوں سے نکلتے گبھرو جوان کے لیے پنو کا ہاتھ مانگنے وسایا موچی کے گھر پہنچ گئے۔ ہرچند کہ نصف بہتر نے اچھا خاصا واویلا مچایا کہ وہ کسی صورت ایک "چورنی" کو اپنی بہو نہیں بنائیں گی۔ اتفاق سے پنو صاحبہ نے ان کی بھی تین عدد بلاناغہ انڈے دیتی مرغیاں اور درجن بھر انڈے چوری کر کے اپنے مستقبل پر کلہاڑی ماردی تھی۔ لیکن ابا حضور کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ "محبت کسی سے اور شادی کسی اور" سے کی جائے۔ چنانچہ پنو صاحبہ بڑی دھوم دھام سے غلام علی کی حویلی میں دلہن بن کر آئیں اور چھا گئیں ٹھا کر کے۔

دوسرے ہی دن گھونگھٹ الٹ کر سارے گھر کا گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ سسر صاحب کو حقہ تازہ کر کے دیا اور دعائیں سمیٹیں۔ سر پر پٹی باندھے سر درد کا بہانہ بنا کر لیٹی ساس صاحبہ کو چولہے کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا بلکہ لگے ہاتھوں ان کے لاکھ ناک بھوں چڑھانے کے باوجود تیل کی شیشی لے کر جی جان سے مالش بھی کردی۔ آخر کو "نادانی" میں کی گئی "چوریوں" کا ازالہ بھی تو کرنا تھا۔

سسرال میں قدم جمانے کے علاوہ مجازی خدا کے لکھے محبت نامے سینے سے لگا کر رکھتیں اور اٹھ اٹھ کر ان کے کرتے کی جیبیں جھاڑتی رہتیں کہ خدانخواستہ گاؤں کی کسی اور "ماہ جبینہ" کو محبت نامے تو نہیں لکھے جا رہے کہ خیر سے محبت کی شادی تھی اور محبت میں تو لاکھوں وسوسے جان کو چمٹے رہتے ہیں۔

پورے تین سال بعد "ماہ وش عرف مٹھو" کی قلقاریاں آنگن میں گونج اٹھیں۔ زہرہ خاتون جو پوتے



کو گود میں کھلانے کا ارمان دل میں لیے بیٹھی تھیں۔ پوتی کی پیدائش پر خاصا دلی صدمہ پہنچا۔ سر پر "مشہور زمانہ" پٹی باندھ کر حجرہ نشین ہو گئیں دو دن بعد پوتی کے چاند چہرے پر اتفاقیہ نظر پڑی تو مارے حیرت کے منہ میں انگلیاں داب لیں۔

"یا اللہ! ایسا حسین تو ہماری پچھلی سات پشتوں میں بھی کوئی پیدا نہ ہوا۔"

لپک جھپک کر گود میں لیا، چٹا چٹ بلائیں لے ڈالیں اور مبارک باد کے لیے آنے والی عورتوں کو ٹھونک بجا کر باور کرایا کہ زہرہ خاتون کی پوتی سارے نین نقش دادی کے چرا کر لائی ہے۔

سننے والیاں اس قدر غلط بیانی پر دل ہی دل میں بھڑک اٹھیں منہ پر سچ کہنے کی نہ تو ہمت تھی اور نہ ہی جرات کہ زہرہ خاتون پلٹ کر جواب دینے والوں کا منہ توڑ دیا کرتی تھیں۔

"بھورانی! پنڈ میں مٹھائی بانٹی ہے یا نہیں؟"

لالٹین کی چمنی صاف کرتی پنو نے غور سے ساس کا چہرہ دیکھا، سدا کی بہانے باز ساس اس وقت چاند جیسی پوتی کی پیدائش پر واقعی خوش تھیں، پنو کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا۔

"میری پوتی ڈاکٹر بنے گی۔" مونچھوں کو تاؤ دیتے دادا حضور نے با آواز بلند اعلان کیا۔

"رہنے دو پیر صاحب! ہماری نازک سی پوتی اب مرن جوگیوں کو ٹیکے ٹھوکا کرے گی؟"

گندم صاف کرتی زہرہ خاتون نے ناک چڑھا کر اعتراض کیا۔

"ارے میری لاڈو رانی پروفیسر بنے گی اور اسے میں خود ہی پڑھایا کروں گا۔"

والد بزرگوار کے فخریہ لہجے پر پنو نے دل تھام لیا۔

پنو کے خالہ زاد بھائی "سلطان گجر" کی پنڈ کے اکلوتے نائی شیدے نے غلطی سے مونچھیں مونڈ دیں۔ سلطان گجر کے چہرے کے وسیع رقبے پر بڑے طمطراق سے پھیلی مونچھیں اس کا طرۂ امتیاز تھیں، اگرچہ ان ہی خطرناک مونچھوں کی وجہ سے پورے پنڈ میں کوئی اسے اپنی بیٹی دینے پر آمادہ نہیں تھا، اپنے چالیس سالہ لنڈورے ہونے کا اسے خود بھی اچھا خاصہ قلق تھا مگر مونچھوں سے دست برداری کسی طور گوارا نہ تھی، ہر چند ماں نے کہا "پتر! اپنے اس جنگل کی تھوڑی سی کانٹ چھانٹ کر لو" باپ نے "بدمعاش" نظر آنے کا طعنہ دیا، بہنوں نے ترلے کیے لیکن گجر صاحب پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے۔

اب جو شیدے نائی نے اس ناممکن کو ممکن کر ڈالا تو گجر کی والدہ اور بہنوں نے شیدے کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور مٹھائی کے ٹوکروں کے ساتھ باضابطہ طور پر شکریہ کہا کہ اب جا کر بیٹے کے سہرے کے پھول کھلنے کی کچھ امید بندھی تھی۔ بہنوں کو تو اپنا "ویر" مونچھوں کے بغیر "شان" جیسا دکھنے لگا، لیکن موصوف کا غم و غصہ سے حقہ پانی بند ہو گیا۔

پنڈ والے جوق در جوق افسوس کے لیے آئے، دادا حضور نے بھی سلطان گجر کی دل جوئی کرنے کے لیے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

"پاگل دا پتر ہے، زنانیوں کی طرح رو رہا ہے۔ گھر کی کھیتی ہے پھر اگ آئے گی۔ پر تھوڑا ٹائم لگے گا۔"

سر پر پگڑی باندھی، آئینے کے سامنے کافی دیر تک کھڑے ہو کر بڑے پیار سے مونچھوں کو سنوارتے رہے "سچ ہے بھئی مونچھ نہیں تو کچھ نہیں۔" آئینہ کے سامنے دو تین "خطرناک" قسم کے قہقہے لگائے اور دھوتی سنبھالتے رخصت ہو گئے۔

[illegible]

کے ساتھ واپسی ہوئی پتا چلا کہ سلطان گجر نے ان سے ملنے سے صاف انکار کر دیا کہ ان کی سدا بہار مونچھوں کو دیکھ کر اسے اپنا نقصان اور شدت سے یاد آجاتا، سوکھی سڑی ہڈیوں میں مارے غصے کے خون جوش مارنے لگا۔

"بات سنیں پیر صاحب...!" قسمت خراب تھی زہرہ خاتون کی جو بپھرے ہوئے شیر کو چھیڑ بیٹھیں۔

"ہزار واری کہا ہے تجھ سے، مجھے خالی خولی پیر صاحب نہ کہا کر۔ پیر کے ساتھ "زادہ" لگاتے ہوئے تجھے موت پڑتی ہے۔ جب تو مجھے پیر صاحب کہتی ہے تو آنکھوں کے سامنے گلے میں مالا ڈالے جھاڑ جھنکار حلیے والا "پیر خلقو" گھوم جاتا ہے۔"

نازک سی جان اتنا غصہ برداشت نہ کر سکی، چارپائی پہ ڈھیر ہو کر ہانپنے لگے۔

کرم علی پیرزادہ کے باپ دادا چھری چاقو تیز کرنے کا کام کیا کرتے تھے، اور پورے پنڈ میں "چھری والے" کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ لیکن کرم علی کو یہ لقب کچھ خاص پسند نہ تھا، ایک دن فرصت سے تمام ذاتوں کے بارے میں غور و خوض کیا اور "پیر زادہ" پر دل و جان سے فدا ہو گئے۔ یہ لقب انہیں اپنے شایان شان لگا۔ بس تب سے پورے پنڈ میں بانگ دہل اعلان کیا کہ انہیں "کرم علی پیرزادہ" کے نام سے پکارا جائے۔ اگر کسی نے غلطی سے بھی "چھری والا" کہا تو وہی خاندانی چھری پیٹ میں گھونپ دی جائے گی۔ زور زبردستی سے ہی سہی پر اب وہ پیرزادہ ہی تھے۔ لیکن برا ہو زہرہ خاتون کا کہ پیرزادہ ان کی زبان پر آ کے نہ دیتا۔ بقول ان کے مجازی خدا کو پیرزادہ کہتے ہوئے انہیں ہنسی آجاتی ہے۔

ڈیوڑھی سے آتی ساجدہ آپا نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے پیر صاحب کو زہرہ خاتون پر برستے ہوئے دیکھا تو جھوم اٹھیں۔

"اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔"

زہرہ خاتون کی نظر سفید ٹوپی والا برقع سر پہ ٹکائے لطف اندوز ہوتی ساجدہ آپا پر پڑی تو دل ٹوٹے ٹوٹے ہو گیا۔ "فوراً" سے پیشتر سر پہ پٹی باندھی اور آنکھیں موند کر سوتی بن گئیں۔



مٹھو نے خیر سے پانچ جماعتیں پاس کیں تو پنڈ کے اکلوتے اسکول کے اکلوتے ماسٹر نے کلمہ شکر ادا کیا کہ گیا۔ گلی کیا بازار کیا گھر کیا اسکول مٹھو کے والد اور دادا حضور اس کی تعلیمی کارکردگی سے باخبر رہنے کے لیے ماسٹر صاحب کا پیچھا ہی پکڑ لیتے اور زبردستی اگلوا کر دم لیتے کہ "مٹھو پڑھائی میں بہت اچھی جا رہی ہے۔"

ماسٹر صاحب کا دل تو چاہتا، انہیں کھری کھری سنا دیں کہ مٹھو ابھی پرائمری میں ہی پڑھ رہی ہے نہ کہ بی اے کر رہی ہے۔ لیکن ایک تو بے چارے کو دادا حضور کی مونچھوں سے بڑا ڈر لگتا اور دوسرا بھی مونچھوں ہی سے ڈر لگتا۔

اب مٹھو کی مزید تعلیم کے لیے شہر میں داخلہ لینے کا مسئلہ زیر غور تھا۔

"مٹھو کے ساتھ شہر میں جاؤں گا۔" دادا حضور نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"سنیں جی! آپ کے بغیر میں بھلا یہاں کیا کروں گی؟" دوپٹے کا کونا مروڑتے ہوئے زہرہ خاتون نے لجا کر کہا تو دادا حضور کمال بے نیازی سے گویا ہوئے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تو بھی میرے ساتھ ہی چل۔"

"لیکن مٹھو کو میرے بغیر نیند نہیں آتی ہے، وہ سوئے گی کس کے ساتھ؟" پنو کے رقت آمیز لہجے پر ان کا دل پسیج پسیج گیا۔

"اوئے جھلی! تو بھی ہمارے ساتھ ہی چلی چل۔" مونچھوں کو تاؤ دیتے دادا حضور نے بھو رانی کو تسلی دی۔

"لیکن مٹھو کے ابا...؟" تذبذب سے سرتاج کی طرف دیکھا۔

"تو میں بھی تو تم لوگوں کے ساتھ ہی چل رہا ہوں، میں نے یہاں اکیلے رہ کر بھلا کی کرنا ہے؟" سرتاج نے زوجہ محترمہ کی دل جوئی کی۔ تو ساس بہو مل کر سامان باندھنے کے لیے اٹھ گئیں۔

"میرا حقہ بھی رکھ چھوڑیں۔" دادا حضور نے یاد دہانی کروائی۔

"رکھوں یا چھوڑ دوں؟" زہرہ خاتون نے دوبارہ پوچھا۔ مگر وہ سنی ان سنی کرتے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

"ایک تو پیر صاحب..."

"کیا کہا تو نے ابھی؟" دادا حضور خالی خولی پیر صاحب سن کر ڈیوڑھی سے پلٹ کر گرجے۔ اب کی بار زہرہ خاتون نے ان کی دہاڑ ان سنی کر دی کہ انہیں شہر

اپنے بیٹے کے پاس جانے کی جلدی تھی۔

کرم علی پیرزادہ کا بڑا صاحب زادہ وحید اپنے بال بچوں کے ساتھ شہر میں رہائش پذیر تھا۔ وحید صاحب کو یار دوستوں نے ہنسی مذاق میں کہہ دیا کہ تمہاری شکل ہو بہو "وحید مراد" سے ملتی ہے۔ تو جناب نے ہنسی مذاق کو سیدھا دل پر ہی لے لیا۔ اپنے حسن پر غرور تو پہلے ہی تھا۔ اب جو وحید مراد سے مشابہت کا پتا چلا تو نزاکت بھی آگئی۔ باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنا شان کے خلاف لگا۔ تو شہر جانے کی ضد پکڑلی' کرم علی پیرزادہ نے بھی "ہیرو بیٹر" کو مجبوراً" شہر جانے کی اجازت دے دی قسمت اچھی تھی کہ فیکٹری میں کام مل گیا۔ یہیں شہر ہی میں ثمینہ بیگم سے شادی کی جن کا بھری دنیا میں ایک ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ عید تہوار کے مواقع پر گاؤں جاتے اور انہیں بھی شہر آنے پر اصرار کرتے لیکن ابھی تک ان کا شہر جانے کا پروگرام نہ بن سکا۔ لیکن اب مٹھو کی تعلیم کے لیے سب نے خوشی خوشی شہر کی طرف رخت سفر باندھ لیا۔

شہر جانے کا سب سے زیادہ شوق زہرہ خاتون کو ہو رہا تھا۔ جو گڈیوں کی پی پاں' نیلی پیلی بتیاں اور اوپر تلے بنی عمارتوں کو دیکھ دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھیں۔ رکشے میں بیٹھے دادا حضور خوامخواہ مدبر بنے ادھر ادھر کی معلومات جھاڑ رہے تھے گویا پکے شہری ہوں۔ وقتاً" فوقتاً" بچوں کی طرح اچھلتی کودتی زوجہ محترمہ کو بھی گھورتے جو سرتاج اور ان کی گھوریوں کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے پوتی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

"یہ پینڈو عورت مجھے شرمندہ کروا کر رہے گی۔"

شہر میں داخل ہوتے ہی دادا حضور کے خیالات سیاست دانوں کے بیانات کی طرح بدلنے لگے۔ رکشہ سبز بیلوں سے ڈھکے ہوئے گیٹ کے آگے رکا تو زہرہ خاتون جھومتی لہراتی بل کھاتی باہر نکلیں۔

"ہائے پیر صاحب! میرا سر چکریاں کھا رہا ہے۔"

زہرہ خاتون نے گرنے سے بچنے کے لیے سرتاج کا بازو دبوچ لیا۔ "پینڈوپن" کے اس خالص مظاہرے پر سرتاج کا خون کھول اٹھا۔ زہرہ خاتون کی نظر تنی ہو مونچھوں پر پڑی تو غصے کی شدت کا اندازہ ہوا' فور سے پیشتر بازو چھوڑ دیا۔

گلابی شام کے تمام رنگ اس چھوٹے سے آنگن میں اتر آئے۔ ثمینہ بیگم نے چائے پر اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا' کچھ چیزیں جواہر بیکری سے لے آیا۔

ثمینہ بیگم پتو سے گاؤں کے قصے سن رہی تھیں دادا حضور ثمینہ کی اماں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ خوش اخلاقی انتہا پر تھی۔ باچھیں یہاں سے وہاں تک چری جا رہی تھیں اور تو اور اس وقت مونچھیں بھی ذرا سکون میں تھیں' زہرہ خاتون پہلو بدل بدل کر تھک گئیں۔ سفید روئی جیسے بالوں والی خبطی بڑھیا سے زیادہ انہیں اپنے مجازی خدا پر غصہ آیا جنہوں نے شہر پہنچتے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

"تم کون کون سے سبجیکٹ رکھو گی؟" جواہر اپنا چائے کا کپ لے کر مٹھو کے پاس بیٹھ گیا۔

"جو سب سے آسان ہوں۔" دانتوں سے بسکٹ کترتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ انگریزی پڑھ کر مجھے چکر آنے لگتے ہیں' ریاضی میری سمجھ میں کبھی آئی نہیں' معاشرتی علوم سے زیادہ واہیات اور مشکل مضمون اور کوئی نہیں۔ سائنس پڑھ کر مجھے رونا آجاتا ہے اور....." اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان پر جواہر نے بری طرح ٹوک دیا۔

"مطلب یہ کہ تمہیں سرے سے پڑھنا ہی نہیں ہے۔"

کرسی کی بیک سے پشت ٹکائے ہوئے ہاتھ جھاڑے۔

"ارے واہ! پڑھنا کیوں نہیں ہے؟ اپنا گھربار چھوڑ کر اس کی پڑھائی کے لیے ہی تو یہاں آئے بیٹھے ہیں۔" شوہر نامدار سے مایوس ہو کر زہرہ خاتون نے چمک کر پوتے سے کہا۔ "ہماری مٹھو خیر سے پروفیسر بنے گی ہاں!"

دادی کی خوش فہمی پر جواہر کو ہنسی آگئی۔ "مٹھو اور پروفیسر؟ ہاہاہا۔"

ایک ہی طرز پر بنے دو پورشن والا گھر سب کو بہت پسند آیا' دوسرا پورشن جہاں پہلے کرایہ دار مقیم تھے ان لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ درمیان میں صرف ڈم ڈم کی باڑھ تھی اور کمروں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔

مٹھو کا داخلہ شہر کے بہترین اسکول میں کر دیا گیا۔ اور وہ رو پیٹ کر بالآخر میٹرک میں پہنچ ہی گئی۔ بدقسمتی سے مٹھو صاحبہ کا دل پڑھائی سے زیادہ نت نئے فیشن کرنے اور ٹی وی ڈرامے دیکھنے میں لگتا۔

زہرہ خاتون کو یہی غم کھائے جاتا کہ ان کی پوتی بے چاری سارا دن "کتاب" میں سر دیے بیٹھی رہتی ہے پھر بھی فیل ہو جاتی ہے' بھولی دادی کو یہ پتا نہ چل سکا کہ پوتی صاحبہ کورس کی کتابوں میں رسالے چھپا کر پڑھتی رہتی ہے۔ دادا حضور کا شک یقین میں بدل گیا کہ اسکول کی ناخلف استانی ان کی پوتی سے کوئی پرانی دشمنی چکا رہی ہے۔ گستاخ استانی کا سر قلم کرنے پر تل گئے۔ بمشکل "خاندانی غصہ" ٹھنڈا کرایا گیا' البتہ والد بزرگوار کی امیدوں کا چمن ابھی تک ہرا بھرا تھا' تین بار فیل ہونے کے باوجود بھی لاڈ سے "پروفیسر رانی" کہا کرتے آخر پدرانہ محبت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

"مٹھو! تیرا دادا کہاں ہے؟" زہرہ خاتون نے ٹی وی دیکھتی پوتی سے پوچھا۔

"ان کی نانی اماں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی رات میں انہیں پوچھنے گئے ہیں۔" پوتی کا جواب سن کر زہرہ خاتون کے دل میں بھانبھڑ جل اٹھے۔

جواہر کی نوکری لگنے کی خوشی میں ثمینہ بیگم نے ایک ساتھ مٹھائی کے کئی ڈبے منگوا کر رکھ دیے تاکہ مبارک باد دینے والوں کا منہ میٹھا کروا سکیں۔ رات کے کسی پہر نانی اماں کی آنکھ کھلی' پانی پینے کے لیے کچن میں گئیں تو نظر مٹھائی کے ڈبوں پر چپک گئی اور اندھا دھند مٹھائی کھاتے ہوئے یہ بھول گئیں کہ "چیز پرائی لیکن پیٹ تو اپنا ہے" نتیجتاً" ساری رات ٹوائلٹ

سے چلر لگاتے لرز گئی۔ سچ تک ادھ موئی ہو کر رہ گئیں۔

جواہر کی نانی اماں زیتون بانو شکل صورت سے بالکل چنگی بھلی تھیں لیکن دماغ کے اکثر پیچ ڈھیلے تھے۔ کبھی ان کا شجرہ نسب بادشاہ اکبر سے جا ملتا تو کبھی یوسف رضا گیلانی ان کے رشتہ دار نکل آتے۔ کبھی ملکہ الزبتھ انہیں اپنے بچپن کی سہیلی کی یاد ستانے لگتی اور کبھی آصف رضا میر کو اپنا سابقہ منگیتر قرار دیتیں۔ مٹھو کو دیکھ کر انہیں اپنی جوانی اور ٹائی ٹینک کی "روز" یاد آجاتی' ایک دن ثمینہ بیگم سے بولیں۔

"ثمینہ! تم نے شیخ رشید کو رشتے سے انکار کر کے اچھا نہیں کیا' بے چارہ ابھی تک تمہارا انکار سینے سے لگائے پھر رہا ہے۔"

ثمینہ بیگم شوہر کے سامنے ماں کی اس گوہر افشانی پر جی بھر کے شرمندہ ہوئیں۔

"ہائے میں لٹ گئی۔"

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی جو منظر ان کی گناہ گار آنکھوں نے دیکھا تو دل پچھاڑیں کھانے لگا۔ سفید روئی جیسے بالوں والی زیتون بانو پلنگ پر بیٹھی تھیں جبکہ پیر صاحب تھوڑے فاصلے پر کرسی رکھے بڑھیا سے باتیں بنا رہے تھے۔

"کیا ہوا آپا؟ سنا ہے نصیب دشمناں طبیعت خراب ہو گئی تھی' ظاہر ہے اس "عمر" میں بدپرہیزی کریں گی تو یہی نتیجہ نکلے گا۔"

زہرہ خاتون دوسری کرسی کھینچ کر پیر صاحب کے عین سامنے جم کر بیٹھ گئیں۔ مجازی خدا نے اس کھلم کھلا بدتہذیبی پر لاکھ آنکھیں دکھائیں موچھیں پھڑکائیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

"اچھا خانم! اب اجازت دیجیے۔ ان شاء اللہ شام کو ملاقات ہوگی۔" "مجبورا" کرتا جھاڑتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اس! یہ پیر صاحب شہر پہنچ کر خود کو "بابو" ہی سمجھنے لگے ہیں۔" زہرہ خاتون شوہر نامدار کی اس کایا پلٹ پر انگشت بدنداں تھیں۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ ملکہ ترنم نور جہاں نے مجھ سے کہا۔۔۔" نانی اماں پھر پٹڑی سے اتر گئیں۔

"براں مرا!" زہرہ خاتون ہاتھ جھٹک کر باہر نکل گئیں' ان کا مقصد تو پورا ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج ثمینہ بیگم' زہرہ خاتون کو جوڑوں کے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہوئی تھیں۔ گاؤں سے حمیدن خالہ مٹھو کے لیے اپنے بیٹے "مکھن" کا رشتہ لے کر آگئیں۔ پنو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کیونکہ ان کی "بیری" پر پہلا پہلا پتھر پڑا تھا اور وہ بھی اتنا "بھاری بھرکم" چنگھاڑتے ہوئے سبز رنگ کا ریشمی جوڑا زیب تن کیے اور صحت مند بازوؤں اور انگلیوں میں زیور پھنسائے خود کو "خوش حال" ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی تھی۔

"چاند' تارے' پھول' شبنم تم سے اچھا کون ہے؟" مٹھو گنگناتے ہوئے پودوں کو پانی سے نہلا رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا اس کی پشت پہ بکھرے گیلے بالوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔

اماں نے حمیدن خالہ کی آمد کی بابت بتایا تو پائپ ہاتھوں سے چھوٹ کر کیاری میں گر گیا۔ پانی یہاں سے وہاں تک پھیلتا چلا گیا۔ اماں کے کہنے پر حمیدن خالہ کو "مکھڑا" دکھانے کے لیے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

"ماں صدقے! میری مٹھو کتنی سندر ہو گئی ہے۔" اپنے صحت مند بازو میں مٹھو کو "پیار سے" دبوچ لیا کہ بس دم نکلنے کی کسر رہ گئی۔

بڑی مشکل سے خود کو "پیار بھرے چنگل" سے چھڑایا اور دوسرے صوفے پر ڈھے کر سانسیں ہموار کرنے لگی۔ "کنگ شو کا زنانہ ایڈیشن! پیار کا یہ حال ہے تو غصہ کا کیا ہوگا؟"

گردن سہلاتے ہوئے خاصی ناگواری سے "نہ ہونے والی" ساس کو دیکھا۔

"مکھن صاحب" ناک پہ رومال رکھے مسلسل شرمائے جا رہے تھے۔ گاہے بگاہے ایک آدھ چور نظر

مٹھو پر بھی ڈال دیتے۔ مٹھو نے ابرو چڑھا کر اس بری طرح سے گھورا کہ موصوف صوفے میں ہی دبک گئے۔ پنو چائے کی ٹرالی گھسیٹتی اندر آئی تو وہ رسی تڑوا کر بھاگ نکلی۔

خالہ حمیدن اپنے گاؤں سے ڈھیر ساری سوغاتوں کے ساتھ دو عدد موٹی تازی مرغیاں بھی لائی تھیں۔ جنہیں ان کے رخصت ہونے کے بعد پنو نے جھٹ کر ڈربے کے اندر بند کر لیا کہ پنو کی شادی کے بعد گھر میں مرغیوں کا داخلہ ممنوع تھا کیونکہ مرغی کا نام لیتے ہی زہرہ خاتون کو اپنی "چوری شدہ" مرغیاں یاد آجاتیں اور ساتھ ہی "چورنی" بھی۔

ہسپتال سے واپسی پر زہرہ خاتون کو حمیدن خالہ کی آمد کا پتا چلا تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔

"ارے اس مرن جوگی کی ہمت کیسے ہوئی اپنے "کلوٹے" بیٹے کے لیے میری شہزادیوں جیسی پوتی کا ہاتھ مانگنے کی۔ زہرہ خاتون نہیں بھولی وہ دن جب یہ موٹی منج میرے خلاف میری بہری ساس مرحومہ کے کان بھرا کرتی تھی اور وہ بڑی بی بہری تو تھیں ہی پر کانوں کی بھی ایسی کچی نکلیں کہ اس کلموہی کی باتوں میں آکر کبھی مجھے سکھ کا ساہ نہیں لینے دیا۔"

گزرے دنوں کی تکلیف دہ یادوں نے زہرہ خاتون کو چھکوں پھکوں رونے پر مجبور کر دیا۔

"ارے نیک بخت! اب بس بھی کر۔ ہم نے کون سا وہاں ہاں کر دی ہے؟" دادا حضور سے زوجہ محترمہ کی حالت دیکھی نہ گئی۔ بالوں پر خضاب لگاتے ہوئے تسلی دی۔

"پٹی؟ پٹی کدھر گئی؟" پھٹے گلے سے بمشکل آواز نکلی۔

پنو نے بھاگ کر مشہور زمانہ پٹی ساس کے ہاتھوں میں تھمائی۔

"کھاں چھم چھم وسیاں ہائے!"

مٹھو غمگین بنی پھول کی پتیاں ایک ایک کر کے ہوا میں اچھالتی جا رہی تھی۔

"ہائے ربا! اس "شرمیلے میمنے" سے شادی کرنے سے اچھا ہے کہ میں چوہے مار دوا پھانک لوں (لیکن اس سے تو پیٹ میں درد شروع ہو جائے گا) چلو پنکھے سے لٹک جاؤں (پر بجلی آئے گی تو ہی پنکھا چلے گا ناں) کم از کم نہر میں تو کود ہی سکتی ہوں (پر تیرنا بھی تو نہیں آتا کہیں ڈوب ووب گئی تو۔۔۔؟) یا پھر۔۔۔ یا پھر!"

پھول کی ساری پتیاں ختم ہو گئیں تو اس نے برہنہ ٹہنی دور اچھال دی۔

"یا پھر جواہر پیرزادہ سے شادی کر لوں!"

عقب سے آتی جواہر کی آواز سن کر وہ چونک کر پیچھے مڑی۔

جواہر نے سرخ مہکتا ہوا گلاب اس کی طرف بڑھایا جسے تھام کر مٹھو نے کان کے اوپر بالوں میں اڑس لیا۔

"لیکن میری ایک شرط ہے۔" اس کے گلابی چہرے سے نظر ہٹاتے ہوئے وہ لہجہ بدل کر بولا۔

"کون سی شرط؟"

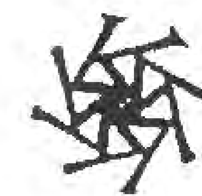
"تم اس سال میٹرک پاس کرو گی اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں۔ بولو منظور ہے؟"

"ہاں! تو یہ بھلا کون سا مشکل کام ہے؟ وہ تو اتنے سالوں سے میرا پاس ہونے کا موڈ نہیں بن رہا تھا ورنہ اب تک بی اے نہ کر چکی ہوتی۔ پر میں سوچ رہی ہوں' اس بار پاس ہو ہی جاؤں۔" مٹھو کے یوں بے نیازی سے کہنے پر جواہر ہنس پڑا۔

"ہمارے دونوں بچے ایک ساتھ کتنے پیارے لگ رہے ہیں ناں؟" نانی اماں نے ساتھ کھڑی زہرہ خاتون سے محبت سے چور لہجے میں کہا۔

"ہاں! اللہ جوڑی سلامت رکھے۔"

انہوں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور مسکرا دیں۔



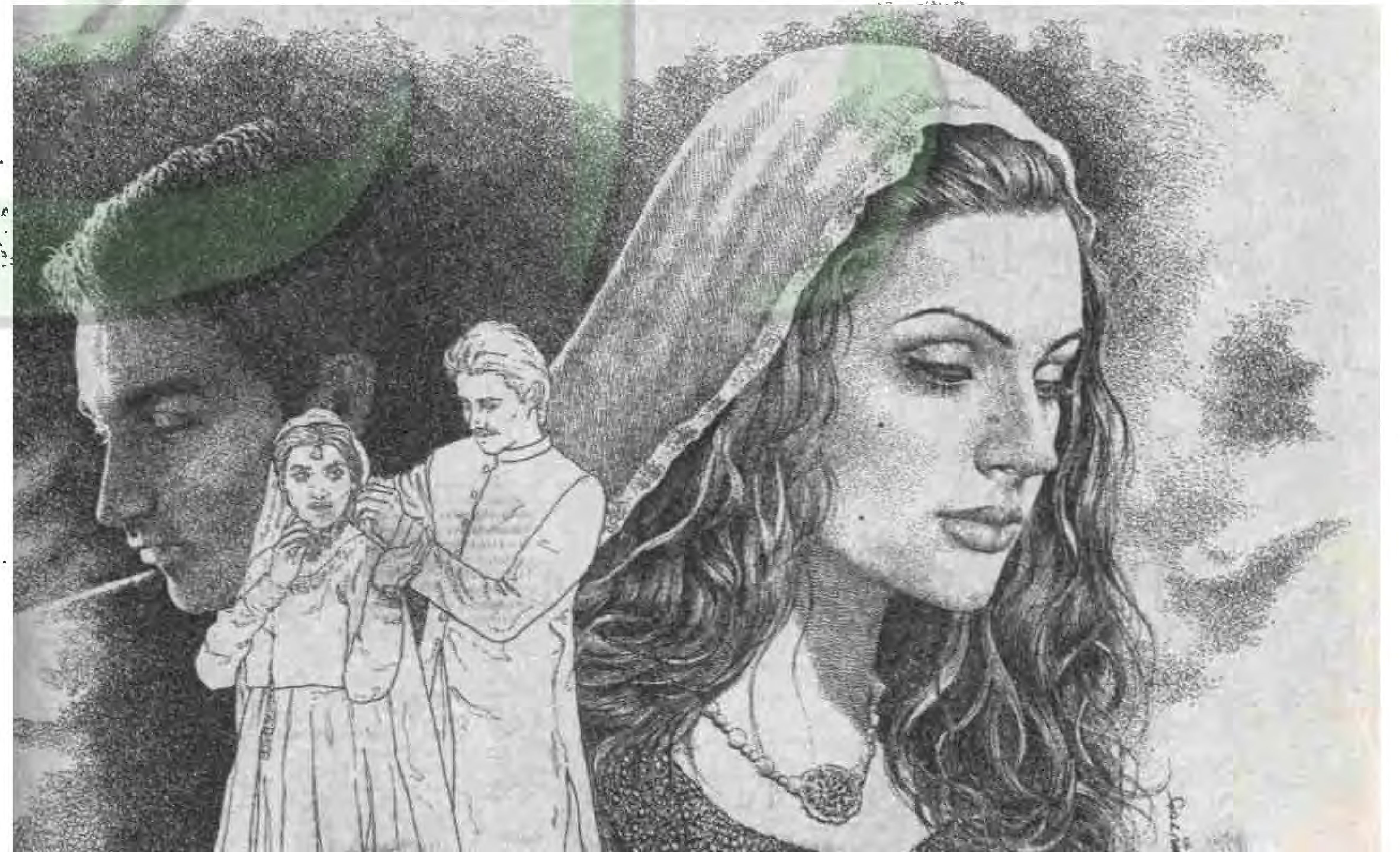
فرحت اشتیاق

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

شہریار خان معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھنے والے بے مثال ذہانت اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ایک مغرور شخص ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ خوب صورت اور ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں مگر گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ سکندر اور زین ان کے دو بیٹے ہیں۔ سکندر اپنے باپ کا عکس ہے اس لیے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ زین ذہانت میں سکندر سے کم ہے۔ باپ کے امتیازی سلوک کی وجہ سے سکندر سے خائف رہتا ہے۔

محمود خالد نے عیسائی عورت وٹوریا سے شادی کی مگر دونوں میں نبھ نہ سکی اور لیزا اور سیم کی پیدائش کے بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ سیم اپنے باپ کی طرح ذہین اور خوب صورت تھی۔ علیحدگی کی صورت میں اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا پڑا۔ لیزا ذہانت و خوب صورتی میں درمیانے درجے کی تھی۔ وہ محمود خالد کے پاس رہی۔ وٹوریا نے ارب پتی بزنس مین سے دوسری شادی کی اور میلان چلی گئی۔ نشے کی حالت میں وٹوریا کا دوسرا شوہر سیم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لیزا کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ محمود خالد کو چھوڑ کر اپنی نینی کے ساتھ روم شفٹ ہو جاتی ہے۔

محمود خالد عائشہ سے دوسری شادی کر کے پاکستان شفٹ ہو جاتے ہیں۔ محمود خالد اپنا کاروبار بچانے کے لیے سیم کی شادی اس سے پندرہ سال بڑے ہاشم اسد سے کروا دیتے ہیں۔ لیزا کو اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے پاکستانی مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیزا ایک مصورہ ہے۔ روم میں ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔



زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین' سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار' سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم' زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں امو جان رو' رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں' وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے' ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔

سکندر دوبا چلا جاتا ہے لیزا کو ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم' محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بد تمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔ سکندر کو دوبا میں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ لیزا نہیں ہوتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

سکندر دوبا آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلورنس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایگزیبیشن کا پہلا دن گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مردانہ وقار مضروب ہو چکا ہے۔ وہ ندامت محسوس کرتا ہے اور ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی منگیتر ام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے' اسے رجھانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی گھٹیا الزام لگا کر اسے اپنے گھر والوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

ام مریم ہاشم کی بیوی کو طلاق دلوا کر اس سے شادی کرتی ہے مگر بڑی ہوشیاری سے یہ بات چھپاتی ہے۔

سکندر نے لیزا کے لیے انگوٹھی خریدی۔ لیزا' خالد محمود کو اور سکندر امو جان کو اپنی شادی کے فیصلے سے آگاہ کرتا ہے وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ امو جان سکندر سے ملنے پر اصرار کرتی ہیں۔ وہ وعدہ کر لیتا ہے۔ لیزا کی ایگزیبشن ختم ہو جاتی ہے۔ وہ دوبا میں پورا دن سکندر کے ساتھ گزارتی ہے۔ سکندر اس کو شاپنگ کرواتا ہے۔ دوبا سے وہ کراچی کے لیے روانہ ہوں گے۔ شہریار خان آمنہ بیگم سے لیزا کے لیے زیورات خریدنے کو کہتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔

۱۰
دسویں قسط

"کراچی سے واپس آ کر ہم فوراً" شادی کر لیں گے۔ میں اب تمہیں لندن یا روم واپس نہیں جانے دوں گا۔"

وہ دونوں ایئر پورٹ جانے کے لیے فلیٹ سے نکل رہے تھے تب وہ لیزا کا ہاتھ تھام کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کی شدت تھی۔

"دیکھا میری محبت کا اثر۔ تم بھی رومانٹک ہوتے جا رہے ہو۔" وہ ہنس کر بولی۔

"تمہارے جیسا رومانٹک میں ابھی بھی نہیں ہوا۔ پرسنلائزڈ مگ یا "کی ٹومائی ہارٹ والا....." وہ شرارت بھرے انداز میں بولا۔

"یعنی میں یہ سمجھوں کہ تم ہماری شادی والے دن آفس جاؤ گے اور مجھے ہنی مون پر بھی نہیں لے کر جاؤ گے؟" اس نے مصنوعی ناراضی سے اسے گھورا۔

"ہو سکتا ہے' ایسا ہی ہو۔" وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر بولا۔

"کر کے تو دیکھو تم ایسا۔ حشر کر دوں گی میں تمہارا۔"

"ہونے والے شوہر کی کیا رسپیکٹ کی جا رہی ہے' سبحان اللہ....." وہ اس کی دھمکی پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔



اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تمام دن اس سے اس موضوع پر کسی نے بات نہیں کی تھی' پھر بھی وہ جانتا تھا کل صبح سکندر' امو جان سے ملنے کراچی آ رہا ہے۔ اس نے آج شہریار خان کو نویرہ سے گفتگو کرتے بھی سنا تھا' جو وہ کل سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی کی فارم ہاؤس پر دعوت کے انتظامات کے حوالے سے کر رہے تھے۔

شہریار خان کو امو جان کی بیماری نے انہیں اس حد تک توڑ دیا تھا کہ وہ ان کا دل خوش کرنے کے لیے سکندر کی شکل دیکھنے کو راضی ہو گئے تھے؟

جو بھی ہو' کم از کم وہ سکندر کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی بیوی اور بچے کے بھی وہاں جانے پر اعتراض تھا مگر آج بھی ان کے گھر میں حکم شہریار خان ہی کا چلتا تھا۔ اگر وہ ان کے حکم کے خلاف جا کر اپنی بیوی اور بچے کو روک لیتا تو یقیناً" شہریار خان سخت غصے اور برہمی کا اظہار کرتے اور امو جان جو برسوں بعد اتنی خوش نظر آ رہی تھیں' ان کی خوشی دکھ اور آنسوؤں میں بدل جاتی۔ لہٰذا نویرہ اور علی کے کل شہریار خان اور امو جان کے ساتھ فارم ہاؤس جانے پر اس نے خاموشی اور بے نیازی والا رویہ اختیار کر لیا۔

بہت کڑوی سچائی تھی یہ مگر تھی سچائی' اسے ماننی پڑ رہی تھی کہ اس نے پورے بارہ سال بعد اپنی امو جان کو اتنا خوش دیکھا تھا۔ اتنا خوش وہ اس کے ہارورڈ سے لاء پاس کر لینے پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی شادی پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ علی کی پیدائش پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ جس شخص کے سبب یہ خوشی تھی' اس سے اسے جتنی بھی نفرت تھی مگر اپنی ماں کی ہنسی اور ان کی خوشی اسے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز تھی۔ وہ ماں کے دل کی یہ خوشی اور چہرے کی یہ ہنسی سدا قائم دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنی بیوی اور بچے کو ماں باپ کی خاطر سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی سے ملنے دے سکے' اتنی وسعت وہ کوشش کر کے اپنے اندر پیدا کر چکا تھا۔

سکندر کو نفرت سے سوچتے ہوئے آج پھر اسے ام مریم بری طرح یاد آ رہی تھی۔ کہاں ہو گی وہ؟ سکندر شہریار صرف اس کا نہیں' وہ ام مریم کا بھی مجرم تھا۔ اس کے تصور میں بار بار بارہ سال پہلے کا وہ دن آ رہا تھا' جب ام مریم اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی تھی۔

جس کے سبب وہ اس سے جدا ہوئی وہ شخص آنے والی صبح واپس آ رہا تھا۔



وہ دونوں جہاز میں ساتھ بیٹھے تھے۔ جہاز میں بیٹھتے ہی سکندر بالکل گم صم اور چپ چپ سا ہو گیا تھا۔ وہ اسے ڈسٹرب نہیں کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی' سکندر اس وقت اپنی امو جان کو سوچ رہا ہے۔ وہ آج برسوں

بعد ان سے ملنے والا ہے۔ اس کے دل کی عجیب حالت ہوگی۔ چار سال قبل وہ ان کی شدید بیماری میں ان سے ملا تھا۔ آج وہ نجانے کتنے سارے احساسات ایک ساتھ اپنے دل میں پیدا ہوتے محسوس کر رہا ہو گا۔ اسے اپنا تلخ اور غم سے بھرا ماضی بھی شدت سے یاد آرہا ہو گا۔ سکندر کو شاید اس وقت خاموشی درکار تھی سو اسے خاموشی فراہم کرکے وہ خود سیم کو سوچنے لگی تھی۔

سیم اس سے خفا تھی۔ اس نے روم سے دوبارہ روانہ ہونے سے قبل اسے کال کرکے اپنی کراچی آمد کا ٹائم بتایا تھا۔ اس نے ٹھیک سے بات نہیں کی تھی۔ فون بھی "فوراً" ہی بند کر دیا تھا۔ محمود خالد نے یہ جاننے کے لیے وہ کب اور کس فلائٹ سے کراچی پہنچ رہی ہے' فون کیا تو اس نے ٹائم نہیں بتایا تھا۔ کہہ دیا تھا کہ ابھی اس نے سیٹ بک نہیں کروائی ہے۔ خواہش تھی اسے ایرپورٹ پر لینے صرف اور صرف سیم آئے۔

سیم سے ایرپورٹ پر مل کر پھر وہ محمود خالد کے گھر چلی جائے گی۔

اس روز فون پر وہ محمود خالد کی جذباتی باتوں کے حصار میں آگئی تھی۔ بعد میں روم جاکر جب اس نے سوچا تو اسے لگا' سیم ٹھیک کہتی ہے ان کے پاپا کو ان بہنوں سے اپنی مرضی کے فیصلے کروانے آتے ہیں۔ اس سے جذباتی انداز میں باتیں کرکے اسے اس بات کے لیے آمادہ کروالیا کہ وہ کراچی آکر ان کے پاس ٹھہرے۔ وہ ان کے گھر پر ٹھہرے گی ضرور مگر اپنی زندگی کے کسی بھی معاملے میں انہیں آج بھی ایک لفظ نہیں کہنے دے گی۔

☆ ☆ ☆

وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ساری رات ایک پل کے لیے بھی انہوں نے پلکیں تک نہیں جھپکیں۔

"اس وقت سکندر ہوائی جہاز میں ہو گا۔۔۔ اور اس کے ساتھ لیزا بھی ہوگی۔" انہوں نے زیر لب بہت پیار سے یہ نام لیا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ بے قرار ہو کر وہ اٹھ کر بیٹھیں۔ فجر میں ابھی وقت تھا۔ سوچا' تہجد کی نماز ہی ادا کرلی جائے۔ وہ بغیر کوئی آہٹ' کوئی شور پیدا کیے بیڈ سے خاموشی سے کھڑی ہو رہی تھیں۔

"کیا ہوا آمنہ! نیند نہیں آرہی کیا؟"

شہریار خان کی آواز پر وہ چونک کر مڑیں۔ وہ بھی جاگ رہے تھے۔

"جی۔" وہ ان سے یہ نہیں کہہ سکیں کہ روز غم انہیں سونے نہیں دیتے تھے' آج خوشی میں انہیں نیند نہیں آرہی ہے۔ آج ان کی عید کا دن ہے۔ ان ماں بیٹے نے جو بن باس کاٹا ہے' آج اس کے ختم ہونے کا دن ہے۔

مختصر سا جی کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف جانے لگی تھیں' جب شہریار خان کی آواز نے انہیں روک لیا۔

"سکندر کس وقت پہنچ رہا ہے؟"

"پون گھنٹہ باقی ہے۔" وہ ان کی طرف دیکھ کر آہستگی سے بولیں۔

"کیا ایرپورٹ جانا چاہتی ہو اس سے ملنے؟" آمنہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ حیرت سے شہریار خان کو دیکھ رہی تھیں۔

"جی' کیا میں چلی جاؤں؟" انہوں نے محتاط سے لہجے میں اپنی خوشی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں چلی جاؤ۔۔۔ مگر اتنی صبح سویرے تمہارا ڈرائیور کے ساتھ جانا مناسب نہیں۔ میں تمہیں لے چلتا ہوں۔" شہریار خان سنجیدگی سے بولتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

وہ بے تحاشا حیران ہوئی تھیں۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ اور شہریار خان ایرپورٹ جانے کے لیے گھر سے نکل چکے تھے۔ شہریار خان گاڑی چلا رہے تھے۔ سڑکوں پر اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے وہ دونوں ایرپورٹ جلدی پہنچ گئے تھے۔

"سکندر سے آج شام پانچ' ساڑھے پانچ بجے فارم ہاؤس آنے کا کہہ دینا۔" ایرپورٹ پہنچ کر وہ ان سے بولے۔

"جی۔ آپ بھی آرہے ہیں کیا؟" آمنہ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ شہریار خان نے گاڑی پارکنگ میں لے جاکر روکی۔

"نہیں تم مل آؤ۔ میں تمہارا یہیں انتظار کررہا ہوں۔"

ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ اردگرد اندھیرے کے سبب وہ شہریار خان کے تاثرات ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔ وہ سنجیدہ تو تھے مگر سنجیدگی کے ساتھ کچھ اور بھی تھا ان کے لہجے میں۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھیں۔ سرہلا کر خوشی سے سرشار وہ گاڑی سے اتر گئیں۔ سامنے ہی انٹرنیشنل ارائیول نظر آرہا تھا۔ بس کسی بھی لمحے ان کا سکندر ان کی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ وہ دل ہی دل میں مسلسل دعائیں مانگ رہی تھیں۔

"یا اللہ! مجھے خیریت سے میرے سکندر سے ملا دے۔" سامنے سے مسافر ٹرالیاں چلاتے باہر نکلتے نظر آرہے تھے۔

وہ جو سامنے سے اس طرف آتا نظر آرہا ہے۔ وہ ان کا سکندر ہی ہے۔ خوب صورت' وجیہہ' بھرپور توانا مرد ان کا بیٹا۔ ان کا دل فخر اور خوشی سے بھر گیا۔ انہوں نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔ نظر کی دعا پڑھ کر دور سے اس پر دم کی۔ ان کی نگاہیں اس پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ اس کے ساتھ چلتی لڑکی کو انہوں نے ابھی تک توجہ سے دیکھا نہیں تھا۔ ان کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ خوشی تھی کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

سکندر ان کی نظروں کے سامنے ہے۔ ان کا بیٹا ان سے ملنے ان کے پاس آچکا ہے۔ ایک پل انہیں خوشی سنبھالنے میں لگا تھا۔

اگلے پل وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھی تھیں۔

✲ ✲ ✲

سکندر نے امو جان کو دیکھ لیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی اس نے انہیں آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے والہانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ ٹرالی لیزا کے پاس چھوڑ کر خود تیز قدم اٹھا کر ان تک پہنچا۔

"السلام علیکم امو جان۔" آمنہ نے بہت تڑپ کر اسے اپنے گلے سے لگایا تھا۔

"یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے' تونے مجھے میرے بچے سے ملوادیا۔" وہ اسے گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں۔ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے گلے لگے ان کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ ان کا مضبوط اور توانا بیٹا اپنی بیمار اور غم سے نڈھال ماں کو سہارا دیے کھڑا تھا۔ اس نے لیزا کا اپنے اور امو جان کے پاس آکر کھڑا ہونا محسوس کیا تھا۔

"بس امو جان! اس طرح مت روئیں۔ آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

اس نے پیار سے ان کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا۔ ماں کے آنسوؤں سے اس کا شانہ بھیگ چکا تھا۔ وہ ان کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کررہا تھا۔

"میں آتو گیا ہوں آپ کے پاس۔ اب آپ کیوں رو رہی ہیں؟" اس نے پیار سے ماں کے ہاتھ تھام کر کہا۔

"یہ خوشی کے آنسو ہیں بیٹا! یہ شکر گزاری کے آنسو ہیں۔" آمنہ نے والہانہ انداز میں اس کا ماتھا چوما۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھے جارہی تھیں۔ ان کی نگاہیں اس پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔

"امو جان! آپ لیزا سے تو ملی نہیں۔" اس نے مسکرا کر اپنے ساتھ کھڑی لیزا کی جانب اشارہ کیا۔ آمنہ نے اب پہلی بار لیزا کو توجہ سے دیکھا تھا۔

"السلام علیکم آنٹی!" لیزا نے فورا" انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" لیزا کا سلام اگر ہچکچاہٹ اور تکلف لیے ہوا تھا تو آمنہ کا جواب اتنی ہی بے تکلفی اور والہانہ پیار لیے ہوا تھا۔ انہوں نے لیزا کو بھی اسی طرح گلے لگایا تھا۔ وہ خاموش کھڑا ماں کو لیزا کو گلے لگاتے اور پھر اس کا ماتھا چومتے دیکھ رہا تھا۔

"آنٹی نہیں' ماں ہوں تمہاری' جیسے سکندر کی

ہوں۔ مجھے امو جان بولو گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔" وہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماں لیزا کے چہرے کو بہت پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

"جی امو جان۔" لیزا کی ہچکچاہٹ اور تکلف آمنہ کی والہانہ محبت کے آگے مسکراہٹ اور اپنائیت میں چند لمحوں میں بدل گئی تھی۔

"سکندر! میری بہو بہت پیاری ہے۔" لیزا کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا۔

وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ لیزا کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی' وہ اس کی ماں کو یونہی اچھی لگتی کہ وہ ان کے بیٹے کی پسند ہوتی۔

"آپ کس کے ساتھ آئی ہیں امو جان؟" اسے یک دم ہی خیال آیا۔

"تمہارے پاپا کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ گاڑی میں بیٹھے ہیں۔" آمنہ آہستگی سے بولیں۔ تمہارے پاپا کے الفاظ اسے بہت عجیب سے لگے تھے' درحقیقت اسے برے لگے تھے مگر برسوں بعد ماں سے ملنے پر وہ خوشی کے موقع پر کوئی بدمزگی والی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"وہ میرا انتظار کررہے ہوں گے۔ میں اب چلوں۔" اس کے چہرے کو پیار سے تکتے ہوئے وہ بولیں۔ انہوں نے پھر اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ جانے کی بات کررہی تھیں اور اس کے ہاتھ تھام کر کھڑی تھیں۔ جیسے ڈر تھا اگر اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ پھر کہیں کھو جائے گا۔

"جی امو جان! آپ اب گھر جاکر آرام کیجیے۔ تھوڑا دن نکل آئے پھر ہم دوبارہ ملیں گے۔ کہیں ساتھ بیٹھ کر خوب ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔" اس نے دیکھا آمنہ اس کی بات سن کر کچھ سوچنے لگی تھیں۔ ایک پل کی سوچ کے بعد انہوں نے سکندر کے بجائے لیزا کو مخاطب کیا۔

"لیزا بیٹا! تمہاری اور سکندر کی آج شام میری طرف سے دعوت ہے ہمارے فارم ہاؤس پر۔ شہر کی حدود سے ذرا باہر نکل کر ہے ہمارا فارم ہاؤس۔ اس لیے گھر سے تھوڑا جلدی نکل جانا۔ یہ وہاں کا ایڈریس ہے۔"

انہوں نے پرس سے ایک تہہ کی ہوئی چٹ نکال کر لیزا کے ہاتھ میں پکڑائی۔

"امو جان! دعوت وغیرہ کو رہنے دیں۔ میں اور لیزا اس کے بغیر ہی آپ سے مل لیں گے۔" وہ واضح اور صاف لفظوں میں منع نہیں کرپایا تھا۔

فارم ہاؤس پر کون دے رہا تھا... دعوت؟ وہاں پر کس کس نے موجود ہونا تھا... وہ سب جانتا تھا مگر وہ نہ کسی سے ملنا چاہتا تھا' نہ کسی کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔

"میں تم سے نہیں اپنی بہو سے بات کررہی ہوں۔" آمنہ نے فورا" ہی اسے سخت انداز میں ڈانٹ کر چپ کروادیا تھا۔

اب انہوں نے اس کے ہاتھ چھوڑ کر بہت پیار سے لیزا کے ہاتھ تھامے تھے۔

"تمہاری سنتا ہے یہ؟"

"جی!" لیزا ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھ کر جس پر واضح لفظوں میں کسی بھی دعوت اور فارم ہاؤس پر جانے سے انکار لکھا تھا۔ آمنہ سے قدرے ہچکچا کر بولی۔ وہ جیسے الجھن میں آگئی تھی کہ ماں کی سنے یا بیٹے کی طرف دیکھے۔

"تو پھر آج شام اسے ساتھ لے کر ہمارے فارم ہاؤس آجانا۔ میں تم دونوں کا شدت سے انتظار کروں گی۔" وہ بڑی امید سے لیزا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"میں اور سکندر آج شام آپ کے پاس ضرور آئیں گے امو جان!" لیزا نے بے اختیار انہیں یقین دلایا۔

"وعدہ کررہی ہو ناں؟"

"میں آپ سے وعدہ کررہی ہوں امو جان۔"

"مجھے مایوس مت کرنا۔ برسوں بعد مجھے کوئی خوشی ملی ہے۔ اس خوشی کو مایوسی میں مت بدلنا۔ میں بہت شدت سے منتظر رہوں گی تم دونوں کی۔"

"امو جان! ہم دونوں آپ کے پاس ضرور آئیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔" لیزا پر یقین لہجے میں محبت سے بولی۔

"جیتی رہو بیٹا! اللہ تمہارے وجود سے میرے بیٹے کے گھر کو سدا سجائے رکھے۔ تم دونوں کا دامن خوشیوں سے بھردے۔"

وہ ایک بار پھر والہانہ انداز میں لیزا کو پیار کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں نمی لیے وہ التجا کرتی نظروں سے سکندر کو دیکھنے لگیں۔ انہوں نے بے اختیار اسے پھر گلے لگالیا تھا۔

ان کی پُرنم سی آنکھیں بے آواز اس سے مخاطب تھیں۔ نہ ماں ایک لفظ بولی تھی' نہ جواب میں اس نے کچھ کہا تھا۔ بس نگاہیں نگاہوں سے مخاطب تھیں۔ اپنا درد اور کرب ایک دوسرے کو بتا رہی تھیں۔

"میں چلتی ہوں۔" چند سیکنڈز بعد خود پر قابو پا کر وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔

وہ خاموش کھڑا رہا تھا۔ لیزا انہیں خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ وہ واپس پلٹ گئی تھیں۔ وہ اسی طرح ساکت تھا۔ لیزا اس کے ساتھ کھڑی خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

"آئم سوری سکندر! میں جانتی ہوں تم امو جان کی دعوت ایکسیپٹ نہیں کرنا چاہتے تھے مگر وہ جس طرح کہہ رہی تھیں' انہیں انکار کرنے کے لیے پتھر کا دل چاہیے تھا۔ وہ بہت دکھی ہیں سکندر! ان کا دل خوش کرنے کے لیے یہاں تک آگئے ہو تو اب وہ جہاں بلا رہی ہیں' صرف ان کا دل خوش کرنے کے لیے وہاں بھی چلو۔ اگر ہم نہیں گئے تو ان کا دل بہت دکھے گا۔ ہم نہیں گئے تو وہ کتنا روئیں گی۔"

لیزا نے اس سے آہستگی اور نرمی سے کہا۔ وہ پھیکے سے انداز میں سرہلا کر مسکرادیا۔

"ہم شام میں چل رہے ہیں ناں؟" لیزا نے امید سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔" وہ ایک تھکی ہوئی لمبی سانس لے کر بولا۔ "نسیم نہیں آئی تمہیں لینے؟ تم نے کہا تھا وہ تمہیں لینے آنے والی ہے۔" اس نے یک دم ہی موضوع تبدیل کردیا۔

"ہاں پتا نہیں کیوں' اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔" لیزا نے اردگرد ہر طرف نگاہیں دوڑائی تھیں۔

"تم فون کرلو۔" لیزا سرہاں میں ہلا کر فوراً" ہی اپنی بہن کو فون ملانے لگی تھی۔

"کیا ہوا؟" کئی مرتبہ کوشش کرنے کے بعد بھی جب لیزا کا اس سے رابطہ نہیں ہوسکا' تب اس نے پوچھا۔

"بیل جارہی ہے۔ مگر نسیم کال ریسیو نہیں کررہی۔ اس کے لینڈلائن نمبر پر بھی کال ریسیو نہیں ہورہی۔" اس نے دیکھا لیزا کے چہرے پر مایوسی آگئی تھی۔

"ہوسکتا ہے اس کی آنکھ نہ کھلی ہو۔" اس نے لیزا کو تسلی دینی چاہی۔

"میرے آنے پر اس کی آنکھ نہ کھلی ہو؟ تمہیں پتا ہے سکندر! نسیم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار پاکستان آئی ہوں۔ میرا آنا نسیم کے لیے اتنا معمولی واقعہ نہیں ہوسکتا کہ وہ سوتی رہ جائے۔" وہ قدرے خفگی سے بولی۔

"لیکن اب تم اس طرح یہاں کھڑی تو نہیں رہ سکتیں ناں۔ چلو میں ہوٹل جاتے ہوئے پہلے تمہیں تمہارے پاپا کے گھر ڈراپ کردیتا ہوں۔ وہاں جاکر تم پتا کرلینا کہ نسیم تمہیں لینے کیوں نہیں پہنچ سکی۔"

سکندر رسانیت سے بولا۔ لیزا نے جواباً سراثبات میں ہلا دیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا' لیزا کے چہرے پر مایوسی سی پھیل گئی ہے۔ وہ اپنی بہن کے ایئرپورٹ نہ آنے پر دکھی ہوگئی تھی۔



سکندر نے کیب کرلی تھی۔ اس نے پہلے اسے اس کے پاپا کے گھر ڈراپ کیا' وہ خود اپنے ہوٹل چلا گیا۔ چوکیدار نے اس کے لیے گیٹ کھولا۔ وہی اسے لاؤنج تک چھوڑ کر بھی چلا گیا اور اسی نے انٹرکام پر محمود خاور کو اس کی آمد کی اطلاع دی تھی کہ اتنی صبح ابھی وہاں نہ گھر کا کوئی فرد موجود تھا نہ ہی کوئی ملازم۔

"میری بیٹی آئی ہے۔" محمود خالد اور ان کے پیچھے عائشہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے پاس آرہے تھے۔ وہ ان دونوں کو آتا دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ باپ کے گھر آئی تھی مگر دل میں ایسا لگ نہیں رہا تھا کہ اپنے باپ کے گھر ہے۔

محمود خالد کے چہرے پر والہانہ خوشی بکھری تھی۔ اس کے پاس آتے ہی انہوں نے محبت سے اسے گلے لگالیا۔

"السلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں اپنے آنے کا؟ میں تمہیں ایئرپورٹ لینے آتا۔"

اس کے چہرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ وہ جواباً" چپ رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ اپنی آمد کا فون پر نہ بتانے کی کیا توجیح دے۔ باپ کی بے تحاشا خوشی اسے مصنوعی نہیں لگ رہی تھی۔ اسے ان کی آنکھوں میں نمی نظر آرہی تھی۔ اسے ہلکی سی ندامت ہوئی۔

"خیر تم آگئیں کلثوم! میرے لیے تو یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔ آج کتنے سالوں بعد میں اپنی بیٹی کو دیکھ رہا ہوں۔" انہوں نے جیسے اس کی ندامت محسوس کرلی تھی۔ اس لیے فوراً" ہی مسکرا کر خوشی سے بھرپور انداز میں بولے۔ عائشہ مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کیسی ہیں آنٹی؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پتا ہے' محمود بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کررہے تھے۔ کل رات بھی دیر تک مجھ سے تمہاری ہی باتیں کرتے رہے۔ صبح صبح اچانک پہنچ کر تم نے ہمیں بڑا زبردست سرپرائز دیا ہے۔"

اس کے دل میں جاگا ندامت کا احساس محمود خالد اور عائشہ دونوں نے فوراً" ہی دور کردیا تھا۔

"عائشہ! ناشتے وغیرہ کا انتظام کرو۔ میں کلثوم کو اس کا کمرا دکھادوں۔" محمود خالد اس کا ہاتھ تھام کر بولے عائشہ نے مسکرا کر سراثبات میں ہلایا۔

"آؤ بیٹا!" انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"تمہارا سامان میں ابھی کمرے میں رکھوادوں گا۔" وہ کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے بولے۔ فون پر بات کرتے ہوئے جذبات کو سرد کرلینا' سرد و سپاٹ انداز اختیار کرلینا مختلف بات تھی۔ آمنے سامنے ان کی والہانہ چاہت کے اظہار کے سامنے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اپنا سرد انداز کس طرح برقرار رکھے؟

"جب میں نے یہ گھر خریدا تھا۔ تب ہی یہ کمرا تمہارے لیے منتخب کرکے اسے تمہارے لیے سجالیا تھا۔ میں نے سوچا تھا' میری آرٹسٹ بیٹی کے لیے یہی کمرا ہونا چاہیے۔ یہ دیکھو! یہاں کھڑکی سے باہر ہمارے لان کا کتنا خوب صورت منظر نظر آرہا ہے۔"

اس سے بولتے ہوئے انہوں نے کھڑکی پر سے پردے ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ کھڑکیاں کھلتے ہی لان کا سرسبز اور خوب صورت منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ لان میں لگے خوب صورت پھول' پودے' درخت' گھاس اور سب سے بڑھ کر لان کے بیچوں بیچ بنے فوارے سے گرتا پانی' بہت خوب صورت منظر تھا۔ مگر وہ اس منظر کو نہیں' وہ اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

"خوب صورت لگ رہا ہے نا یہاں سے لان کا ویو۔" محمود خالد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"جی!" باپ سے باتیں کرنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' ان سے کیا کہے۔

"ایک چیز اور بھی ہے تمہارے لیے۔ دکھاؤں؟" وہ مسکرا کر بولے' انداز میں بچوں کی سی خوشی تھی۔

"جی پاپا! دکھائیے۔"

"تم ابھی تھکی ہاری گھر پہنچی ہو۔ سوچ رہی ہوگی پاپا بھی کیا بچوں جیسی باتیں کررہے ہیں' مگر میرا دل چاہ رہا ہے۔ تمہیں تمہارے کمرے کے ساتھ ساتھ تمہارا اسٹوڈیو بھی دکھاؤں۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑکی کے پاس سے ہٹے تھے۔ اس کے کمرے کی دائیں دیوار میں ایک خوب صورت دروازہ تھا۔ محمود خالد نے اس دروازے کو کھولا اور اس کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئے تھے۔

اب وہ جس کمرے میں تھے' وہ اس کے بیڈ روم

سے بھی کچھ بڑا کمرا تھا۔ اس کا فرش لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ وہاں میز بھی تھی، صوفے بھی تھے، راکنگ چیئر بھی تھی۔ بک شیلف بھی تھا۔ مختلف طرح کے ایزل بھی تھے، رنگ بھی تھے۔ پینٹنگ بنانے سے متعلق اشیا میز پر سلیقے سے رکھی تھیں۔ دیواروں پر قیمتی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ بک شیلف میں مصوری اور آرٹ سے متعلق قیمتی کتابوں کا کلیکشن بھی تھا۔

"یہاں کا انٹیریر میں نے ایک آرکیٹکٹ سے کروایا تھا۔ مجھے خود تو پینٹنگ کی اے بی سی بھی نہیں آتی۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا آرٹسٹ لوگوں کے اسٹوڈیوز کیسے ہوتے ہیں۔ اب جب تک تم یہاں ہو، پینٹنگ کرنے کا دل چاہے تو یہیں آکر کام کرنا۔"

ان کے چہرے پر یہ خواہش موجود تھی کہ وہ اسے یہاں پر کام کرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے آرٹسٹ بننے کی سب سے زیادہ مخالفت کرنے کے بعد اس کے آرٹسٹ ہونے پر اتنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ وہ چپ چاپ تو کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔

"بہت خوب صورت اسٹوڈیو ہے۔ تھینکس پاپا!"

"تمہیں پسند آگیا۔ میری محنت وصول ہوگئی۔ پانچ سال سے میں منتظر تھا کہ تم آؤ اور اپنا یہ اسٹوڈیو دیکھو۔"

ان کا انداز اسے شرمندہ کروانے والا یا یہ جتانے والا ہرگز نہیں تھا کہ وہ باپ سے ضد باندھ کر ان کے لاکھ بلانے پر بھی پچھلے پانچ سالوں میں کبھی ایک بار بھی ان سے نہیں ملی تھی۔ وہ بس جیسے اسے ایک بات بتا رہے تھے۔ شرمندہ وہ خود ہی ہو رہی تھی۔ اسے شرمندگی کیوں ہو رہی تھی؟

"میں تمہارے آنے سے بہت خوش ہوں کلثوم! اب شادی کے بعد بھی میرے پاس کراچی آتی جاتی رہنا۔ تمہاری تو ہونے والی سسرال بھی کراچی ہی میں ہے۔"

وہ محبت بھرے انداز میں اس سے بولے تھے۔ وہ جواباً" سوائے سر اثبات میں ہلانے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم مجھے سکندر سے کب ملوا رہی ہو؟" کمرا اور اسٹوڈیو دیکھنے کے بعد وہ شاور لینے چلی گئی تھی۔ نہا کر فریش ہونے کے بعد نیچے آئی تو ناشتے کی میز پر محمود خالد اور عائشہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سکندر کا نام یاد رکھے جانے اور اس کا نام اتنی محبت سے لیے جانے پر حیران ہوئی تھی۔

وہ سکندر کو باپ سے ملوانے پاکستان نہیں آئی تھی۔ وہ سکندر کی ماں سے ملنے پاکستان آئی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت ساری سوچیں آرہی تھیں۔

وہ سکندر سے محبت میں نہیں ملنا چاہتے۔ وہ اس کی اور سکندر کی شادی رکوانے کے لیے کچھ پلان کر رہے ہیں۔ سیم کے ساتھ بھی تو انہوں نے یہی کیا تھا۔ یہ محبت صرف ایک دکھاوا ہے۔ مگر دکھاوا ہے تو اتنی سچی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔

"آج شام مجھے اس کے پیرنٹس سے ملنے جانا ہے۔ وہ مجھے پک کرنے آئے گا۔ میں اس سے کہوں گی، وہ تھوڑا جلدی آجائے۔ پھر آپ اس سے مل لیجیے گا۔"

اس کے ذہن میں جو بھی سوچیں آرہی تھیں مگر وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی باپ کو کوئی تلخ جواب نہیں دے پائی۔

"میں تمہارے شادی کے فیصلے سے بہت خوش ہوں بیٹا! مجھے یقین ہے تم نے ایک اچھے لڑکے کا انتخاب کیا ہوگا۔" وہ اس سے پیار سے بولے تھے۔ عائشہ ان دونوں کے آگے چائے رکھ رہی تھیں۔

"محمود بہت خوش ہیں تمہاری شادی کا سن کر۔ بلکہ ہم دونوں یہ ڈسکس کر رہے تھے کہ سکندر کی فیملی بھی اگر کراچی ہی میں ہے تو پھر تم دونوں یہیں پر ہی شادی کر لو ناں۔" عائشہ اس سے بولی تھیں۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ سکندر کے اپنی فیملی کے ساتھ خوشگوار تعلقات نہیں ہیں۔ کچھ اختلافات ہیں

اس کے اپنے والد اور بھائی کے ساتھ۔ وہ یہاں صرف اپنی والدہ سے ملنے آیا ہے۔" وہ جواباً" سنجیدگی سے بولی۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ تم بس مجھے سکندر سے ملوا دو۔ تمہاری شادی جہاں پر بھی ہوگی، میں اور عائشہ وہاں ضرور آئیں گے۔ میری بیٹی باپ کے ہوتے ہوئے باپ کی دعاؤں کے بغیر تو رخصت ہرگز نہیں ہوگی۔"

اس کی سنجیدگی اور دو ٹوک سے انداز کے جواب میں محمود خالد پیار اور نرمی سے بولے تھے۔

☼ ☼ ☼

"پہنچ گئیں تم؟" ناشتے کے بعد کمرے میں آکر اس نے سیم کا موبائل نمبر ملایا تھا۔ اس بار اس کی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ وہ تلخ سے لہجے میں اس سے بولی تھی۔

"تم مجھے لینے ایئرپورٹ کیوں نہیں آئیں سیم؟" وہ جانتی تھی اس کی سکندر سے شادی اور پاکستان آنے کی بات پر سیم اس سے ناراض ہوگئی تھی۔ اس نے غصے میں پچھلی دونوں بار اس کی فون کالز بند کر دی تھیں۔

وہ جانتی تھی سیم اس کی محبت میں اس پر خفا ہوتی تھی، اسے اس کی ہر وقت فکر جو بہت رہتی تھی۔ اسے یقین تھا اس کے آنے پر وہ رک نہیں پائے گی، اپنی ساری ناراضی بھلا کر وہ بھاگی بھاگی اس کے پاس ایئرپورٹ چلی آئے گی۔ چاہے ابھی لاکھ ناراضی ظاہر کر رہی ہے۔ مگر اس کا خیال غلط نکلا۔ سیم اس سے واقعی بڑی سنجیدگی سے خفا تھی۔

"اس لیے کہ میں تم سے ناراض ہوں۔ مجھے تم پر بہت غصہ ہے لز۔" وہ خفگی سے بولی۔

"سیم پلیز! مجھ سے خفا مت ہو۔"

"تمہاری بے وقوفی پر خفا بھی نہ ہوں؟ تم پاپا کو جانتی نہیں ہو لز۔ تم ابھی تک بہت سادہ ہو۔ تمہیں پتا نہیں ہے وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں تمہارے ساتھ۔"

وہ سیم کی بات پر چپ ہوگئی تھی۔ وہ نہ باپ کی حمایت میں کچھ کہہ پائی تھی نہ مخالفت میں۔

"اب پاکستان آ ہی چکی ہو تو کم از کم پاپا کے گھر پر تو مت رہو۔ میرے گھر آجاؤ۔ میں ڈرائیور کو بھیجوں کیا؟"

سیم کے لہجے کی خفگی اور ناراضی اب پھر اس کی فکر اور محبت میں بدل چکی تھی۔

"میں پاپا کے ڈرائیور کے ساتھ تمہارے گھر آجاؤں گی سیم! مگر ابھی نہیں۔ آج دوپہر مجھے سکندر کو پاپا سے ملوانا ہے اور پھر شام میں مجھے خود سکندر کی فیملی سے ملنے جانا ہے۔ میں کل آجاؤں گی۔"

وہ سیم کی ناراضی سے ڈر کر محتاط سے انداز میں بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔" سیم ناراض نہیں ہوئی تھی۔ بس اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"ٹھیک ہے لز میں تم سے پھر بات کروں گی۔ بائے۔"

سیم نے سنجیدہ ہی انداز میں فوراً" فون بند کر دیا تھا۔ فون رکھنے کے بعد وہ سنجیدگی سے بیٹھ کر سوچنے لگی تھی کہ آج سکندر کی فیملی سے ملنے اور سکندر کو محمود خالد سے ملوانے کے بعد وہ سیم کے گھر ہی چلی جائے۔ کراچی آنے سے قبل اس نے سیم کے گھر پر نہ رکنے کے حوالے سے باپ سے کیا وعدہ کیا تھا، سیم کی آواز سنتے ہی اسے بھول گیا تھا۔

شاید اسے سیم کے گھر پر جانے سے منع کرنا، اس کے پاپا کی کوئی سازش ہی تھی۔ ان دونوں بہنوں کو یہاں پر ایک دوسرے سے دور رکھوانے کے لیے تاکہ جب وہ اس کی اور سکندر کی شادی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کریں تب سیم اس کی مدد نہ کر سکے۔

وہ کل صبح ہی سیم کے پاس چلی جائے گی۔ اس نے سوچا۔ سازش، پلاننگ، دھوکا اور جھوٹی محبت سے اسے گھٹن ہونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

محمود خالد کی خواہش تھی کہ سکندر آج ان لوگوں کے ساتھ لنچ کرے مگر اس نے خود سکندر کو لنچ کی دعوت نہیں دی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی سکندر اس کے پاپا سے بہت زیادہ دیر کے لیے ملے۔ اس سے فون

کر کے اس نے بس یہ کہا تھا' وہ اسے پک کرنے تھوڑا پہلے آجائے تاکہ اس کے پاپا سے بھی مل سکے۔ اس نے محمود خالد کو یہ بتایا تھا کہ سکندر یہاں پر لنچ نہیں کرے گا' وہ کچھ دیر سے آئے گا کیونکہ وہ بہت بزی ہے تو انہوں نے عائشہ سے چائے کے ساتھ بھرپور قسم کے ریفریشمنٹ کا کہہ دیا تھا۔ وہ اپنے ہونے والے داماد کے پہلی بار گھر آنے پر بہت پرجوش تھے۔



اس کی امو جان کی خوشی سے چہکتی آواز آج اسے برسوں بعد سنائی دے رہی ہے۔ مگر۔۔ وہ اس سب سے لاتعلقی اختیار کیے کمرے میں میز کے آگے لیپ ٹاپ رکھ کر بیٹھا تھا۔

"غلام احمد! گاڑی میں مٹھائیاں رکھوادی تھیں؟"
اس کے کان میں پھر اپنی امو جان کی خوشی سے کھنکتی آواز آئی تھی۔ اس نے خود کو پہلے سے بھی زیادہ لاتعلق بنالیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں ہے۔

"کیا کررہے ہیں؟" نویرہ کمرے میں آئی تھی۔ سب لوگ گھر سے جلدی نکل رہے تھے۔ غالباً" اس کی امو جان دعوت کا سارا انتظام اپنی نگرانی میں کروانا چاہتی تھیں۔ گاڑیوں میں سامان رکھوایا جارہا تھا۔ اس کے بعد سب کو تیار ہو کر گھر سے نکل جانا تھا۔ نویرہ اس کے پاس صوفے ہی پر بیٹھ گئی تھی۔

"آفس کا کام تھا تھوڑا۔" وہ سر اٹھائے بغیر لاپروائی سے بولا۔

نویرہ نے آج صبح اس سے امو جان اور پاپا کے ساتھ فارم ہاؤس جانے کی اجازت مانگی تھی۔ اس نے بغیر کوئی لمبی بات کیے صرف ایک ہاں کہہ کر اسے اور علی کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔

"تمہیں کوئی کام ہے؟" اس نے سر اٹھا کر نویرہ سے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" وہ بہت سوچ کر' محتاط سے انداز میں بولی۔

وہ اپنے پاپا کی طرح کا حاکمانہ مزاج رکھنے والا سخت گیر شوہر نہیں تھا کہ نویرہ کو اس سے بات کرنے کے لیے پہلے اجازت لینی پڑے' لفظ سوچنے پڑیں۔ ان دونوں کا تو بڑا ہی دوستانہ اور پیار بھرا تعلق تھا جس میں ایک دوسرے کے لیے عزت بھی تھی اور محبت بھی۔ پھر آج نویرہ کو کیا ہوا تھا؟ وہ قدرے خائف سی نگاہوں سے اسے کیوں دیکھ رہی تھی؟

"کہو نویرہ!"
وہ کوشش کے باوجود مسکرا نہیں سکا تھا' جب دل ماضی کی بھول بھلیوں میں پھر سے کھویا ہوا تھا تو لبوں پر مسکراہٹ کہاں سے آتی۔

"زین پلیز! مجھ سے خفا مت ہوئیے گا۔ میری بات ٹھنڈے دل سے سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔"
وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"بارہ سال پہلے آپ کے گھر میں کیا ہوا تھا' میں نہیں جانتی مگر جو کچھ بھی ہوا تھا اور چاہے وہ جتنا بھی برا ہوا تھا مگر اسے گزرے بارہ سال گزر چکے ہیں زین! اتنے سالوں میں دنیا بدل گئی ہے' زندگی بدل گئی ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو نویرہ!" اس بار اس کا لہجہ تھوڑا سخت تھا۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب آپ بھی خود کو تھوڑا تبدیل کیجیے۔ اپنے دل میں وسعت پیدا کیجیے۔ صلہ رحمی اللہ کو پسند ہے۔ کیا اللہ ہمارے بڑے بڑے گناہوں کو معاف نہیں کردیتا۔۔۔ تو ہم اس کے بندے اس کی پسندیدہ ترین صفت کو کیوں نہیں اپنا سکتے؟"

وہ نرم لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔ وہ یک دم ہی غصے سے لیپ ٹاپ بند کرنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی اور غصہ آگیا تھا۔ وہ خاموش صرف اس لیے تھا کہ وہ اس موضوع پر نویرہ سے ایک لفظ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

"آپ کو پتا ہے زین! پاپا نے آج کی یہ دعوت کیوں رکھی ہے؟" اسے خاموش دیکھ کر نویرہ نے پوچھا۔

"امو جان کی وجہ سے۔ امو جان سکندر بھائی کے آنے پر بہت خوش ہیں۔ پاپا نے کل جب مجھے فارم ہاؤس کی دعوت کا بتایا تھا' تب انہوں نے کہا تھا کہ

انہوں نے برسوں بعد انہیں اس طرح خوش دیکھا ہے اور وہ انہیں پوری طرح خوش ہونے کا موقع دینا چاہتے ہیں اسی لیے انہوں نے سکندر بھائی اور ان کی ہونے والی بیوی کی دعوت رکھی ہے۔ پاپا آپ سے کم تو خفا نہیں سکندر بھائی سے۔ جب وہ امو جان کی خوشی اور ان کی صحت کے لیے اپنا غصہ اور ناراضی پس پشت ڈال سکتے ہیں تو آپ کیوں نہیں۔ وہ بارہ سال بعد اپنے سب گھر والوں کو ایک ساتھ 'ایک ہی جگہ پر موجود دیکھیں گی۔ یہ خوشی ان کی صحت پر کتنا اچھا اثر ڈالے گی زین!"

سن لینے کے باوجود وہ نویرہ کی باتیں نہ سننے کا سا تاثر دیتا کمرے سے جانے لگا تھا۔

"زین! میری بات کا جواب تو دے دیں۔" نویرہ اس کے پیچھے آئی تھی۔ نویرہ کو جواب دیے بغیر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے سامنے امو جان نظر آئی تھیں۔ ان کا ہاتھ یوں اٹھا ہوا تھا گویا وہ ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دینے والی تھیں۔

پل بھر کے لیے اس کی اپنی ماں سے نگاہیں ملی تھیں۔ ان نگاہوں میں شکوہ تھا۔ اس پر ایک سنجیدہ نگاہ ڈالنے کے بعد آمنہ پیچھے کھڑی نویرہ سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"نویرہ! میں تم سے یہ کہنے آئی تھی بیٹا! تیار ہو جاؤ۔ علی کو بھی تیار کردو۔ آدھے گھنٹے بعد ہمیں نکلنا ہے۔"

برسوں بعد اس نے اپنی ماں کو دل سے تیار ہوا دیکھا تھا۔ انہوں نے بہت خوب صورت لباس پہن رکھا تھا۔ جیولری بھی پہن رکھی تھی اور ہونٹوں پر لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل بھی تھا۔ وہ برسوں بعد اتنی خوب صورت اور خوش لگ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے امو جان!" نویرہ ان سے مسکرا کر بولی تھی۔ آمنہ وہاں سے واپس پلٹنے لگی تھیں۔ صرف ایک پل 'بس ایک پل کے لیے اس کی نظریں اپنی ماں کی نظروں سے پھر ٹکرائی تھیں۔ وہ پل کر رہ گیا تھا۔ وہ نظریں اس سے خاموش شکوہ کر رہی تھیں۔ ان نظروں میں درد تھا' نمی' تھی شکایت تھی' وہ اسے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتی ہیں' یہ بے بسی تھی۔ وہ اپنی جگہ سن سا کھڑا تھا آمنہ وہاں سے جا چکی تھیں۔

"دیکھی آپ نے امو جان کے چہرے کی خوشی؟ آج اس خوشی کو مکمل ہونے دیں زین! آج اس خوشی میں غم کا ہلکا سا بھی عکس نہ پڑنے دیں۔"

اس نے اپنے ساتھ کھڑی نویرہ کی آواز سنی۔ وہ گردن گھما کر نویرہ کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہ ماں سے نظر ملنے کے لمحے کے حصار میں تھا۔

"ہم خود بھی والدین ہیں زین! ذرا سوچیں اگر علی چند دنوں کے لیے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو ہماری کیا حالت ہو گی؟ امو جان آج بارہ سالوں بعد اپنے جدا ہوئے بیٹے سے ملنے والی ہیں۔ آپ ان کی خوشی میں دکھ کا یہ احساس شامل نہ ہونے دیں کہ برسوں بعد ایک کھویا بیٹا واپس ملا ہے تو دوسرا بیٹا ساتھ نہیں۔ ان کے بیمار اور کمزور وجود کو آج پوری طرح خوش ہو لینے دیں۔ اپنی ساری فیملی کو اکٹھا دیکھنے کی خوشی انہیں حاصل کر لینے دیں زین!"

آخر میں آکر نویرہ کا لہجہ التجائیہ سا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"تم تیار ہو جاؤ نویرہ! تم لوگوں کو دیر ہو جائے گی۔" بغیر اسے دیکھے وہ سنجیدگی سے بولا۔ اس کے جواب نے نویرہ کے چہرے پر گہری مایوسی پھیلا دی تھی۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔



وہ وہی گلابی فراک پہن کر تیار ہو چکی تھی جو سکندر نے اسے دوہا سے دلوائی تھی۔ سکندر تین بجے ان کے گھر آیا تھا۔ محمود خالد نے اس کی آمد کی اہمیت اور خصوصیت چوکیدار کو بتا رکھی تھی۔ اسی لیے جیسے ہی وہ آیا چوکیدار نے اسی لمحے انہیں اطلاع دی۔ اس سے بھی پہلے محمود خالد صوفے پر سے اٹھے تھے۔ وہ سکندر کے استقبال کے لیے گیٹ تک جا رہے تھے۔ وہ بھی اٹھ کر ان کے پیچھے آئی تھی۔

سکندر کو کراچی کے راستوں کا علم نہیں تھا۔ اس لیے اس نے رینٹ پر گاڑی بمعہ ڈرائیور لے رکھی تھی۔ ڈرائیور باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ باہر نکلی تو محمود خالد گرم جوشی سے سکندر سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

"آرام سے پہنچ گئے بیٹا! گھر ڈھونڈنے میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"میں صبح لیزا کو ڈراپ کرنے یہاں آیا تھا۔"

سکندر مہذب انداز اور سنجیدگی سے بولا۔ اس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے اس لباس میں بہت پیاری لگ رہی ہے پل بھر کے لیے اس کی اٹھی ان نگاہوں نے اسے بتا دیا تھا۔ سکندر نے اپنی نگاہیں فوراً ہی اس پر سے ہٹا کر اس کے پاپا پر مرکوز کر دی تھیں۔

محمود خالد سکندر کو گھر کے اندر لے کر جا رہے تھے۔ ان دونوں کو چار بجے گھر سے نکل جانا تھا۔ سکندر یہاں صرف ایک گھنٹے کے لیے آیا تھا اور یہ بات وہ پہلے ہی باپ کو قدرے بے مروتی سے بتا چکی تھی۔

سکندر کو جلدی آنے اور اس کے گھر پر لنچ کرنے پر قطعاً" اعتراض نہ تھا۔ مگر وہ ایسا چاہتی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے اور سکندر کے رشتے کے بیچ اپنے باپ کی کسی سازش کو نہیں آنے دے گی۔

وہ لوگ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ عائشہ بھی وہاں آگئی تھیں۔ وہ دونوں بڑی گرم جوشی سے سکندر سے مل رہے تھے 'اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کراچی کا موسم 'عرب ممالک کے معاشی حالات' ابتدا ان موضوعات سے ہوئی تھی۔

سکندر اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں نپی تلی گفتگو کر رہا تھا۔ وہ صرف اس کے ساتھ بے تکلف ہوا کرتا تھا۔ باقی سب کے ساتھ وہ جیسا سنجیدہ نظر آتا تھا ویسا ہی محمود خالد کے ساتھ بھی تھا۔

ان کی ملازمہ نے عائشہ کی نگرانی میں چائے کے ساتھ گھر کے بنے کافی سارے لوازمات وہاں سجا دیے تھے۔ ٹرالی اور میز انواع و اقسام کی ڈشز سے بھری بھی لگ رہا تھا' یہ پہلی بار گھر آنے والے داماد کا شاندار اور گرم جوشی سے بھرپور استقبال ہے۔ عائشہ بڑی محبت اور اپنائیت سے سکندر کو مختلف ڈشز پیش کر رہی تھیں۔ وہ خود بالکل چپ بیٹھی اپنے باپ اور ان کی مسز کو اپنے ہونے والے داماد کی آؤ بھگت کرتے دیکھ رہی تھی۔

"بیٹا! یہ کباب تو چکھو۔ تمہاری آنٹی بہت مزے کے بناتی ہیں۔" محمود خالد اصرار کرتے ہوئے سکندر کی پلیٹ میں خود کباب ڈال رہے تھے۔

"لیزا! تم بھی کچھ لے لو۔" عائشہ پیار سے اس سے بولی تھیں۔

"میں لے رہی ہوں آنٹی!" وہ دونوں نہ زیادہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے' نہ ایک دوسرے سے کوئی بات کر رہے تھے۔ سکندر سنجیدگی و شائستگی سے محمود خالد اور عائشہ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے کیک کا ایک چھوٹا سا پیس کاٹ کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا تھا۔

محمود خالد' سکندر سے اس کی جاب کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ بظاہر سرسری سا انداز جیسے گفتگو برائے گفتگو کے طور پر اس کے پروفیشن اور کریر کے متعلق بات کر رہے ہوں۔ مگر در حقیقت وہ سکندر کے بارے میں اپنی رائے اور اپنے اندازے قائم کر رہے تھے۔

سکندر سنجیدگی سے نپے تلے انداز میں انہیں اپنی جاب وغیرہ کے متعلق بتا رہا تھا۔ چائے پینے کے دوران سکندر نے دو مرتبہ گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔

"پاپا! میرا خیال ہے۔ اب ہمیں نکلنا چاہیے۔ سکندر کی امو جان ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔" وہ کافی دیر کے بعد کچھ بولی تھی۔

"ہاں بالکل۔ تم لوگ نکلو۔ راستے میں ٹریفک بھی ہو گا۔"

وہ دونوں جانے کے لیے اٹھ گئے تھے۔ محمود خالد کا سکندر کو رخصت کرنے کا انداز استقبال کرنے والے انداز سے بھی زیادہ گرم جوشی والا تھا۔ گویا بیٹی کا انتخاب انہیں پسند آگیا تھا۔

"بہت خوشی ہوئی مجھے تم سے مل کر سکندر!"

مصافحے کے لیے اس کا ہاتھ تھام کر وہ بولے۔
"مجھے بھی آپ سے مل کر اچھا لگا۔"
وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ جیسے وہ اس کی نینی کو نینی نہیں کہہ پاتا تھا' اسی طرح اس کے پاپا کو نہ تو انکل کہہ پایا تھا اور نہ ہی پاپا۔
"بہت پیاری ہے میری یہ بیٹی۔ تھوڑی سی ضدی اور جذباتی ہے مگر اس کا دل بہت خوب صورت اور آئینے کی طرح شفاف ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے' اس نے تم جیسے باوقار اور خوب صورت شخص کا انتخاب کیا ہے۔ اللہ تم دونوں کو سدا خوش رکھے۔"
انہوں نے مصافحہ کرنے کے بعد بھی سکندر کا ہاتھ فورا" نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے تھامے بولے تھے۔ ان کے لہجے میں سکندر کے لیے والہانہ محبت اور شفقت شامل تھی۔ اس نے حیران ہو کر باپ کو دیکھا تھا۔
کہاں تھی وہ ضدی اور جذباتی؟ اس کے پاپا نے اس کے لیے یہ الفاظ کیوں کہے؟ وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ ایسی کون سی ضد کر دی تھی اس نے باپ سے اور ایسا کون سا جذباتی پن ظاہر کیا تھا۔ جس کا وہ حوالہ دے رہے تھے۔
"تم اپنی والدہ کو یہاں لاؤ بیٹا! ہم سب ساتھ مل کر ڈنر کریں گے۔" عائشہ' سکندر سے محبت سے بولی تھیں۔ سکندر کی فیملی کا ذکر نہ کر کے جیسے انہوں نے یہ احتیاط رکھی تھی۔ انہیں لیزا کی بات یاد تھی کہ سکندر کے اپنی فیملی کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں ہیں۔
"جی ضرور۔" وہ بظاہر جوابا" مسکرا کر ہی بولا تھا۔
محمود خالد اور عائشہ چاہے نہ جانتے ہوں مگر وہ جانتی تھی سکندر کا ایسا کوئی ارادہ ہے' نہ ہی کبھی ہو گا۔ وہ صرف موقع کی نزاکت کا خیال کر کے اس بارے میں ہامی بھر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ سب "فارم ہاؤس" آ چکے تھے۔ شہر کے مضافات میں یہ "فارم ہاؤس" تھا۔ وہ شہریار خان گھر سے ملازمین لائے تھے' جو یہاں سے وہاں بھاگتے دوڑتے تمام کام انجام دے رہے تھے۔
آمنہ جیسے ایک دم ہی بالکل تندرست اور صحت مند ہو گئی تھیں۔ وہ ملازمین کو مختلف ہدایات دیتی ادھر ادھر جا آ رہی تھیں۔ باہر کھلی جگہ پر باربی کیو کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ خوشی آمنہ کے ہر ہر انداز سے ظاہر تھی۔ نورہ ان کی خوشی میں ان کا ساتھ دیتی نوکروں سے ان کی مرضی کے مطابق کام کروا رہی تھی۔

گارڈن میں جہاں پر ڈنر ہونا تھا' وہاں کی آرائش' سجاوٹ نورہ نے کروائی تھی۔ شہریار خان' علی کو سوئمنگ سکھا رہے تھے۔ ان کے سب گھر والے یہاں ان کے سالوں بعد لوٹنے والے بیٹے اور اس کی ہونے والی بیوی کا استقبال کرنے کو موجود تھے سوائے زین کے۔ وہ جانتی تھیں زین نہیں آئے گا۔ پھر بھی دل کی خواہش تھی کہ کاش آج وہ بھی یہاں آ جاتا۔ کیا صرف آج چند گھنٹوں ہی کے لیے وہ اپنی ضد اور غصہ بھلا کر ماں کے دل کو خوشی نہیں دے سکتا تھا تاکہ وہ اپنے تمام گھر والوں کو اکٹھا ایک ہی جگہ پر دیکھ سکیں....
وہ گارڈن میں ڈنر کے لیے اتنے خوب صورت انداز میں میز اور کرسیاں وغیرہ لگوانے پر نورہ کو سراہ رہی تھیں' جب انہوں نے سامنے سے زین کو آتے دیکھا۔ سفید شلوار قمیص میں سنجیدہ چہرے کے ساتھ چلتا وہ ان دونوں کی طرف آ رہا تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔
"نورہ! یہ زین آ رہا ہے ناں؟"
"جی امو جان!" نورہ نے بھی بے حد خوش ہو کر زین کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں نزدیک آتے زین کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
"کیا تم نے کہا تھا زین سے آنے کے لیے؟" زین کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے نورہ سے پوچھا۔
"کہا تو تھا۔ لیکن مجھے لگتا ہے زین میرے کہنے سے نہیں' بلکہ آپ کے کچھ بھی نہ کہنے کی وجہ سے آ گئے ہیں۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی آپ کی آنکھیں جو ان

سے اتنا کچھ کہہ رہی تھیں۔ زین آپ سے پیار بھی تو بہت کرتے ہیں امو جان!"
انہوں نے بے ساختہ اپنے برابر کھڑی نورہ کو دیکھا تھا۔
"میرے دونوں بیٹے مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی تھیں مگر ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"دعا کرو بیٹا! میری محبت ان دونوں کو پھر ایک دوسرے کے قریب لے آئے۔ اب تو اس کے سوا اور کوئی خواہش نہیں کہ کچھ ایسا ہو جائے ان دونوں بھائیوں کے دل پھر سے مل جائیں۔ ان کے دلوں سے سب رنجشیں اور ناراضیاں دور ہو جائیں۔ میں اپنے دونوں بیٹوں کو ایک ساتھ ایک ہی چھت تلے دیکھ سکوں۔ ہم سب پہلے کی طرح پھر ہنسی خوشی ساتھ رہنے لگیں۔"
"ان شاء اللہ ایسا ضرور ہو گا امو جان! بارہ سال تقدیر نے آپ کی آزمائش کی ہے۔ اب بس سب اچھا ہو گا۔"
زین ان دونوں کے بالکل نزدیک آ چکا تھا۔ انہوں نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے آنکھیں یوں صاف کی تھیں جیسے آنکھ میں کچھ چلا گیا تھا۔
"علی کہاں ہے؟" زین ان دونوں کے قریب آ گیا تو جیسے اسے سمجھ میں نہیں آیا' وہ کیا بات کرے۔
"وہ پاپا کے ساتھ سوئمنگ کر رہا ہے۔" نورہ مسکرا کر بولی۔ زین بے حد سنجیدہ تھا۔ جیسے بحالت مجبوری یہاں آ تو گیا تھا مگر دل سے خوش نہیں تھا۔
"اچھا ہوا زین تم بھی آ گئے۔" آمنہ آہستگی سے بولی تھیں۔
"آپ کی وجہ سے آیا ہوں امو جان!" وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس کے چہرے پر واضح لکھا تھا وہ سکندر کے لیے آج بھی وہی محسوس کرتا ہے جو بارہ سال پہلے کرتا تھا۔ آمنہ اور نورہ چپ کھڑی رہ گئی تھیں۔ زین وہاں سے اندر چلا گیا

☆ ☆ ☆

وہ اور سکندر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں سکندر کے پاپا کے فارم ہاؤس جا رہے تھے۔
"تم نے میری تعریف نہیں کی۔" لیزا نے اس سے شکوہ کیا۔
"تعریف کس بات کی؟" وہ مسکراہٹ لبوں پر روکتا سنجیدگی سے بولا۔
"کسی بھی بات کی نہیں۔" چڑ کر جواب دیتے اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا تھا۔
"بیلا! تم ہمیشہ ہی حسین لگتی ہو۔" اس نے اپنے نزدیک سکندر کی سرگوشی سنی۔ گردن گھما کر اس نے اسے دیکھا۔
"ہمیشہ پاکستانی ڈریس تو نہیں پہنا ہوتا۔ آج میں نے فرسٹ ٹائم پہنا ہے تمہارے لیے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ سکندر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔
"کیا میری نظروں نے تمہاری تعریف نہیں کی تھی؟"
"کی تھی مگر زبان بھی تو کرے۔" اس بار وہ مسکرائی تھی۔
"زبان سے تمہاری تعریف کرنے کے لیے تو مجھے شاعر ہونا پڑے گا۔ کیونکہ عام سی تعریف تو تمہاری کی نہیں جا سکتی۔ تمہاری تعریف تو بہت خاص لفظوں اور خاص انداز میں ہونی چاہیے۔" وہ ہنس پڑی تھی۔
"باتیں بنانی تمہیں خوب آتی ہیں۔ تمہیں پتا ہے' لڑکیوں کا دل کیسے خوش کیا جاتا ہے۔"
"لڑکیوں کا نہیں' صرف ایک لڑکی کا۔ اپنی بیلا کا۔" آہستگی سے بولتے ہوئے سکندر نے گاڑی کی سیٹ پر رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ وہ سکندر کی بات پر خوش ہو کر بے ساختہ مسکرائی تھی۔ چند لمحے وہ دونوں خاموش رہے تھے۔
"تمہارے پاپا مجھے اچھے لگے لیزا! سچ بولوں تو تم سے سن کر میں نے ان کا جو امیج بنایا تھا' وہ اس سے بہت مختلف ہیں۔"
اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ بہت سنجیدگی اور

سچے دل سے اس کے پاپا کی تعریف کر رہا تھا۔

وہ ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے سکندر!" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ تلخ ہوئی تھی۔ اپنی اور سیم کی زندگی کی بہت ساری محرومیاں یاد آگئی تھیں۔

"لیکن وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے ان کے ہر ہر انداز میں تمہارے لیے والہانہ محبت محسوس کی ہے۔ وہ مجھ سے بھی اس لیے اتنی محبت سے مل رہے تھے کہ میں ان کی بیٹی کی پسند' اس کا انتخاب ہوں۔" سکندر بے حد سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر بول رہا تھا۔

"آج انہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے مگر کل جب مجھے ان کی محبت کی ضرورت تھی تب وہ کہاں تھے؟ تم اس بات کو رہنے دو سکندر! تم نہیں جانتے انہوں نے سیم کو کتنے دکھ پہنچائے ہیں۔" وہ ماضی کی تلخیوں میں گم ہو گئی تھی۔

"اوکے! ہم اس ٹاپک کو رہنے دیتے ہیں۔ تم سیم کا ذکر کر رہی ہو۔ یہ بتاؤ' وہ آج ایئرپورٹ کیوں نہیں آئی تھی؟"

اس کا موڈ خراب نہ ہو اس خیال سے سکندر نے فوراً" ہی موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

سیم آج اسے لینے کیوں نہیں آئی تھی۔ وہ سکندر کو وجہ نہیں بتا سکتی تھی۔ جس سہولت سے اس نے اپنے پاپا کے متعلق منفی باتیں سکندر سے کرلی تھیں' سیم کے بارے میں نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سکندر کو یہ کیسے بتا دیتی کہ سیم ان دونوں کی شادی پر خوش نہیں ہے اور ناراضی کے اظہار کے طور پر ایئرپورٹ نہیں آئی تھی۔ اگر وہ ایسا کچھ کہتی تو شاید سکندر کے دل میں یہ بات رہ جاتی۔ پھر جب وہ سیم سے ملتا تو یہی سوچ کر ملتا کہ لیزا کی بہن اسے سخت ناپسند کرتی ہے اور پھر شاید جواب میں سکندر بھی سیم کو ناپسند کر دیتا۔

سکندر اور سیم' اس کی زندگی کے اہم ترین لوگ' ان دونوں کو ایک دوسرے کو پسند کرنا چاہیے تھا' ایک دوسرے کا دوست ہونا چاہیے تھا' ایک دوسرے کے ساتھ ان کا بہت اچھا' بہت خوشگوار اور دوستانہ تعلق ہونا چاہیے تھا۔ سچ وہ بول نہیں سکتی تھی اور جھوٹ بول کر اپنے اور سکندر کے رشتے کی سچائی اور خوب صورتی کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اسے مناسب یہی لگا کہ وہ اس سوال کو نہ سننے کا تاثر دے کر نظر انداز کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

"تم آج بہت سالوں بعد اپنے گھر والوں سے ملو گے ناں؟" اس نے سکندر کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں! پورے بارہ سال بعد۔" وہ آہستگی سے بولا۔ اس نے لیزا کے جواب نہ دینے کو محسوس نہیں کیا تھا۔

"تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"پتا نہیں لیزا! میرے اندر کوئی فیلنگز ہی نہیں ہیں اس وقت۔ ایسا لگ رہا ہے سب کچھ مشینی سے انداز میں ہو رہا ہے بغیر کسی بھی اور طرح کی فیلنگز کے۔ میں نے اپنی بیمار ماں کے دل کو خوشی دینی ہے اس کے سوا میرے دل میں کوئی احساسات نہیں ہیں۔"

وہ پھر سے اپنے اندر جھانکنے لگا تھا۔ وہ سکندر کے درد اور اس کے کرب کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ جنہوں نے اسے دھتکار دیا تھا' اس کی تذلیل کی تھی' اس سے بارہ سال پہلے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا' وہ آج صرف اپنی ماں کی خاطر ان سب کا سامنا کرنے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں فارم ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ وہ سکندر کے ساتھ گاڑی سے اتری۔ اسے بالکل سامنے سکندر کی امو جان' ایک پیاری سی لڑکی اور ایک بچے کے ساتھ اپنے اور سکندر کے استقبال کے لیے کھڑی نظر آئیں۔

ان تینوں سے بہت دور گارڈن میں درختوں کے پاس اسے ایک باوقار سے شخص بھی نظر آرہے تھے۔ بہت فاصلہ تھا' شکل واضح نہیں تھی۔ صرف کھڑے ہونے کا شاندار اور باوقار انداز پتا چل رہا تھا۔ پس منظر میں کھڑے وہ شخص کیا سکندر کے پاپا تھے؟ سکندر کی تو

شاید اس طرف نگاہ بھی نہیں پڑی تھی۔ وہ گاڑی سے اترتے ہی سیدھا اپنی ماں کی طرف بڑھا تھا۔

اس کی امو جان بھی تڑپ کر اس کے نزدیک آئی تھیں۔ انہوں نے بالکل صبح والے ہی انداز میں سکندر کو پھر گلے سے لگا لیا تھا۔ وہ کبھی اس کا ماتھا چوم رہی تھیں' کبھی اس کے ہاتھ۔ وہ جیسے ابھی تک اسی خوف کے حصار میں تھیں کہ ان کا بیٹا ان سے پھر نہ بچھڑ جائے۔

"ہائے لیزا۔" اس نے سکندر اور اس کی امو جان سے نگاہیں ہٹا کر اس خوب صورت لڑکی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر پرخلوص' دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔

"ہائے۔" وہ جواباً" احتیاط سے مسکرائی تھی۔

سکندر کا اپنی امو جان کے سوا باقی تمام افراد کے ساتھ کیا رویہ ہونا تھا اسے اسی لحاظ سے یہاں باقی افراد کے ساتھ گفت و شنید کرنی تھی۔ اس نے نویرہ کا بڑھا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"میں نویرہ ہوں۔ امو جان کی چھوٹی بہو اور بہت جلد آپ کی دیورانی بن جاؤں گی۔ یہ میرا بیٹا ہے علی۔ علی! سلام کرو لیزا آنٹی کو۔"

اس نے اپنے ساتھ کھڑے بچے سے کہا۔ اسے شاید سمجھایا گیا تھا کہ اس نے مہمانوں کے سامنے زیادہ شرارتیں نہیں کرنی۔ اس لیے وہ بڑا سعادت مند سا بنا کھڑا تھا مگر اس کی آنکھیں شرارت سے بھری ہوئی تھیں۔ یقیناً" وہ بہت شریر بچہ تھا۔

"اگر میرے مرنے کی اطلاع آئی تو اس پر سب سے زیادہ خوش ہونے والا وہ ہوتا۔"

اسے بے اختیار سکندر کی کل صبح کہی بات یاد آئی۔ تو یہ سکندر کے بھائی کی بیوی اور اس کا بیٹا تھا۔

سکندر ابھی تک روتی ہوئی آمنہ کو سنبھال رہا تھا۔ وہ اسے سامنے دیکھ کر پھر جذبات پر قابو نہیں رکھ پائی تھیں۔

"السلام علیکم لیزا آنٹی۔" علی نے ماں کے حکم پر فوراً" اسے سلام کیا تھا اور بالکل بڑوں والے انداز میں مصافحے کے لیے سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ اسے وہ گول مٹول سا شرارتی بچہ بہت پیارا لگا تھا۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بے ساختہ اس نے جھک کر اس کے گال پر پیار کیا تھا۔

"وعلیکم السلام علی۔"

"اصولاً" تو علی کو آپ کو تائی امی یا بڑی ماما بلانا چاہیے۔ مگر اتنی ینگ سی لڑکی کو اتنے بھاری بھرکم ناموں سے پکارنا اچھا تو نہیں لگے گا۔ میرا خیال ہے لیزا آنٹی ہی فی الحال ٹھیک ہے۔"

نویرہ اس سے ہنس کر بولی۔ اگر سکندر کو اس کے پاپا اچھے لگے تھے تو اسے بھی ابھی تک سکندر کے گھر کا کوئی فرد برا نہیں لگا تھا۔ خوش اخلاق' ملنسار' محبت کرنے والا' وہ چاہے سکندر کی امو جان ہوں یا نویرہ یا پھر یہ کیوٹ سا بچہ۔ وہ ان سب سے مل کر یہی تین لفظ سوچ رہی تھی جبکہ وہ سکندر سے سننے کے بعد اس کی فیملی کے متعلق بہت مختلف رائے لے کر آئی تھی۔ وہ جواباً" مسکرائی تھی۔ تب تک آمنہ اور سکندر ان لوگوں کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔

"لیزا بھی کیا سوچ رہی ہو گی۔ میں نے اپنی بیٹی کو پیار بھی نہیں کیا۔ ماشاء اللہ اس پاکستانی لباس میں کتنی خوب صورت لگ رہی ہے میری بہو۔" آمنہ اسے گلے لگا کر پیار کرنے لگی تھیں۔ نویرہ اب سکندر سے مخاطب تھی۔

"السلام علیکم سکندر بھائی!"

"وعلیکم السلام۔" وہ آمنہ کے اس کی خیر و عافیت کے متعلق سوالوں کے جواب دے رہی تھی' پھر بھی اس کا دھیان سکندر کی طرف تھا۔ نویرہ نے سکندر کو بھی اتنی ہی گرم جوشی اور دوستانہ انداز و اپنائیت سے سلام کیا تھا جس طرح اس سے ہائے ہیلو کی تھی۔ مگر سکندر کا جواب سنجیدہ تھا اور ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ جیسے کسی اجنبی ___ کے سلام کا جواب دے دیا جاتا ہے۔

"سکندر بھائی! میں آپ کی بھابھی ہوں اور یہ شریر بچہ آپ کا بھتیجا ہے۔" نویرہ مسکرا کر سکندر کو بتا رہی

تھی۔ سکندر سنجیدہ اور سپاٹ چہرے کے ساتھ نویرہ اور علی کو دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم سکندر پاپا۔" علی کو جیسے ماں نے سب پہلے سے سمجھا رکھا تھا۔ وہ بڑے مزے دار سے انداز میں بولتا سکندر کی بھی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ سکندر نے علی کی طرف جھک کر اس سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ مگر نہ تو وہ بچے کی معصوم سی حرکت پر مسکرایا تھا نہ ہی اس نے اسے چھونے یا پیار کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ اس فیملی میں شامل ہونے جا رہی تھی مگر ابھی وہ ایک اجنبی کی طرح تمام افراد کے عمل اور رد عمل دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ آمنہ کو علی کا سکندر کو "سکندر پاپا" کہنا بہت اچھا لگا تھا انہوں نے بے اختیار بہت پیار سے اپنی بہو کو دیکھا تھا۔ گویا یہ نام بیٹے کو نویرہ آج ہی سکھا کر لائی تھی۔

سکندر یہاں آتے ہی اسے اتنا ہی سنجیدہ نظر آنے لگا تھا، جتنا روم میں ملاقات کے ابتدائی دنوں میں لگا تھا۔ چہرے پر سرد اور سپاٹ تاثرات اور اجنبیت لیا دیا فارمل سا ایک ایسا انداز کہ کوئی بھی اس سے ضرورت سے زیادہ بات کرنے سے احتراز برتے۔

وہ اس وقت اس پر اپنا آپ کھول دینے والا، اپنی کمزوریاں بتا دینے والا سکندر نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سنجیدہ اور سپاٹ تھیں۔ ان میں کسی بھی طرح کے کوئی جذبات نہیں تھے۔

"ہمارے گھر میں علی کی شرارتوں سے سارا وقت رونق رہتی ہے۔" آمنہ مسکرا کر اسے اور سکندر کو بتانے لگیں۔

"امو جان! کیا آپ سکندر بھائی اور لیزا کو یہیں کھڑا رکھیں گی؟"

نویرہ نے آمنہ کو مخاطب کیا۔ سکندر کا سنجیدہ اور فاصلہ لیا انداز محسوس کر کے نویرہ قدرے محتاط سی ہو گئی تھی۔

"ارے ہاں۔ چلو بیٹا آؤ۔ چل کر بیٹھتے ہیں۔" آگے چلنے کی بات پر اس نے ایک دم پھر درختوں کی طرف دیکھا۔ اب اسے وہاں پر کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔

وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے مصنوعی جھیل کے پاس گارڈن میں آ گئے۔ جہاں آرام دہ کرسیاں ڈلی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں میں سے ایک پر سکندر کے پاپا بیٹھے تھے۔ جس شخص کو ابھی اس نے بہت دور سے دیکھا تھا کیا وہ یہی تھے؟

کسی تعارف سے پہلے ہی اسے پتا تھا وہ سکندر کے پاپا ہیں۔ باپ اور بیٹے میں مماثلت جو اس قدر تھی۔ سکندر اپنے باپ کی جوانی تھا۔ شہریار خان، سکندر کا بڑھاپا تھے۔ بلا کی مشابہت تھی باپ بیٹے میں۔ شہریار خان ان لوگوں کو آتا دیکھ کر فوراً" کرسی سے اٹھے تھے۔ جیسے مہمانوں کی آمد کے موقع پر کھڑا ہوا جاتا ہے۔ اس نے بے اختیار سکندر کی طرف دیکھا تھا۔ پل بھر کے لیے اسے سکندر کے چہرے پر ایک درد بھرا تاثر نظر آیا، جیسے ماضی کا وہ تلخ لمحہ یاد آ گیا ہو جب بیس سال کی عمر میں اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اگلے پل وہ پھر سے اپنے چہرے کے تاثرات کو سرد اور سپاٹ بنا چکا تھا۔

اس نے آمنہ اور نویرہ کے چہروں پر یہ تاثر دیکھا، جیسے وہ دونوں بھی نہیں جانتی تھیں کہ شہریار خان سکندر سے کس انداز میں ملیں گے۔ کرسی سے اٹھنے کے بعد وہ سکندر ہی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"السلام علیکم۔" سکندر نے دور کھڑے کھڑے غیر جذباتی اور سپاٹ سے انداز میں انہیں بغیر پاپا پکارے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو سکندر!"

وہ اس کے نزدیک آئے تھے۔ گلے لگنا تو بہت بڑی بات ہے۔ وہاں تو ہاتھ بھی نہیں ملایا گیا تھا۔ سکندر نے اپنے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ رکھے تھے۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر اسے ایسا لگا تھا، جیسے شہریار خان سکندر کو گلے لگانا چاہتے تھے۔

وہ اسے بہت حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس

کے قریب جانا چاہتے تھے مگر قریب جانے سے ڈر بھی رہے تھے۔

ماحول میں ایک عجیب سا کھنچاؤ، تکلف اور اجنبیت پھیل گئی تھی۔ آمنہ بیگم، سکندر اور شہریار خان دونوں کو محتاط سے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔ ماحول میں پھیلی اجنبیت، تکلف اور خاموشی کو توڑنے کے لیے وہ ان دونوں سے بولیں۔

"بیٹھو بیٹا! لیزا تم بھی بیٹھو بیٹا۔" آمنہ کے کہتے ہی وہ سب کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

علی بجائے ان سب کے ساتھ کرسی پر بیٹھنے کے گھاس پر بھاگ دوڑ کرنے لگا تھا۔ اس نے محسوس کیا، وہاں سب تھے سوائے سکندر کے بھائی کے۔ اپنی بیوی اور بچے کو یہاں بھیج کر کیا وہ خود آیا ہی نہیں تھا؟ سکندر سنجیدگی اور خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔

باپ اور نویرہ کے سامنے وہ ماں کے ساتھ بھی فارمل سا ہو گیا تھا۔ جیسے ماں کے ساتھ چاہت، محبت اور جذبات کا والہانہ اظہار وہ ان لوگوں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چند سیکنڈز کا تکلیف دہ سناٹا حائل رہا تھا ان چاروں کے بیچ۔ نویرہ بھی محتاط سی ہو کر چپ بیٹھی تھی۔ آمنہ نجانے کس پریشانی اور خوف میں تھیں۔ وہ ایک پل خاموش بیٹھے گھاس کی طرف دیکھتے سکندر کو دیکھتیں، دوسرے پل سنجیدہ بیٹھے شہریار خان کی طرف۔ پھر جیسے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے آمنہ ہی نے لیزا کو مخاطب کیا۔

"پاکستان پہلی مرتبہ آئی ہو لیزا!"

"جی امو جان!" اس نے آمنہ کو مسکرا کر جواب دیا۔

اسے پہلی مرتبہ شہریار خان کی نظریں خود پر محسوس ہوئیں۔ اتنی دیر میں انہوں نے یا تو سکندر کو دیکھا تھا یا پھر بھاگتے دوڑتے علی کو۔ باقی سب سے وہ قدرے لاتعلق تھے۔ اس پر تو جیسے ابھی تک انہوں نے دھیان بھی نہ دیا تھا۔ سکندر اور شہریار خان دونوں خاموش تھے۔ ان کی خاموشی بے حد بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ شہریار خان نے خاموشی توڑنے میں پہل کی تھی مگر ان کی مخاطب وہ تھی۔

"کیا کرتی ہیں بیٹا آپ؟"

ان کا لہجہ شائستہ اور سنجیدہ تھا۔ نگاہوں میں اس کے لیے نرمی اور عزت تھی۔

"میں لندن کے ایک کالج میں لینڈ اسکیپ اور اسٹل لائف پینٹنگ پڑھاتی ہوں۔ آرٹسٹ ہوں، پینٹنگز بناتی ہوں۔" وہ ان کا مشاہدہ کرنے میں ایسی مگن تھی کہ اس سوال کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھی۔ ان کی شخصیت کے رعب سے متاثر ہو کر اس نے اپنا کچھ نامکمل سا تعارف کروایا۔

"آپ لندن میں رہتی ہیں؟" وہ اسے آپ کر کے مخاطب کر رہے تھے، مخاطب کرنے کے انداز میں آمنہ جیسی محبت یا والہانہ پن نہیں تھا مگر اسے شائستگی، نرمی اور اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔

سکندر اس کی اپنے پاپا سے گفتگو سے لاتعلقی ظاہر کرتا آہستہ آواز میں اپنے برابر بیٹھی آمنہ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ گویا اسے اپنے باپ کی لیزا سے گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"جی انکل!"

"اور آپ کے پیرنٹس؟"

"میرے پیرنٹس کی ڈائی وورس ہو چکی ہے۔ میرے فادر پاکستان میں رہتے ہیں اور مدر اٹلی میں۔"

وہ سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ اسے دو ایک بار شک ہوا کہ شہرار خان اس سے گفتگو کے دوران گاہے گاہے سکندر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جب اس کی نگاہیں آمنہ پر ہوتی ہیں تب وہ جیسے چپکے سے اسے دیکھتے ہیں۔

"سکندر بتا رہا تھا۔ لیزا بہت مشہور آرٹسٹ ہے۔ ابھی ایک، دو ہفتے پہلے فلورنس میں اس کا سولو شو بڑا کامیاب گیا ہے۔"

سکندر سے گفتگو چھوڑ کر آمنہ نے فوراً" شہریار خان کو بتایا۔ گویا وہ اتنی دیر سے بظاہر سکندر سے باتیں کر رہی تھیں مگر ان کا دھیان ادھر بھی تھا۔ اسے سکندر کی امو جان کے اس انداز پر پیار آیا۔ نہ اس نے

شہریار خان کے سامنے اوچھے پن سے اپنی اور اپنی فیملی کی شان واعلا رتبہ بتایا تھا نہ پینٹنگ کے حوالے سے اپنی شہرت کا ذکر کیا تھا۔ مگر آمنہ جیسے چاہتی تھیں کہ ان کی ہونے والی بہو کی ہر خوبی سب کو پتا چلے۔

"ویری گڈ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" شہریار خان ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "کیا پینٹ کرتی ہو لیزا؟"

اس بار انہوں نے اسے تم کہہ کے مخاطب کیا۔ جیسے تکلف اور اجنبیت کو درمیان سے ہٹا دیا ہو۔ وہ جواباً" شائستگی' احترام اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پینٹنگ میں اپنے خاص موضوعات انہیں بتانے لگی۔

سکندر ان دونوں سے لاتعلق اسی طرح ماں سے محو گفتگو تھا۔ علی بھاگتا ہوا نویرہ کے پاس آیا تھا۔

"بابا! فش دکھائیں۔" اس کی فرمائش پر نویرہ کرسی سے اٹھی۔

"او لیزا! تم بھی ہمارے ساتھ آجاؤ۔"

اس نے فوراً" سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی الجھن کا شکار تھی کہ یہاں اگر کوئی اس کے ساتھ اپنائیت اور محبت سے پیش آئے تو اسے جواباً" کیا کرنا چاہیے۔ سکندر نے اسے نہیں دیکھا تھا' اگرچہ وہ اس کا اپنی طرف دیکھنا محسوس کر چکا تھا۔ گویا اس کی مرضی تھی۔ اس نے جانا ہے تو جائے' نہیں جانا چاہتی تو نہ جائے۔ وہ نویرہ کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ یہاں آکر اتنی عجیب سی کیفیت کا شکار تھا کہ وہ لیزا کو گائیڈ بھی نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے' کیا نہ کرے۔ ماضی کو یاد کرتا' خود پر گزری قیامتوں کو سوچتا تو اسے خود پر ترس کھانا لگ رہا تھا مگر پھر بھی یہاں آکر پتا نہیں کیا کیا بھولا بسرا پھر یاد آنے لگا تھا۔ وہ تینوں اب پھر خاموش تھے۔

"ماشاء اللہ لیزا بہت پیاری ہے سکندر! تم سے سن کر جیسا میں سوچ رہی تھی۔ یہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔"

وہ باپ بیٹا آپس میں مخاطب نہ ہوئے تھے۔ وہ باپ بیٹا نہیں جیسے دو اجنبی تھے' جنہیں ایک ہی جگہ بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے بیچ خاموشی اور فاصلہ تھا۔ بجائے انہیں یا آمنہ کو دیکھنے کے' لاتعلق سا بن سامنے لیزا کو جھیل کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں کی چھوٹی بہو اور پوتا بھی کھڑے تھے۔

"تم J.S انٹرنیشنل میں جاب کر رہے ہو؟"

اس نے شہریار خان کا سوال سنا۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں صرف اجنبیت اور فاصلہ تھا۔ شہریار خان کی نگاہوں میں کیا تھا' اس نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"جی۔" بارہ سال پہلے اسے منع کر دیا گیا تھا۔ وہ انہیں بابا نہ کہے اسے بتا دیا گیا تھا کہ اس کا اس گھرانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا وہ نہ انہیں بابا کہہ رہا تھا نہ ماں کے سوا یہاں کسی کو اپنا سمجھ رہا تھا۔

"بہت اچھی کمپنی ہے۔ یہاں آگے بڑھنے کے بہت مواقع ہیں۔" شہریار خان اس سے سنجیدگی سے بولے تھے۔

آگے بڑھنے کے مواقع؟ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر تلخی پیدا ہوتی تھی۔ کیا آگے بڑھنے کے راستے اس کے لیے بند نہیں کر دیے گئے تھے؟ کیا اسے ذلت بھری کھائی میں دھکیل نہیں دیا گیا تھا؟ کیا اس کا پندار' اس کا وقار' اس کی شخصیت کی آن' بان اس سے چھین نہیں لی گئی تھی؟ کیا اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ ان سب کے لیے مر چکا ہے' کیا اسے رسوائیاں اور ذلتیں نہیں بخش دی گئی تھیں؟

کم از کم ان لبوں پر اس کی ترقی اور آگے بڑھنے کی بات جچتی نہیں تھی۔ ان لبوں سے تو اس کی تباہی و بربادی ہی کی باتیں اچھی لگا کرتی تھیں۔ اس سے اظہار نفرت اور اعلان لاتعلقی ہی سجا کرتا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر کسی بھی طرح کے جذبات کو آنے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو مکمل طور پر سپاٹ' سرد اور غیر جذباتی کر رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

علی پانی کے پاس جھک کر کھڑا رنگ برنگی مچھلیوں کو خوش ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں اس کے پاس کھڑی تھیں۔

"سکندر بھائی کی پسند لاجواب ہے۔ میں نے جب سے امو جان سے سنا تھا سکندر بھائی کی ہونے والی بیوی اٹالین ہے' تصور ہی تصور میں تمہارا ایک خاکہ بنایا تھا۔ اٹالین مرد اور عورتیں بہت خوب صورت ہوتے ہیں ناں۔"

نویرہ بے تکلفی سے اس سے بولی تھی۔ وہ عمر میں شاید اس سے ایک' دو سال چھوٹی تھی مگر بے تکلفی سے اسے تم کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی تعریف پر مسکرائی۔

"تھینکس۔"

"تم اردو کیسے بول لیتی ہو؟ ہم تو سمجھ رہے تھے ہمیں تم سے انگلش میں بات کرنی پڑے گی۔"

"میں مکمل اٹالین نہیں ہوں۔ میرے پاپا پاکستانی ہیں۔"

"ہاں یہ تو مجھے پتا ہے۔ امو جان نے بتایا تھا۔ مگر تم دیکھنے میں بالکل اٹالین لگتی ہو۔ اگر اردو نہ بولو اور یہ پاکستانی ڈریس نہ پہنا ہو تو تم مکمل اٹالین لگتی ہو۔"

یہاں سکندر نہیں تھا' اس لیے وہ جواباً" کھل کر مسکرائی۔ وہ یہاں سکندر کے حوالے سے ان لوگوں سے مل رہی تھی مگر اس سے خود سے بے تحاشا خوش اخلاقی' گرم جوشی اور محبت سے ملتی اس لڑکی سے رکھائی نہیں برتی جا رہی تھی۔

"سب یہی کہتے ہیں۔ ایکچوئلی میں شکل صورت میں اپنی ممی پر ہوں۔ تم میری بہن سے ملو تو وہ تمہیں بالکل پاکستانی لگے گی۔ وہ شکل و صورت میں میرے پاپا پر ہے۔"

نویرہ نے جواباً" مسکرا کر سر ہلایا تھا۔ "تم سکندر بھائی سے کہاں ملیں؟"

"روم میں۔"

"روم میں؟ واؤ! سو رومانٹک۔ اتنی رومانٹک جگہ پر مل کر تو یہ رشتہ بننا ہی تھا۔ کیا سکندر بھائی نے ٹریوی میں تین کوائنز (سکے) اچھالے تھے؟" نویرہ ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ جواباً" کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"تین کوائنز نہیں اچھالے تھے پھر بھی ہماری شادی ہو رہی ہے۔"

نویرہ بھی زور سے ہنسی تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی دور کرسیوں پر بیٹھے شہریار خان' آمنہ اور سکندر پر نظر پڑی تھی۔ سکندر نپے تلے سنجیدہ سے انداز میں آمنہ سے باتیں کر رہا تھا۔ سکندر اور شہریار خان کے بیچ وہ کرسی خالی تھی' جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے دیکھا کہ شہریار خان بظاہر وہاں بیٹھے موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ مگر ان کی نگاہیں مسلسل سکندر پر تھیں۔ اسے شہریار خان کی شخصیت بڑی الجھی ہوئی سی لگی۔ وہ خود کو ظاہر کچھ اور کر رہے تھے' ان کے اندر کچھ اور تھا۔ وہ بظاہر فخر و غرور سے سر تانے بیٹھے تھے' ان کی شخصیت باوقار اور بارعب نظر آرہی تھی۔ مگر اسے ان کی آنکھوں میں مسلسل ایک بے چینی اور ایک اضطراب نظر آرہا تھا۔ جو سطح پر نظر آرہا تھا شاید گہرائی میں وہ نہیں تھا۔ شاید وہ اندر سے بہت مختلف انسان تھے۔ اسی وقت کسی ملازم نے آکر آمنہ سے کچھ کہا تھا۔ آمنہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کو آواز دی تھی۔

"نویرہ۔ لیزا بیٹا! آجاؤ تم لوگ کھانا لگ گیا ہے۔"

چونکہ رات زیادہ ہونے سے قبل ان لوگوں کو واپس بھی پہنچنا تھا اس لیے کھانا جلدی لگا لیا گیا تھا۔

"آجاؤ لیزا!" نویرہ اپنائیت سے اس سے بولی۔ علی بھاگتا ہوا وہاں جا رہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے وہاں آگئی تھیں۔ آمنہ' شہریار خان اور سکندر بھی کرسیوں پر سے اٹھ چکے تھے۔

"زین کہاں ہے؟ بلاؤ اسے بھی۔" آمنہ نے نویرہ سے کہا۔

"جی امو جان! میں بلا کر لاتی ہوں۔" اس نے فوراً سکندر کی طرف دیکھا۔ سکندر کا چہرہ ہنوز بے تاثر تھا۔ گویا زین کے آنے یا نہ آنے سے اسے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ نوریہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

فارم ہاؤس کے روز گارڈن میں ڈنر کے لیے میز اور کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ چاروں اطراف کئی رنگوں اور قسموں کے گلاب نظر آ رہے تھے۔ ان کے دلکش رنگ اور بھینی بھینی خوشبو فضا کو معطر اور خوشگوار بنا رہی تھی۔

گارڈن کی تمام لائٹس آن کر دی گئی تھیں۔ اگرچہ ابھی مغرب کا ہی وقت تھا اور اندھیرا پھیلا نہیں تھا۔ مگر وہ جگہ گولڈن لائٹس سے جگمگا دی گئی تھی۔ گارڈن سے اس پار قدرے فاصلے پر باربی کیو ہو رہا تھا اور گرم گرم نان بھی وہیں لگ رہے تھے۔

وہ سب لوگ کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ملازمین نے بڑی پھرتی اور مستعدی سے میز پر گرم گرم نان اور باربی کیو ڈشز لا کر سرو کرنا شروع کی تھیں۔ اسی وقت اس نے نوریہ کو ایک ہینڈسم شخص کے ساتھ اس طرف آتا دیکھا۔ سکندر سے مشابہت نہ تھی پھر بھی نوریہ کے ساتھ اسے آتا دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ سکندر کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ ہینڈسم تھا مگر سکندر جتنا نہیں۔ اس کی شخصیت سکندر جیسی شان دار نہیں تھی۔

سکندر اپنے پاپا پر تھا اور اس کا بھائی امو جان پر۔ اسے وہ نوریہ کے ساتھ چلتا اس کی دوستانہ فطرت کے بالکل برعکس لگ رہا تھا۔ بے تحاشا سنجیدہ چہرہ اور ایسا انداز جیسے اسے یہاں جبراً لایا گیا ہے۔ وہ میز تک آ گیا تھا۔ لیزا نے سکندر کی طرف دیکھا۔

وہ زین کو نظر انداز کر کے اپنے موبائل پر آیا کوئی میسج دیکھنے لگا تھا۔ زین نے بھی میز پر بیٹھے تمام لوگوں کی طرف دیکھا تھا سوائے سکندر کے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو نظر انداز کر رہے تھے۔

"السلام علیکم۔" زین بطور خاص کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر سلام کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ یہاں بیٹھے جس فرد کا دل چاہے یہ سمجھ لے کہ اس نے اسے سلام کیا ہے۔

وہ سکندر کے برابر بیٹھی تھی اور سکندر کے دائیں جانب آمنہ بیٹھی تھیں۔ زین سامنے والی کرسی پر نوریہ کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ علی شہریار خان کے برابر بیٹھا تھا۔ اسے ان دونوں بھائیوں کے چہروں پر تناؤ اور تلخی نظر آئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

باقی تمام افراد ماحول کی اس ٹینشن کو بظاہر نظر انداز کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر درحقیقت وہ سب اس تناؤ کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔

"لیزا! تم ٹھیک سے لو بیٹا!" اس نے شہریار خان کی آواز سنی۔ اس نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ نجانے کیوں اسے ان کی نگاہوں میں ایک باپ کی بے بسی نظر آئی۔

نوریہ، میاں کا موڈ دیکھ کر اس وقت بالکل خاموش تھی۔ آمنہ اور شہریار خان ماحول کی گمبھیرتا اور تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ہاں لیزا! لو بیٹا۔" آمنہ بھی فوراً بولیں۔

"میں لے رہی ہوں۔" وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ سکندر نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد ڈال رکھا تھا۔ وہ پلیٹ میں کانٹا ادھر ادھر گھما کر بے رغبتی سے کھا رہا تھا۔ یہ سلاد بھی جیسے اس نے مروتاً اور مجبوراً کھا لیا تھا۔ شہریار خان نے ملازم کو آواز دے کر بلایا تھا۔ ملازم دوڑا دوڑا فوراً وہاں آیا تھا۔

"مٹن سجی اور لے کر آؤ، بالکل گرم اور اچھی بنی ہوئی۔"

ملازم ان کا حکم سنتے ہی فوراً واپس پلٹا تھا۔ اب وہ اس سے مخاطب تھے۔

"تمہارے اٹالین کھانوں کی طرح ہمارے پاکستانی کھانوں میں بھی تمہیں بہت ورائٹی ملے گی۔"

زین سب سے لاتعلق سر جھکائے کھانا کھا رہا تھا۔ وہ کسی کی بھی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ زین کو قریب سے بغور دیکھ کر پتا نہیں کیوں بار بار اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟ کب؟ کہاں؟ اسے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا۔

"جی انکل! مجھے پتا ہے پاکستانی کھانے بہت مزے کے ہوتے ہیں۔"

ملازم مٹن سجی خوب صورت ڈش میں رکھ کر لے آیا تھا۔ شہریار خان نے خود اس کا ایک پیس کاٹ کر اس کی پلیٹ میں رکھا تھا۔

"یہ ٹرائی کرو تمہیں اچھی لگے گی۔ سکندر کی پلیٹ میں بھی ڈالو۔"

انہوں نے ڈش اس کی اور سکندر کی طرف بڑھائی تھی۔ اس نے محسوس کیا آمنہ اور نوریہ شہریار خان کو حیرت سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد یوں دیکھ رہی تھیں، جیسے وہ اپنے مزاج سے ہٹ کر کچھ کام کر رہے تھے۔

"تمہیں دوں سکندر؟" اس نے آہستگی سے اس سے پوچھا۔

اس نے سنجیدگی سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ اس نے شہریار خان کی طرف دیکھا۔ وہ اسے اور سکندر ہی کو دیکھ رہے تھے۔

سکندر کا انکار میں ہلتا سر انہوں نے دیکھا تھا۔ اسے ایک بار پھر شہریار خان کے چہرے پر غم اور بے بسی نظر آئی تھی۔

زین ہر چیز کھا رہا تھا۔ اس طرح جیسے یہاں صرف اور صرف کھانا کھانے ہی کے لیے آ کر بیٹھا تھا۔ سب کھانا کھا چکے تب کھانے کی میز سے سب سے پہلے اٹھنے والا زین تھا۔

"تم کہاں چلے؟" شہریار خان نے اس سے پوچھا۔

"سر میں تھوڑا درد ہے پاپا! کمرے میں ریسٹ کروں گا۔" سنجیدگی سے بولتا وہ فوراً وہاں سے جانے کے لیے مڑا تھا، بغیر ان دونوں کو خدا حافظ کہے۔ جیسے وہ سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی سے مخاطب ہوتا تو دور ان کی شکلیں تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔

اسے زین اچھا نہیں لگا تھا۔ جو بھی ناراضی تھی مگر اس کا بھائی پورے بارہ سال بعد اس کے سامنے آیا تھا۔ کیا وہ مروتاً بھی بھائی کے ساتھ سلام دعا نہیں کر سکتا تھا؟ سکندر کا دکھ اس نے پھر نئے سرے سے محسوس کیا تھا۔ ظلم بھی اسی کے ساتھ ہوا تھا اور مجرموں جیسا سلوک بھی اسی کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ بجائے اس پر ہوئے ظلم پر شرمندہ ہونے کے وہ تو ابھی تک اس کے خلاف دل میں نفرت لے کر بیٹھا تھا۔

وہ سب بھی میز پر سے اٹھ گئے تھے۔ زین اندر جا چکا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب چلنا چاہیے۔" سکندر سنجیدگی سے آمنہ سے بولا۔

"سب ساتھ کافی پی لیتے ہیں۔ پھر چلے جانا۔" شہریار خان نرم لہجے میں سکندر سے بولے۔

"دیر ہو جائے گی۔ لیزا کے پاپا گھر پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ جواباً سنجیدگی ہی سے بولا تھا دو ٹوک سے انداز میں۔ گویا یہاں مزید نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔

اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر شہریار خان نے نوریہ کو کچھ اشارہ کیا تھا۔ وہ فوراً وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ سب آہستہ قدموں سے چلتے روز گارڈن سے باہر نکل رہے تھے۔ وہ لوگ واپس وہیں آ گئے تھے، جہاں پر یہاں آنے کے بعد بیٹھے تھے۔ جھیل کے نزدیک والی جگہ۔

نوریہ تیزی سے واپس آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک جیولری باکس تھا۔ نوریہ نے وہ جیولری باکس آمنہ کو لا کر پکڑایا تھا۔ باکس کا سائز بتا رہا تھا اس میں سونے کی چوڑیاں یا کنگن ہونے چاہییں تھے۔ وہ ایک دم گھبرا گئی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر سکندر کی طرف دیکھا تھا۔ کیا اسے کوئی تحفہ یہاں سے لینا تھا؟ نہیں لینا تھا؟

"بہت اچھی لگی ہو تم مجھے۔ اللہ تمہیں اور سکندر کو ڈھیر ساری خوشیاں دے۔ تمہارے دل یونہی محبت سے ملے رہیں۔" آمنہ نے دعائیں دیتے ہوئے

باکس لیزا کی طرف بڑھایا تھا۔
"یہ چھوٹا سا تحفہ تمہارے لیے۔ میری طرف سے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی۔ سکندر ان سے بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے امو جان! کسی بھی تحفے سے زیادہ قیمتی ہمارے لیے آپ کی دعائیں ہیں۔ آپ بس ہمیں اپنی دعائیں دیں۔"

اس کا لہجہ عزت اور احترام لیے مہذب سا تھا مگر اس کی نگاہوں میں سختی اور انکار تھا۔ وہ یہاں سے کچھ نہیں لے گا۔ نہ اپنے لیے نہ اپنی بیوی کے لیے۔

"پھر بھی بیٹا! میری خوشی تھی۔ میری بہو پہلی بار مجھ سے ملنے آئی ہے۔"

آمنہ کا لہجہ مرجھا سا گیا تھا۔ مگر اس وقت سکندر نے ماں کے لہجے میں شامل دکھ کو' ان کی آنکھوں میں در آئی نم کو نظر انداز کر دیا تھا۔

"تو آپ نے اسے اتنی ڈھیر ساری دعائیں دی تو ہیں دنیا کا قیمتی سے قیمتی تحفہ آپ کی دعاؤں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔"

وہ خاموش تماشائی کی طرح ماں اور بیٹے کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے شہریار خان کو آمنہ کی طرف اشارہ کرتے دیکھا کہ وہ سکندر سے مزید اصرار نہ کریں۔ جیسے وہ سمجھ گئے تھے۔ سکندر سے کتنا بھی اصرار کر لیا جائے' وہ یہاں سے ایک کنکر یا پتا تک لے جانے کا روادار نہ ہو گا۔

اس نے صرف آمنہ ہی کے نہیں شہریار خان کے چہرے پر بھی مایوسی پھیلتی دیکھی۔ اس کی طرح نوریہ بھی اس سچویشن میں بالکل خاموش تھی۔ آمنہ شوہر کا اشارہ سمجھ کر خاموش ہو گئی تھیں۔

"اچھا بیٹا! جیسی تمہاری خوشی۔" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی تھیں۔

واپسی میں نوریہ اور آمنہ کے ساتھ شہریار خان بھی انہیں رخصت کرنے آئے تھے۔ آمنہ نے اسے گلے لگا کر پیار کیا تھا۔

"ابھی ہو ناں تم دونوں یہاں پر؟"

"جی امو جان!" وہ مسکرا کر بولی۔

وہ سکندر کو اس کے ہر رویے کے لیے سو فیصد پر سمجھ رہی تھی مگر پھر بھی اس پل اسے اس کے باپ سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بہت [illegible] لگے تھے۔

آمنہ اب سکندر سے مل رہی تھیں۔ اسے پھر [illegible] لگا رہی تھیں۔

"کل مجھ سے ملو گے ناں؟" سکندر نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا' جیسے باقی سب کے سامنے ماں سے بھی فاصلے پر چلا گیا تھا۔

"اللہ حافظ۔" اسے محسوس ہوا تھا کہ آمنہ کے ملنے کے بعد شہریار خان سکندر کی طرف بڑھے تھے۔ مگر ان کے بڑھنے سے پہلے سکندر سب کو اللہ حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا۔

"اللہ حافظ انکل!" اس نے انہیں الوداع کہا تھا۔

انہوں نے بزرگانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

"خوش رہو بیٹا!" اس نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو اسے ان کی نظروں میں دکھ اور بے بسی نظر آئی تھی۔ نوریہ سے بھی خوشگوار انداز میں گلے مل کر وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ وہ تینوں افراد وہیں کھڑے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ نوریہ اور آمنہ ہاتھ ہلا کر انہیں خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔ شہریار خان سنجیدہ کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر ابھی بھی دکھ اور بے بسی نظر آ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

واپسی میں سارا راستہ سکندر بالکل خاموش تھا۔ اسے وہ بہت تنہا' بہت دکھی اور بہت اداس لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس کا تلخ ترین ماضی کسی آسیب کی طرح پھر اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ وہ بہت ڈسٹرب لگ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے آہستہ آواز میں اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"اداس ہو؟"

"ہاں۔" وہ ایک گہری' دکھ بھری سانس لے کر بولا۔

"میرے ہوتے ہوئے اداس کیوں ہو رہے ہو سکندر! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔ چاہے ساری دنیا تمہارے خلاف ہو جائے میں تب بھی تمہارے ساتھ ہوں گی۔"

وہ مضبوط لہجے میں اس سے بولی۔ سکندر کے اداس چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ آئی تھی۔

"لیزا! تمہاری یہ محبت' تمہارا یہ ساتھ ہی اب میرے لیے زندگی گزارنے کی وجہ ہے۔ تم ساتھ ہو تو میں خود کو زندہ محسوس کر رہا ہوں۔ تم ساتھ ہو تو میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ تم ساتھ ہو تو زندگی ہے لیزا۔"

وہ سکندر کے ہر لفظ میں سچائی پا رہی تھی۔ وہ اس شخص کا ساتھ اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک نبھائے گی۔ جنہوں نے اسے دکھ دیا' اسے چھوڑ دیا' وہ ان لوگوں کی طرح کبھی اس کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ وہ اسے اب کبھی محبت اور رشتوں سے بے اعتبار نہ ہونے دے گی۔

✡ ✡ ✡

سکندر اسے محمود خالد کے گھر ڈراپ کر کے اپنے ہوٹل چلا گیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو لاؤنج میں محمود خالد اور عائشہ کے ساتھ سیم اور ہاشم بھی بیٹھے نظر آئے۔

سیم کے ساتھ ساتھ ہاشم بھی اسے دیکھتے ہی صوفے سے کھڑا ہوا تھا۔ اپنی بہن کی زندگی اجاڑنے والے اس شخص سے اسے نفرت تھی' پھر بھی وہ مصلحتاً اس سے مسکرا کر ملی تھی۔

"اتنا قریبی رشتہ اور ہم اتنے عرصے بعد مل رہے ہیں لیزا۔" ہاشم اس سے مسکرا کر بولا۔

"مریم جب بھی لندن یا روم تم سے ملنے جاتی تھی میں اس سے کہتا بھی تھا کہ میں بھی چلتا ہوں۔ اپنی اکلوتی سالی صاحبہ سے ایک بار ملاقات کا شرف تو حاصل ہو جائے۔ مگر مریم مجھے منع کر دیتی تھی۔ اب پوچھو اس سے' یہ مجھے تم سے کیوں نہیں ملواتی تھی؟"

وہ دوستانہ و بے تکلفانہ انداز میں بولا تھا۔

"ایسے ہی بول رہا ہے ہاشم۔ خود کے پاس ٹائم ہوتا نہیں ہے بزنس ٹرپس سے ہٹ کر کہیں جانے کا۔" سیم جواب دیتے ہوئے اس سے گلے ملنے لگی تھی۔

"کتنی دیر سے آئی ہوئی ہوں تم سے ملنے کے لیے۔ تم پتا نہیں کہاں گھومتی پھر رہی ہو۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا ناں سیم۔ میں سکندر کے گھر والوں سے ملنے گئی تھی۔"

ہاشم صوفے پر واپس بیٹھ گیا تھا۔ وہ اور محمود خالد ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سیم کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

ہاشم کی تصویر اس نے بے شک دیکھ رکھی تھی۔ مگر آمنے سامنے اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ خاصا ہینڈسم اور باوقار مرد لگ رہا تھا۔

"کیسی رہی تمہاری اپنے سسرال میں دعوت؟" سیم بغور اس کے پاکستانی لباس اور تیاری کو دیکھ رہی تھی۔

"اچھی رہی۔" سب کے سامنے وہ محتاط ہو کر بول رہی تھی۔ اکیلے وہ دونوں بہنیں ہوتیں تو وہ طویل تبصرہ کرتی سیم سے سکندر کے گھر والوں کے متعلق۔

"یہ تم نے پاکستانی ڈریس کب سے پہننے شروع کر دیے؟"

سیم اس سے ہنس کر بولی۔ اس کا انداز قدرے مذاق اڑانے والا تھا۔ وہ اپنی تیاری کے متعلق ٹچی رہتی تھی۔

"کیوں کیا اچھا نہیں لگ رہا مجھ پر یہ ڈریس؟" کیا سکندر' اس کی امو جان' پاپا اور عائشہ نے اس کا دل رکھنے کو اس کی جھوٹی تعریف کی تھی۔ کیا واقعی یہ لباس اس پر اچھا نہیں لگ رہا تھا؟ سیم کہہ رہی تھی تو ایسا ہی

ہو گا۔ سیم اسے کبھی کچھ غلط مشورہ نہیں دیتی۔

"تم جس طرح کے کپڑے پہنتی ہو' اس میں زیادہ پیاری لگتی ہو۔" سیم اس سے پیار سے بولی تھی۔

"مگر مجھے تو کلثوم اس لباس میں زیادہ پیاری لگ رہی ہے۔ اس کے ساس سسر کو بھی اچھا لگا ہو گا کہ وہ ان سے ملنے پاکستانی لباس پہن کر آئی ہے۔"

محمود خالد سنجیدہ لب و لہجے میں سیم سے بولے تھے۔ ان کا انداز ایک نامحسوس سی سختی لیے ہوئے تھا۔ وہ حیران ہو کر اپنے پاپا کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی ملازمہ چائے لے کر آئی تھی۔ چائے کے ساتھ کیک اور بادام کا حلوہ بھی تھا۔ محمود خالد فوراً" داماد کی مہمان نوازی کرنے لگے تھے۔ وہ اسے اصرار کر کے حلوہ لینے کو کہہ رہے تھے۔

"بڑی خاص جگہ کا حلوہ ہے ہاشم! چکھ کر دیکھو۔ تمہیں ضرور پسند آئے گا۔" وہ ہاشم کی پلیٹ میں خود حلوہ ڈال رہے تھے۔

بیٹی کے ساتھ تلخ لہجہ اور داماد کی آؤ بھگت؟ اسے اپنے پاپا کا انداز سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ سیم کو بھی محمود خالد کا انداز برا لگا تھا مگر وہ میاں کی موجودگی کے سبب زبردستی مسکرا رہی تھی۔

"چلو اچھا ہے لزا! تم پاکستانی ڈریس پہن پہن کر اپنے پاکستانی میاں کو خوش کرنا۔"

"مریم! میاں تو تمہارا بھی پاکستانی ہے۔" ہاشم حلوہ کھاتے ہوئے اس سے ہنس کر بولا۔ عائشہ سب کو چائے سرو کرنے کے لیے اٹھنے لگی تھیں۔

"آپ بیٹھیں ممی! میں دے دیتی ہوں۔" سیم نے انہیں پیار سے منع کیا تھا۔ وہ خود سب کو چائے سرو کرنے لگی تھی۔

"میری بات الگ ہے ہاشم! لیزا تو بڑی پکی تھی اس معاملے میں کہ کسی پاکستانی سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ پاکستانی مردوں سے سخت نفرت کرتی ہے لز۔"

اسے سیم کے جملے میں کوئی بھی بات بری یا قابل اعتراض نہیں لگی تھی مگر اس نے محمود خالد کے چہرے پر پھر سختی اور غصہ آتے دیکھا تھا۔ وہ غصے کو دبا رہے تھے۔ انہیں سیم کی بات بری لگی تھی۔ وہ مسکرا کر سیم سے بولے تھے۔

"انسان کی سوچ اور خیالات میں تبدیلی آتی ہے مریم! میں آج سکندر سے ملا ہوں۔ مجھے وہ پسند آیا ہے۔ میں کلثوم کے فیصلے سے بہت مطمئن ہوں۔"

ان کی مسکراہٹ کے باوجود اسے ان کی آنکھوں میں سختی نظر آتی تھی۔ ان کے لہجے اور آنکھوں میں سیم کے لیے ایک نامحسوس سی سختی اور تنبیہ تھی۔ بظاہر کچھ محسوس نہ ہو مگر سننے والا محسوس کرجائے۔ کہیں کوئی رنجش ہے دلوں میں۔ سیم پر ظلم کر کے اب بھی پاپا اس سے ناراض تھے؟ ناراض سیم کو ہونا چاہیے تھا مگر ناراض وہ تھے؟

بیٹی کے مقابلے میں ان کا داماد سے بات کرنے کا انداز بہت محبت بھرا تھا جیسے ہاشم انہیں بے حد پسند ہو۔ اسے تھوڑی سی دیر ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے پاپا سیم سے ناخوش تھے' اس سے خفا تھے۔ پتا نہیں ہاشم اور عائشہ کو یہ بات پتا تھی یا نہیں پتا تھی۔

جب وہ چند لمحوں میں ان کے لہجے کی سختی محسوس کر گئی ہے تو کیا ہاشم اور عائشہ نہیں کرتے ہوں گے؟ پہلے سیم کی شادی زبردستی ان کی مرضی کے خلاف کروا دی' صرف اپنے کاروباری فائدے کے لیے اور اب اس سے خفا بھی ہیں۔ اس کی نگاہوں میں باپ کی ایک برائی اور بڑھی تھی۔

"پھر کب ملوا رہی ہو تم مجھے سکندر سے؟" سیم نے محمود خالد کی بات پر کچھ خاص دھیان دیے بغیر اس سے پوچھا۔

"جب تم کہو۔" وہ مسکرا کر بولی۔ وہ کھانا کھا کر آئی تھی۔ اس لیے صرف چائے پی رہی تھی۔

"بس پھر کل بلا لو سکندر کو ہمارے گھر لنچ یا ڈنر پر۔ تمہیں تو میں ابھی اپنے ساتھ لے کر جا ہی رہی ہوں۔ بس اب تم تین' چار دن میرے پاس بھی رہو۔ کیوں ہاشم! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟" سیم نے حق رکھنے والے انداز میں اسے مخاطب کیا اور پھر اپنے شوہر کو بھی شامل گفتگو کرنا چاہا۔

"ہاں بالکل۔ چلو لیزا ہمارے ساتھ۔ اب کچھ ہمیں بھی مہمان نوازی کا موقع ملنا چاہیے۔" ہاشم مسکرا کر پہلے سیم اور پھر اس سے بولا۔

"کیوں انکل! ہم لیزا کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں؟" ہاشم نے محمود خالد سے پوچھا۔

"پاپا کو کیا اعتراض ہو گا۔ بس لز تم جلدی سے اپنا بیگ پیک کرو۔ تم ابھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔" سیم نے مسکرا کر حق رکھنے والے انداز میں کہا۔ وہ سیم کے ساتھ جانے کے لیے بخوشی تیار تھی۔

قبل اس کے کہ وہ ہامی بھرتی محمود خالد فوراً" بولے۔

"ہاشم بیٹا' کلثوم ابھی تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا پائے گی۔ دراصل کل میں اور عائشہ اسے اس کی شادی کی شاپنگ کرانے لے جارہے ہیں۔ کپڑے' زیور وغیرہ۔ ابھی تو کلثوم ہے ناں یہاں۔ شادی کی شاپنگ پوری ہو جائے پھر آجائے گی یہ تم لوگوں کے ہاں۔"

محمود خالد مسکرا کر داماد سے بولے۔ سیم کو وضاحت دینے کی انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہاں داماد کو صاف انکار کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

کون سی شاپنگ؟ کیسی شاپنگ؟ اس کا ہرگز ہرگز کوئی پروگرام نہیں بنا تھا اپنے باپ یا عائشہ کے ساتھ کل یا کبھی بھی شادی کی شاپنگ کرنے کا۔ مگر اب بیچ محفل میں وہ باپ کی بات کو جھوٹا قرار دے سکتی تھی اور نہ ہی انکار کر کے انہیں شرمندہ کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

"اچھا یہ بات ہے تو ٹھیک ہے' پھر ہم کل کے لیے اصرار نہیں کرتے۔ مگر لیزا! شاپنگ ختم کرتے ہی تم نے ہمارے پاس آنا ہے۔ چند دن ہمارے ساتھ بھی رہو۔"

ہاشم اس سے مسکرا کر بڑے بھائی کے سے انداز میں بولا تھا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ سیم کا موڈ آف ہو گیا ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ سیم کو ان کے پاپا کے جھوٹ کی سمجھ آگئی ہے۔ وہ جانتی ہے۔ شاپنگ کی بات محض ایک جھوٹ ہے' اسے سیم کے گھر پر جانے سے روکنے کے لیے۔

کیا واقعی اس کے پاپا اس کے خلاف کوئی سازش کر رہے تھے؟

کیا وہ اپنی سازش کامیاب کروانے کے لیے سیم کو اس سے دور رکھ رہے تھے تاکہ سیم اس کی کوئی مدد نہ کر سکے؟

ہاشم کا ابھی مزید بیٹھنے کا موڈ تھا مگر سیم ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھی تھی۔

"میرا خیال ہے ہاشم! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ پاپا جلدی سو جاتے ہیں۔ ان کے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"ارے ایک آدھ دن دیر سویر چلتی ہے۔ تم لوگ بیٹھو۔ مزا آرہا ہے سب ساتھ بیٹھے ہیں۔" عائشہ مسکرا کر سیم سے فوراً" بولیں۔

"نہیں ممی! میں پھر آؤں گی۔"

اسے سیم جھنجلائی ہوئی اور خفا لگ رہی تھی۔ وہ زبردستی مسکرا رہی تھی۔ مگر اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

☆ ☆ ☆

سیم اور ہاشم کے چلے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ وہ کچھ الجھی ہوئی سی تھی۔ اسے اپنے پاپا کا سیم کے ساتھ سخت انداز پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"بیٹا! میں اندر آجاؤں؟" محمود خالد نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر اس سے پوچھا۔

"جی پاپا! آئیے پلیز۔" وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ محمود خالد اندر آگئے تھے۔ وہ بے تحاشا سنجیدہ تھے۔ وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

"سوئیں نہیں ابھی تک؟"

"جی بس سونے لگی تھی۔" وہ انہیں قدرے حیرت سے دیکھ کر بولی۔

جب وہ چھوٹی تھی اس کے باپ کے پاس اس سے بات کرنے کی فرصت تھی نہ وقت اب ——— جب وہ بڑی ہو گئی تب ان کے پاس اس کے لیے وقت اور فرصت دونوں آگئے مگر اب وہ چھوٹی سی لیزا کہاں سے آتی؟ وہ ان سے ہمیشہ بہت دور رہی تھی۔ باپ بیٹی نے کبھی ساتھ بیٹھ کر ایک دوسرے سے دل کی بات نہ کی تھی۔ اس لیے اس وقت وہ انہیں بہت حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

"تم سے تھوڑی دیر بات کرلوں؟ آج میرا دل چاہ رہا ہے تم سے دل کی باتیں کرنے کو۔"

انہوں نے رسانیت سے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ انہیں تعجب سے دیکھ رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں کلثوم! تمہیں مجھ سے بہت شکایتیں ہیں۔ مجھے خود اپنے آپ سے بھی بہت شکایتیں ہیں بیٹا!"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔

"میں تم بہنوں کے لیے ایک اچھی ماں نہ لا سکا۔ میں نے ایک بری عورت سے شادی کی۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ پھر جب میں نے اپنی اس غلطی کو ٹھیک کرنا چاہا' تب شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری اس غلطی کو ٹھیک کرنے کی کوشش میں تم نے بہت سفر کیا اور مریم......"

وہ نسیم کا ذکر کرکے کچھ بولتے بولتے رک گئے۔ ان کے چہرے پر درد اور کرب ابھر آیا تھا۔ پچھتاوے ان کی آنکھوں سے جھانک رہے تھے۔

"خیر چھوڑو اس بات کو۔" وہ اسے کچھ بتاتے بتاتے چپ ہو گئے تھے۔

"ماضی میں جو ہو چکا وہ ہو چکا کلثوم! ہم میں سے کوئی بھی اب اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں تمہارے دل میں میرے لیے جتنی بھی ناراضیاں ہیں تم ان سب کو دل سے نکال کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم میری بہت پیاری بیٹی ہو۔ تم نے شادی کے لیے ایک اچھے شخص کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے سکندر بہت پسند آیا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سچائی اور تمہارے لیے محبت دیکھی ہے۔ وہ جو دل میں ایک خوف سا تھا ناں کلثوم! کہ کہیں تم میری ضد میں' کسی کے کہنے میں آکر تم کسی غلط انتخاب نہ کرلو۔ الحمد اللہ دور ہو گیا ہے۔ میں تمہارے مستقبل کے حوالے سے مطمئن ہو گیا بیٹا!"

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بول رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ گلا رندھ گیا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار یوں اپنے جذبات کا اس سے اظہار کر رہے تھے۔

"پاپا!" باپ کی آنکھوں کی نمی اور لہجے میں شامل جذبات کی شدت اس کی آنکھوں میں بھی نمی لے آئی تھی۔

"پاپا!" اس کی آنکھیں یک دم ہی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ باپ کے اتنے نزدیک بیٹھ کر ان کی آنکھوں میں نمی دیکھتے ہوئے وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ محمود خالد نے یک دم ہی اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔

"کلثوم! مجھے معاف کردو بیٹا! میری سب غلطیوں کے لیے مجھے معاف کردو۔ میری غلطیوں کی سزا میں اب خود کو مزید کوئی نقصان مت پہنچانا بیٹا!"

وہ روتے ہوئے اس سے کہہ رہے تھے۔ وہ باپ کے سینے پر سر رکھے بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ بچپن کی محرومیاں' تم بچپن کے دکھ نجانے اسے کیا کیا رلا رہا تھا۔

"میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں کلثوم! میری جان' میری زندگی ہو تم۔ میں تمہیں کبھی کسی دکھ' کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ میرے ہوتے ہوئے تم پانچ سال سے تنہا رہ رہی ہو' میرا دل کٹتا تھا بیٹا تمہاری اس تنہائی اور اکیلے پن پر۔"

باپ سے اپنی کوئی ناراضی' کوئی گلہ' کوئی شکوہ اس پل اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ محمود خالد روتے ہوئے اس سے بول رہے تھے۔

"تمہارا دل شفاف ہے بیٹا! اس لیے تم سب کو اپنی

طرح سمجھتی ہو۔ مگر میری جان! دنیا تمہاری طرح سچی اور شفاف نہیں ہے۔ دنیا بڑی ظالم ہے۔ لوگوں کو سمجھنا سیکھو۔ دلوں میں چھپی نفرتیں اور محبت لیے چہروں کے پیچھے چھپے اصلی اور بدصورت چہرے پہچاننا سیکھو۔"

انہوں نے اس کا سر اپنے سینے پر سے ہٹایا تھا۔ اب وہ دونوں روتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں خشک کیں۔ خود کو سنبھالا' وہ اسی طرح بے آواز روئے جارہی تھی۔ برسوں کے جمع کیے اشک تھے انہیں نجانے کتنی دیر تک بہتے رہنا تھا۔ مگر اسے اپنے باپ کی کوئی بھی نصیحت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اپنے آنسو صاف کرنے کے بعد اب وہ اپنے پوروں پر اس کے آنسو چن رہے تھے۔

"تم سے ایک بات کہوں' مانو گی؟"

"جی پاپا!" اس نے آنسو بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے یکدم ہی اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

"تم مریم کے گھر مت جانا بیٹا!"

"کیوں پاپا!" وہ بے طرح حیران ہوئی تھی۔

"بس میں تم سے کہہ رہا ہوں اس لیے۔ اگر میری محبت کا یقین کرتی ہو تو مریم کے گھر ہرگز مت جانا۔ جب تک پاکستان میں ہو' میرے ہی پاس رہو۔"

وہ اس کے ماتھے پر پیار کر رہے تھے۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا اگرچہ وہ ان کے ایسا کہنے کی وجہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"رات بہت ہوگئی ہے۔ اب تم سو جاؤ۔"

وہ اس کے پاس سے اٹھنے لگے تھے۔ یکدم ہی اس کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"پاپا! آئی لو یو۔"

محمود خالد بے ساختہ مسکرائے تھے۔ خوشی سے بھری' طمانیت لیے مسکراہٹ۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"جان پاپا! پاپا بھی تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

وہ اسے بہت محبت بہت شفقت سے دیکھ رہے تھے۔

✡ ✡ ✡

وہ اپنی اسٹڈی میں راکنگ چیئر پر بیٹھے تھے۔ جو ظالم اپنے مظالم کا حساب کرنے بیٹھتا ہے تو نیند آنکھوں سے یونہی دور ہو جاتی ہے جیسے ان کی آنکھوں سے۔ چند گھنٹے پہلے وہ اپنے اس بیٹے سے مل کر آئے تھے جس کی زندگی اجاڑ ڈالنے کے وہ ذمہ دار تھے۔ جس سے اس کی شخصیت کی آن بان' اس کی انا اور وقار سب کچھ چھین لینے کے وہ مجرم تھے۔

جو کسی کو جان سے مارے' اسے پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے مگر جو کسی کی روح کا قتل کرے' اس کے لیے کیا سزا ہوتی ہے؟

باپ تو اولاد کی خوشیوں کے لیے اپنی خوشیاں بیچ ڈالتا ہے۔ اولاد کی زندگی سنوارنے کے لیے اپنی زندگی رہن رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ کیسے باپ ہیں؟ آخر وہ کیسے باپ ہیں؟ انہوں نے اپنے بیٹے کی زندگی برباد کردی۔ اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا۔ بالکل ٹھیک کر کے گیا ہے وہ آج ان کے ساتھ۔

اس نے انہیں پاپا کہہ کر مخاطب کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔

اس نے ان کے گھر کا کھانا کھانا بھی گوارا نہیں کیا۔ اس نے اپنی ہونے والی بیوی کو ان کا دیا تحفہ بھی قبول نہیں کرنے دیا۔ جیولر کو گھر پر بلا کر انہوں نے آمنہ کے ساتھ بیٹھ کر خود لیزا کو دینے کے لیے سونے کے چار کنگن خریدے تھے۔ آمنہ انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں اور وہ ان کی حیرت نظر انداز کیے رہے تھے۔

ٹھیک کیا سکندر نے ان کا تحفہ ان کے منہ پر مار کر چلا گیا۔ ان کا تو یہ منہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے تحفہ قبول کرنے پر اصرار ہی کرپاتے۔ آج ان میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ سکندر سے اعتراف جرم ہی کرپاتے۔ اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ پاتے۔

اس سے یہ کہہ پاتے کہ وہ اس سے بہت پیار کرتے

ہیں۔ اپنے ہر ظلم پر بہت شرمندہ ہیں۔ وہ بالکل دور سے اسے ایئرپورٹ پر چھپ کر کھڑے دیکھتے رہے تھے۔ وہ دور کھڑے اسے لیزا کے ساتھ فارم ہاؤس میں آتا دیکھتے رہے تھے۔ کتنا خوبرو جوان ہوگیا تھا ان کا بیٹا۔ بھرپور توانا' طاقت ور مرد۔

اتنی اخلاقی جرأت ان میں نہ تھی کہ اسے اپنے سینے سے لگا سکتے۔ انہیں لگا تھا وہ دھکیل کر انہیں خود سے دور ہٹا دے گا۔

آمنہ ان کی آج کی دعوت کے بارے میں یہ سمجھ رہی تھیں کہ انہوں نے سکندر اور ان کی ہونے والی بیوی کو اپنی خاندانی شان و شوکت بتانے کے لیے فارم ہاؤس پر مدعو کیا تھا۔ زین بھی یقیناً" یہی سمجھتا ہے اور خود سکندر بھی یہی سمجھا ہوگا اور وہ تینوں ایسا کیوں نہ سمجھیں؟ ساری زندگی انہوں نے خود کو جیسا ثابت کر کے دکھایا ہے' وہ سب انہیں ویسا ہی تو سمجھ رہے ہیں۔

رعونت اور غرور میں ڈوبے' خود پسندی میں مبتلا' اپنے اونچے خاندان پر فخر اور زعم کا شکار' ساری دنیا کو اپنے جوتے کی نوک پر سمجھنے والے شہریار خان.... ان کے بیوی اور بچے اگر آج انہیں ایسا سمجھتے ہیں تو بالکل ٹھیک سمجھتے ہیں۔ اپنے اندر کی کمزوریاں اور خامیاں چھپائے رکھنے کو انہوں نے خود کو ساری زندگی لوگوں کے سامنے ظاہر ہی اسی طرح کیا تھا۔ ان کے بچے یہاں تک کہ ان کی بیوی بھی نہیں جانتیں کہ وہ دیوانگی کی حد تک سخت مزاج اور اصول پسند کیوں ہیں۔ انہوں نے بیوی اور بچوں کو اتنے سخت ماحول میں کیوں رکھا' جہاں صرف ان کا حکم چلتا تھا اور بیوی اور بچوں کی رعایا جیسی حیثیت تھی۔ وہ حکم دیں گے' بیوی تعمیل کرے گی۔ بیوی کو نہ بولنے کی اجازت تھی نہ اس کی کوئی رائے نہ پسند نہ مرضی۔

بڑا بیٹا جو ان سے اور ان کے باپ سے غیر معمولی حد تک مشابہت رکھتا تھا اور جو ان کے اور ان کے باپ ہی کی طرح غیر معمولی ذہین تھا۔ اسے انہوں نے ہمیشہ اس خوف اور آزمائش میں مبتلا کیے رکھا کہ وہ ان کے طے کردہ معیار پر پورا اترتا رہے۔ وہ اس کے لیے سب کچھ طے کرتے رہیں گے۔ وہ سر جھکا کر ان کی فرمائشیں پوری کرتا رہے۔ ان کے معیار کے مطابق خود کو ثابت کرتا رہے۔

چھوٹا بیٹا جو نہ شکل و صورت میں ان پر ہے نہ ذہانت میں۔ اس پر انہوں نے کبھی وقت برباد ہی نہیں کیا تھا۔ ابتدا ہی میں نظر آگیا تھا' وہ ان کے اور ان کے باپ کی طرح غیر معمولی شخصیت اور ذہانت نہیں رکھتا۔

بیوی اور بچوں کے لیے پیسہ بہت تھا' عیش و آرام بہت تھا۔ مگر انہیں ان کے سامنے سر اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ خود پسندی اور مغروریت کے ساتھ اپنے اعلا حسب نسب پر فخر کرنے کا احساس انہوں نے ہمیشہ اپنے دونوں بیٹوں کے اندر انڈیلا تھا۔ وہ کسی کو بھی اپنی برابری کا نہیں سمجھتے تھے۔ کسی اور کو تو کیا' انہوں نے بیوی تک کو کبھی اپنے دل کے اندر جھانکنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

جس خاندانی جاہ و حشمت اور فیملی بیک گراؤنڈ پر وہ فخر کرتے نظر آتے ہیں۔ اندر سے انہیں اس پر فخر نہیں' شرمندگی ہے' غصہ ہے' نفرت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے بچوں کو ان کے دادا جی کی شان و شوکت' ذہانت اور قابلیت کے قصے سنائے تھے۔ اپنے باپ کو اپنے بچوں کے سامنے ایک آئیڈیل اور پرفیکٹ انسان کے طور پر پیش کیا تھا۔

کون جان سکتا تھا کہ اپنے اسی آئیڈیل اور پرفیکٹ باپ سے وہ انتہا کی حد تک نفرت کرتے تھے۔

وہ اپنے باپ کو نہ کل معاف کرپائے تھے' نہ آج معاف کرنے کا ظرف ان میں پیدا ہوسکا تھا۔

ان کے اس سخت اور کھردرے مزاج کا ذمہ دار کوئی اور نہیں' ان کا اپنا سگا باپ تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مہوش کنول شیخ

محبت آزمائش بن گئی

ناولٹ

ڈھولکی کی آواز اب اس سے برداشت نہیں ہورہی تھی۔ انتہائی بے بسی سے انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔ لیکن آواز کانوں میں نہیں دماغ میں گونج رہی تھی۔ وہیل چیئر کو ہاتھ سے آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے بیڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ بیڈ کی سائیڈ دراز سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر لائٹ بند کردی۔

اب انگلیاں کانوں کے بجائے سگریٹ سلگانے میں مصروف تھیں۔ ایک' دو' تین' ساری ڈبیا خالی کردی' لیکن ٹینشن کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔

"مجھے ان لوگوں پر بہت غصہ آتا ہے جو ٹینشن کے بہانے سگریٹ جیسی بری عادت میں مبتلا ہوتے ہیں۔" اسے اپنی آواز کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"یہ کیا بات ہوئی' سگریٹ سے تنے ہوئے اعصاب ٹھیک تھوڑی ہوتے ہیں۔ سگریٹ تو ٹینشن ہے۔" اس کی آواز پر نسوانی آواز غالب آگئی۔ اس کے دماغ پر بوجھ اور بڑھ گیا۔

"کوئی بھی یہ کام شوق سے نہیں کرتا۔" دو ملی آوازوں کے درمیان مدھم سی آواز ابھری۔

"اچھا! فرض کرو اگر تمہیں کوئی ٹینشن ہو تو سگریٹ پینا شروع کردو گی؟" اسے دوبارہ اپنی آواز سنائی دی۔

"نہیں! یہ کام کمزور لوگ کرتے ہیں اور میں کمزور نہیں ہوں۔"

"پھر تم کیا کرو گی؟" ان سب پر شوخ آواز غالب آگئی۔

"میں خدا سے رو' رو کر ان گناہوں کی معافی مانگو گی۔ جس کی وجہ سے مجھے سزا مل رہی ہوگی۔ جانتی صبا! خدا اپنے پیارے بندوں پر ہی آزمائش ڈالتا ہے تاکہ وہ اس کی یاد میں مشغول ہوجائے۔" عادت کے مطابق مدھم آواز میں جواب دیا۔

"تمہاری تو ہر بات ہی نرالی ہے۔" صبا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

اور پھر یہی آواز اس کے لیے عذاب بن گئی۔ ایک



بار پھر کرسی کو حرکت دی۔ اب اس کا رخ باتھ روم کی طرف تھا۔

✲ ✲ ✲

وضو کرنے کے بعد وہیل چیئر کو گھماتے ہوئے جائے نماز کے پاس آکر آہستہ سے بیٹھ گیا اور خدا کے حضور ہاتھ اٹھا لیے۔

"اے میرے مولا! تو رحیم ہے' تو کریم ہے' تیری ذات سب سے افضل ہے۔ تیرے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ تیرا یہ حقیر سا بندہ اس کی خوشیوں کی دعا مانگتا ہے۔ یا اللہ! اس کی زندگی میں کبھی کوئی غم نہ آئے۔ وہ سدا خوش رہے۔"

جہاں آنسوؤں میں روانی آئی تھی' وہیں آواز بھی اونچی ہوگئی تھی۔ دعا مانگنے میں اتنا مشغول تھا کہ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کوئی کب سے دروازے میں کھڑا ہے۔

کیا یہ وہی کیپٹن ہادی ہے' جو آنے والوں کی آہٹ پہچان لیتا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں اب کسی اور کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے۔

✲ ✲ ✲

"ارے! آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟"

فروا جو ہادی کو بلانے کی غرض سے آئی تھی' لیکن اسے رات والے حلیے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ لیکن جلد ہی اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی اور کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر رکھنا شروع کر دیے۔

"جلدی سے بتائیے! کون سا سوٹ پہنیں گے؟" فروا نے بلیک پینٹ اور ساتھ میں بلیک ہی شرٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں ہونا تیار اور تم.... تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" ہادی نے شدید غم اور غصے سے کہا۔

فروا حیرانی سے اس کی جانب مڑی۔

"تم جو چاہتی تھیں' ہو گیا۔ اب کیا لینے آئی ہو بار بار بولو' جواب دو۔" اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ کیا بول رہا ہے۔

"میری بے بسی کا تماشا دیکھنے آتی ہو یا اپنی خوشیاں منانے؟ تمہارے ایک گھٹیا مذاق نے ساری زندگی تباہ کر ڈالی۔ تم نے کیوں کیا ایسا؟ ہو! کیا؟"

فروا کے ہاتھ سے کپڑے چھوٹ کر نیچے گر گئے۔ کانوں پر ہاتھ رکھے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔

"نفرت ہے مجھے تم سے' نفرت ہے' شدید نفرت۔"

اس سے پہلے کہ کمرے سے نکل جانے کو دوبارہ اس نے خود ہی دوڑ لگا دی۔

آج کچھ نہیں بچا تھا شاید! کچھ بھی نہیں۔

✲ ✲ ✲

اسے نہیں معلوم کہ بارات کب آئی' صبا پارلر سے کب آئی' کیسی لگ رہی ہے' کھانا کب کھایا' دودھ پلائی کتنی لی' وہ تو بس کسی روبوٹ کی طرح ہانیہ کے ساتھ ساتھ تھی۔ تھک ہار کر کونے والی کرسی پر جا بیٹھی اور خالی خالی نظروں سے اسٹیج کی طرف دیکھنے لگی۔

دماغ ابھی تک ہادی میں اٹکا ہوا تھا اور ہر بات میں لفظ "نفرت" سنائی دے رہا تھا۔ ہر قہقہے میں نفرت کی گونج محسوس ہو رہی تھی۔ چونکی تب جب ہادی کو بیساکھیوں کے سہارے اسٹیج پر آتے دیکھا۔ اب اس کی ساری توجہ ہادی پر تھی جو مسکراتے ہوئے ایاز سے مل رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

"صبا یار! آ بھی جاؤ۔" ہادی' صبا کو آوازیں لگاتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوا۔

"بھائی! کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" ہانیہ نے پوچھا۔

"گڑیا! تم بھی تیار ہو جاؤ۔ باہر چلتے ہیں۔" ہادی نے کہا۔

"نہیں! ہم کیوں کباب میں ہڈیاں بنیں۔" ہانیہ نے چھوٹی سی ناک کو سکوڑ کر کہا۔

"تمہیں جانا ہے تو چلی جاؤ ہانی!" فروا نے آہستہ سے کہا۔

"میں جانا بھی نہیں چاہتی اور ویسے بھی بھائی نے ہمیں دیکھ کر اخلاق نبھایا ہے۔ ورنہ ہم تو یاد بھی نہیں تھے۔" اتنے میں صبا چلی آئی۔

"چلیں ہادی! بائے ہانیہ!"

فروا کو ہمیشہ کی طرح جتانے سے باز نہیں آئی۔ دونوں مسکراتے ہوئے آگے پیچھے باہر نکل گئے۔

✲ ✲ ✲

"تم نے دیکھا' فروا کیسے جل کر راکھ ہو گئی تھی۔" صبا نے گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا۔

"چھوڑو نا! میرے ساتھ ہوتے ہوئے صرف اپنی باتیں کیا کرو۔" ہادی نے موڑ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"آج کدھر جانے کا ارادہ ہے؟" صبا نے پوچھا۔

"جدھر تم کہو۔"

"ٹھیک ہے! آج پھر راول جھیل چلتے ہیں۔"

"کیوں نہیں' ضرور!" ہادی نے فوراً ہی گاڑی راول جھیل کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دی۔

"ہادی! تم میرے ساتھ اس جھیل میں اترو گے؟" صبا نے ہادی کی طرف دیکھ کر کہا' جو جھیل کنارے ہوا سے اٹھنے والی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔

"میں گھر سے نہا کر نکلا تھا۔" ہادی نے مسکرا کر کہا۔

"میں بھی نہا کر ہی آئی ہوں۔" صبا نے منہ پھلا کر کہا۔

"تو پھر کیا پاگل ہو گئی ہو؟" ہادی نے مسکراتی آنکھوں سے دیکھا۔

"ہاں! چلو گھر چلیں۔" صبا عادت کے مطابق غصے میں آگئی۔

"اُف! تم بھی نا بس۔ آؤ! کچھ کھاتے ہیں۔" ہادی نے کہا۔

"مجھے نہیں کھانا کچھ بھی۔ آپ بس گھر چلیں۔"

"آئس کریم بھی نہیں کھاؤ گی کیا؟" ہادی نے اسے لالچ دیا' کیونکہ وہ جانتا تھا آئس کریم کا سنتے ہی سب بھول جائے گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اگلے ہی پل سب کچھ بھول بھال کر وہ ہنستی ہوئی ہادی کے ساتھ چل پڑی۔

✲ ✲ ✲

"ایک بات پوچھوں آپی؟"

ہانیہ نے فروا سے کہا' جو گلاب اور چنبیلی کی کیاریوں سے پھول توڑ توڑ کر خوب صورت گلدان کی شکل دے رہی تھی۔

"ہاں ضرور! پوچھو۔" فروا مسکرائی۔

"آپ تو ویلنٹائن ڈے کو نہیں مانتیں' پھر کس کے لیے پھول توڑ رہی ہیں؟"

"ارے پاگل! میں تو...."

"یہ میرے لیے توڑ رہی ہے۔ اسے تو کسی کو نہیں دینے' لیکن مجھے تو دینے ہوتے ہیں نا!" ہادی نے کہا۔ وہ لان سے گزر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر ادھر ہی آگیا۔

فروا نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر ایک پل کے لیے نظریں ہٹانا ہی بھول گئی۔ ہاتھ میں کیپ پکڑے' وردی میں ملبوس بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

"لائیں! مجھے دیں۔" ہادی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے کیا۔ فروا سارے گلاب ہانیہ کو پکڑا کر چلی گئی۔

"اسے کیا ہوا؟" ہادی نے پریشانی سے پوچھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ حساس' ہر کسی کا خیال رکھنے والا۔

"پتا نہیں! میں دیکھتی ہوں۔" ہانیہ اس کے پیچھے ہی چلی گئی اور ہادی بھی پھول پکڑے لاؤنج کی طرف چل پڑا۔ لیکن ان سب سے ہٹ کر کسی کی مسکراتی آنکھوں میں جلن پیدا ہو چکی تھی۔

✲ ✲ ✲

"نہیں! میں یہ پھول نہیں لوں گی۔" ہادی تیار ہو کر صبا کے کمرے میں گیا تو وہ منہ پھلا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیوں' کیا ہوا ہے ان پھولوں کو؟" ہادی پھولوں کو دیکھنے لگا۔

"میں کیوں لوں کسی کے توڑے ہوئے پھول؟"
صبا نے ویسے ہی پھولے منہ سے جواب دیا۔

"اوہو! تو تمہیں کسی کے توڑے ہوئے پھولوں پر اعتراض ہے۔ پھول دینے پر نہیں۔" ہادی نے سر پر ہاتھ مار کر جواب دیا۔

"ہاں! آپ میرے لیے اتنا سا بھی ٹائم نہیں نکال سکتے کہ اپنے ہاتھوں سے پھول توڑ کر گلدستہ بنا دیتے؟"

"پاگل! یہ جو آفس میں اتنا کام کرتا ہوں' یہ ساری محنت تمہارے خواب پورے کرنے کے لیے ہی تو کرتا ہوں۔" ہادی نے صبا کا کان پکڑ کر کہا اور باتھ روم کی طرف دھکیل دیا۔

"جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ' پھر سب مل کر آؤٹنگ کے لیے چلتے ہیں۔ میں ان سب کو بھی کہہ دوں۔" ہادی کہتا ہوا باہر کی طرف چل پڑا۔

☆ ☆ ☆

عبدالمجید اور عابدہ کے تین ہی بچے تھے۔ دو بیٹے' سجاد' جواد اور ایک بیٹی مریم۔ عبدالمجید کا اپنا چمڑے کا کاروبار تھا جو اب بیٹوں نے سنبھال رکھا تھا۔ انہوں نے سجاد کی شادی اپنی بھتیجی نجمہ کے ساتھ اور جواد کی شادی عابدہ کی بھانجی کشمالہ کے ساتھ کردی' جبکہ بیٹی کی شادی غیروں میں ہوئی' لیکن دس سال کے بعد ہی مریم کو ماں' باپ کی دہلیز پر واپس آنا پڑا۔ اسلم دل کے مریض تھے۔ شادی کے دس سال بعد ہی دنیا چھوڑ گئے۔ مریم کی ایک ہی بیٹی فروا تھی۔ نیچے دونوں بھائی اور اوپر والا پورشن مریم کے نام کردیا۔

سجاد کا اکلوتا بیٹا کیپٹن ہادی تھا جبکہ جواد کے تین بچے تھے۔ صبا سے تین سال چھوٹا ہاشم اور پانچ سال چھوٹی ہانیہ۔

صبا اور فروا ہم عمر تھیں۔ صبا فطرتاً" خود پرست تھی۔ اسے فروا ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ ہمیشہ صبا اور فروا کے لیے ایک جیسی چیز آتی' لیکن صبا یہ سب برداشت نہ کرپاتی اور جو چیز فروا کو پسند آتی فوراً" وہ چھین لیتی۔ چاہے اسے پسند نہ بھی ہو۔ وہ صبا کی خوشی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ دونوں سیکنڈ ایئر میں تھیں۔ ہادی ایم بی اے کررہا تھا۔ صبا کی نسبت فروا زیادہ ذہین تھی۔ فروا کا جھکاؤ ہادی کی طرف تھا۔ یہ بات کوئی اور تو نہیں' لیکن صبا کا شاطر دماغ جان گیا تھا۔ صبا پڑھنے کے بجائے فروا کا جائزہ لیتی رہتی۔ فروا بھی صبا سے چھپنے کی کوشش کرتی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ ہمیشہ کی طرح صبا اس کی محبت نہ چھین لے۔ لیکن ہوتا وہی ہے' جو قسمت میں لکھا ہو۔

رزلٹ آنے پر ہمیشہ کی طرح فروا نے پھر پوزیشن لی' جبکہ صبا بمشکل پاس ہوئی تھی۔ ہادی کے منہ سے فروا کی تعریف صبا سے برداشت نہ ہوسکی۔ وہ جو ہمیشہ اسے نیچا دکھانے کی کوششوں میں لگی رہتی تھی' ایک بار پھر اسے سبقت لے جاتا دیکھ کر برداشت نہ کرسکی۔ فروا کی سب سے قیمتی چیز کو چھین لینے کا منصوبہ بنالیا اور اپنی ماما کے پاس جا پہنچی۔

☆ ☆ ☆

"ماما! میں شادی کروں گی تو صرف ہادی سے۔ آپ پاپا کو بھی بتادینا۔" صبا نے حتمی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! کچھ دن انتظار کرو۔ میں تمہارے پاپا سے بات کرتی ہوں۔" کشمالہ کو بھی اس سب میں کچھ خاص برا نہیں لگا تھا۔ لیکن نیچے آتی ہوئی فروا نہ نیچے آسکی اور نہ ہی اوپر جاسکی۔ وہ تو ابھی اپنے پاس ہونے کی خوشی بھی نہیں منا سکی تھی کہ ہمیشہ کی طرح صبا نے ایک بار پھر اس کی خوشی چھین لی تھی۔

☆ ☆ ☆

کچھ دنوں کے بعد صبا اور ہادی کی منگنی تھی۔ ہادی بھی سب کی طرح یہی جانتا تھا کہ صبا اس سے ہمیشہ محبت کرتی ہے۔ سوائے فروا کے کوئی حقیقت نہ جان پایا' لیکن فروا کو اپنی عزت سب سے عزیز تھی۔

نہیں تھا زور اس کی ستم نوازیوں کا گر
مجھے بھی حوصلے میرے خدا سے ملے

میری انا کیوں کہتی ہے بار بار مجھے
وہ محبت ہی کیسی جو التجا سے ملے

اس نے ایک بار پھر تقدیر سمجھ کر صبر کرلیا۔ بے شک یہ اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ لیکن تقدیر سے کوئی نہیں لڑسکتا اور پھر فروا جو شکوہ زبان پر لانا بھی گناہ سمجھتی تھی' کیسے لڑتی۔۔۔

☆ ☆ ☆

وہ سب لاؤنج میں بیٹھے زوروشور سے باتیں کررہے تھے۔

"ہانیہ بیٹا! آج پڑھنا نہیں ہے کیا؟" عابدہ نے پوچھا جو بچوں کا شور سن کر ادھر ہی آگئی تھیں۔

"پڑھتی ہوں امی جی! کچھ دیر میں۔" ہانیہ نے جھٹ جواب دیا اور دوبارہ باتوں میں لگ گئی۔

"سب اپنے کمروں میں جاؤ۔ بہت رات ہوگئی ہے۔" عابدہ نے گھڑی کی جانب دیکھا جو بارہ بجارہی تھی۔ ہانیہ اور ہاشم اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"پلیز فروا! دو کپ کافی کے تو بنادو۔" صبا نے فروا کو سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ وہ خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"ہادی! تم اپنی گاڑی لے لینا شادی سے پہلے ہی۔" صبا نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا۔

"کیوں؟ اب بھی تو اپنی ہی گاڑی پر جاتے ہیں۔" ہادی نے کہا۔

"اُفوہ! میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔" صبا نے کہا۔

"اور کیا مطلب ہے پھر؟" ہادی نے کہا۔

"دیکھو نا! جب اپنی گاڑی ہوگی تو میں بھی سیکھ لوں گی اور پھر تم تو جانتے ہی ہو مجھے بسوں کے دھوئیں سے کتنی الرجی ہے۔" صبا نے بالوں کو ایک ادا سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ ہادی مسکرانے لگا۔

"اور اتنا تو بسوں کا دھواں نہیں ہوتا جتنا سگریٹ نوشی کا۔ پتا نہیں کیوں ہماری حکومت اس کے خلاف کوئی اقدامات ہی نہیں اٹھارہی۔" صبا نے ناک سکوڑ کر کہا۔

"آپ نے کبھی سگریٹ نوشی کی ہے؟"

"زبان ہے یا۔۔۔" فروا نے صبا کا نیا سوال سن کر سوچا۔

"نہیں جی!" ہادی نے کہا۔

"کیا کبھی بھی نہیں؟" صبا نے یقین نہ کرنے والے انداز میں کہا۔

"نہیں! میری جان کو ہی جب پسند نہیں تو پھر اب تو کبھی نہیں۔" ہادی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا اور صبا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"بلکہ مجھے تو ان لوگوں پر بہت غصہ آتا ہے جو ٹینشن کے بہانے سگریٹ جیسی بری عادت میں مبتلا ہوتے ہیں۔" ہادی نے مزید وضاحت دی۔

"یہ کیا بات ہوئی' سگریٹ سے تنے ہوئے اعصاب ٹھیک تھوڑی ہوتے ہیں' سگریٹ تو خود ٹینشن ہے۔" صبا نے کہا۔

"کوئی بھی یہ کام شوق سے نہیں کرتا۔" فروا نے کافی کا کپ پکڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا! فرض کرو اگر تمہیں کوئی ٹینشن ہو تو تم سگریٹ پینا شروع کردو گی۔" ہادی نے کہا۔

"نہیں! یہ کام کمزور لوگ کرتے ہیں اور میں کمزور نہیں ہوں۔" فروا نے کہا جو ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

"پھر تم کیا کرو گی؟" صبا نے پوچھا۔

"میں خدا سے رو' رو کر ان گناہوں کی معافی مانگوں گی جس کی وجہ سے مجھے سزا مل رہی ہوگی۔ جانتی ہو صبا! خدا اپنے پیارے بندوں پر ہی آزمائش ڈالتا ہے۔ تاکہ اس کی یاد میں مشغول ہوجائیں۔" فروا نے کہا۔

"تمہاری تو ہر بات ہی نرالی ہے۔" صبا نے جھنجلا کر جواب دیا۔

جبکہ وہ خاموشی سے دونوں کی بحث سنتا رہا۔

☆ ☆ ☆

فروا نے بی کام میں بھی شان دار نمبر لیے اور مزید پڑھنے کے لیے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ صبا نے

بھی معمولی نمبروں کے ساتھ بی اے کرلیا۔ اس نے ایم اے اکنامکس پرائیویٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہادی نے ترقی کرکے بہت جلد کیپٹن کی سیٹ سنبھال لی۔ ہادی ہر کسی کی آنکھ کا تارا تھا۔ وہ محنتی نوجوان تھا۔

فروا کے لیے جواد ماموں کے دوست ایاز کے بیٹے کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا۔ سب ہی راضی تھے۔ لیکن فروا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی تھی۔

سب نے بہت کہا' لیکن وہ اپنے موقف سے نہیں ہٹی۔ ماموں زبردستی کے قائل نہیں تھے' اس لیے کچھ وقت کے لیے ٹال دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ تینوں بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔

''آپی! لوگ اپریل فول کس کی یاد میں مناتے ہیں؟'' ہانیہ نے فروا سے پوچھا۔ وہ صبا کی نسبت فروا کے زیادہ قریب تھی۔

''تمہیں اس سے کیا۔ مزا تو بہت آتا ہے اس دن۔'' صبا نے کہا۔

''جھوٹ چاہے مذاق میں بھی بولا جائے' وہ جھوٹ ہی ہوتا ہے۔'' فروا نے کہا۔

''تم اب اپنی نصیحتیں نہ جھاڑنا شروع کردینا۔ میں اس بار ہادی کو بے وقوف بناؤں گی' بلکہ فروا! تم کال کرنا کہ میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے' آپ جلدی آجائیں۔'' صبا نے کہا۔

''نہیں! میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔'' فروا نے فوراً کہا۔

''ہاں! یہ تو ہے' ورنہ دل میں تو دعا مانگتی ہوگی۔ ہانیہ! پھر تم کرنا۔'' صبا نے فوراً ہانیہ کی طرف رخ کیا۔

''نہیں! ہانیہ بھی نہیں کرے گی اور صبا! ایسے مذاق نہیں کرتے۔ تم خود سوچو' اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ ہوجائے تو۔'' فروا نے فوراً کہا۔

''تم کبھی اپنی کالی زبان سے اچھا نہ نکالنا۔'' صبا نے ناک چڑھا کر کہا۔

''آپی! ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ہانیہ نے بھی فروا کا ساتھ دیا۔

''تم تو چپ ہی رہو۔ تم ہو ہی اس کی چمچی' پھر تمہیں کیوں غلط لگے گا۔'' صبا نے ہانیہ کو جھڑک دیا۔

''اور اب تم لوگ کل تک صبر کرلینا' میں خود ہی کچھ کرلوں گی۔'' صبا کہتی ہوئی ان کے پاس سے اٹھ گئی اور وہ دونوں بس دیکھ کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

''فروا آپی! یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔'' ہانیہ جو کافی دیر سے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی فروا کو چاند سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ خود بھی لان میں آگئی۔

''اوں.... ہوں.... کچھ نہیں۔'' فروا نے کسی خیال سے چونک کر کہا۔

''آر یو اوکے....؟ آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔'' ہانیہ نے کہا۔

فروا اپنی سوچ کا کنارہ پاتے ہی فوراً ہانیہ کی طرف مڑی۔

''ہانیہ! تم ایک کام کروگی؟'' فروا نے بے چینی سے پوچھا۔ جیسے وہ یہ کام جلد از جلد کرنا چاہتی ہو۔

''جی ہاں! کیوں نہیں' لیکن آپی! ایسا کون سا کام ہے جس کے لیے آپ اتنی پریشان ہیں؟'' ہانیہ نے حیرانی سے پوچھا۔ فروا اپنی جلد بازی پر قابو پاتے ہوئے رخ موڑ گئی۔

''کیا ہوا آپی' بتائیے نا؟ چپ کیوں ہوگئیں۔'' ہانیہ گھوم کر فروا کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''آؤ! ادھر بیٹھو۔'' فروا' ہانیہ کا بازو پکڑ کر کرسیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ''دیکھو ہانی! تمہیں معلوم ہے نا' صبا جیسا کہتی ہے' ویسا کرتی بھی ہے۔'' فروا نے کہا۔

''ہاں آپی! لیکن آپ کیوں اتنی پریشان ہیں؟'' ہانیہ نے کہا۔

''تم اسے منع کرو' وہ ہادی کو فون نہ کرے۔ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔'' فروا نے کہا۔

''لیکن آپی! یہ سب تو مذاق ہے نا؟'' اب کی بار ہانیہ نے کچھ الجھ کر جواب دیا۔

''ہاں! یہ سب مذاق ہے' لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ہانی! پتا ہے ایسا ہی ڈر مجھے ابو کی وفات کے وقت محسوس ہوا تھا۔ بے شک میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ لیکن وہ ڈر مجھے آج بھی محسوس ہو تو میں کانپ جاتی ہوں۔ پلیز ہانی! میں بہت پریشان ہوں۔ صبا کو کہو کہ ایسے مذاق نہیں کرنے چاہئیں۔ پلیز اسے کسی طرح سمجھاؤ۔''

ہانیہ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں چھپے ڈر و خوف کو دیکھتے ہوئے کچھ پل کے لیے کچھ بول ہی نہیں سکی۔

''وہ کسی کی نہیں مانتیں آپی!'' ہانیہ نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔

''ہاں! میں جانتی ہوں' لیکن تم ہادی سے کہو کہ....''

''نہیں' نہیں! آپ مجھے مروائیں گی' صبا آپی کے ہاتھوں۔'' ہانیہ نے فروا کی بات پوری ہی نہیں ہونے دی۔

''آپی! آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ صرف مذاق کررہی ہیں۔'' ہانیہ نے فروا کو بولنے کے لیے لب کھولتے دیکھ کر کہا۔

''لیکن ہانی! جھوٹ تو مذاق میں بھی بولنے کی اجازت نہیں ہے اور پھر وہ تو یہ سب مغربی روایت کو نبھانے کے لیے کررہی ہے۔ یہ تو اس سے بھی غلط ہے نا۔'' فروا نے کہا۔

''اچھا چھوڑیں آپی! رات کافی ہوگئی ہے' آپ خوامخواہ پریشان ہورہی ہیں' کچھ نہیں ہوتا۔'' ہانیہ نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

''کیا؟ کک.... کون.... کون سے اسپتال میں ہے؟'' ہانیہ جو پاس ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسپتال کا نام سن کر پاس چلی آئی اور فروا کے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور لے کر کان سے لگالیا اور اب ہانیہ کی حالت بھی فروا جیسی تھی۔ تھوڑی دیر میں سب جمع ہوگئے۔

''تمہیں منع کیا تھا نا' یقیناً'' یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' فروا نے صبا کو دیکھا تو برداشت کھو بیٹھی۔

''بولو! تم نے کی تھی کال؟'' لیکن صبا صاف مکر گئی۔

''کون سی کال کی بات کررہی ہو اور کیا ہوا ہے؟'' سب لوگ اصل بات سے بے خبر حیران و پریشان کھڑے فروا کو دیکھ رہے تھے۔ جو اس لمحے شاید اپنے آپ میں نہیں لگ رہی تھی۔

''آپی! پلیز چپ کریں۔ ہادی بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہیں۔ حالت نازک بتائی ہے۔'' ہانیہ نے اٹک اٹک کر تمام بات بتائی' جسے سن کر سب دنگ رہ گئے۔

''یہ فون والا کیا معاملہ ہے؟'' کشمالہ آگے بڑھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی متوجہ ہوتا' ڈرائیور نے گاڑی نکال لی۔ نجمہ' کشمالہ اور صبا چلی گئیں۔ فروا نے جانے کی کوشش کی' لیکن صبا نے روک دیا۔ ہانیہ نے فروا کو صوفے پر بٹھا کر پانی لاکر دیا اور پھر فون کی طرف بڑھ گئی۔

ہادی کی حالت بہت نازک تھی۔ ایک ٹانگ میں شدید زخم آئے تھے۔ سر میں بھی چوٹیں لگی تھیں۔ اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ سب کوریڈور میں گھوم رہے تھے۔ کوئی دعا مانگ رہا تھا اور کوئی تسبیح پڑھ رہا تھا۔ جواد اور سجاد بھی سیدھے اسپتال گئے تھے۔ سب بہت پریشان اور دعاگو تھے۔ نجمہ کا رو' رو کر بہت برا حال تھا۔ لیکن ان سب سے الگ تھلگ ایک ایسا وجود بھی تھا جو دعا کی بجائے سوچنے میں مصروف تھا۔ دوسروں کو آزماتے' آزماتے خود اپنے لیے آزمائش کھڑی ہوگئی۔

صبا نے بہت رازداری سے سم تبدیل کرکے کال کی تھی۔ آواز بھی کافی حد تک تبدیل کرلی تھی۔ ہادی میٹنگ میں مصروف تھا۔ موبائل پر آنے والے نئے نمبر کو دیکھ کر کال کاٹ دی۔ لیکن پھر تھوڑی دیر بعد دوبارہ آنا شروع ہوگئی۔ اپنے دوست وقار کے کہنے پر کہ ''ضروری کال بھی ہوسکتی ہے۔'' کال ریسیو کی اور پھر صبا کے اسپتال میں ہونے کی خبر سن کر وہ میٹنگ بھی

بھول گیا۔ اتنا بھی دھیان نہیں رہا کہ صبح تو ٹھیک چھوڑ کر آیا تھا' اب اچانک ایسا کیا ہو گیا کہ اسپتال پہنچ گئی اور دوسری طرف صبا اس کی حواس باختہ آواز سن کر خوش ہو گئی۔

دوسرے دن وقار' ہادی کی خیر لینے آیا اور سجاد کو نئی الجھن میں ڈال گیا۔ "وہ کون ہو سکتا ہے جس نے ہادی کو اس نوبت تک پہنچایا۔" وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سب کے درمیان آکر کھڑے ہو گئے۔ ہادی کو ہوش آگیا تھا۔

"ہادی کو کسی لڑکی کا فون آیا تھا کہ صبا اسپتال میں ہے۔ ہادی اسی کی کال سن کر جا رہا تھا' لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے جس نے اتنی گری ہوئی حرکت کی۔" سجاد بولنے پر آئے تو بولتے چلے گئے۔ شاید اولاد کا غم ایسا ہی ہوتا ہے۔ صبا پہلے تو بہت خوفزدہ ہو گئی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ خوف کم ہوتا گیا۔ دماغ میں ایک نئی ترکیب سوچ کر ان کی طرف بڑھ گئی۔

"میں بتاتی ہوں انکل!" سب کے پاس صبا کی آواز گونجی اور سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"پرسوں "اپریل فول" تھا۔ فروا نے پہلے مجھے کہا کہ ہادی سے مذاق کرتے ہیں' لیکن میں نہیں مانی اور اسے بھی ایسا کرنے سے منع کیا تو وہ کہنے لگی' یہ صرف مذاق ہے' کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی' لیکن وہ نہیں مانی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ حرکت اسی کی ہے۔" صبا نے ہچکیوں کے درمیان جھوٹا قصہ سنایا۔

پھوپھو دیوار کو تھام کر نیچے بیٹھ گئیں۔ سب بہت حیران ہوئے کسی کو ابھی فروا سے ایسی حرکت کی امید نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہانیہ! تم کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔" فروا نے کہا جو پچھلے دو دنوں سے اسپتال جانے کو بے تاب تھی' لیکن گھر میں کھانا بنانے کی ذمہ داری اس پر ہونے کی وجہ سے جا نہیں سکی تھی۔ وہ ابھی پرہیزی کھانا بنا کر کمرے میں آئی تھی۔

"نہیں آپی! میں نہیں بتاتی۔ آپ تو اس دن بہت جذباتی ہو گئی تھیں۔" ہانیہ نے کہا۔

"ہاں! بس پتا نہیں مجھے اچانک کیا ہو گیا تھا۔" فروا نے کہا۔

باہر جواد جو کھانا لینے کی غرض سے آئے تھے کچھ دیر کے لیے اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکے۔ جس بھانجی کو ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھا' اسی نے اتنا برا مذاق کر دیا۔ اسے کیا دشمنی تھی ہادی سے جو ایسا گھٹیا مذاق کیا۔ وہ کافی دیر تک سوچتے رہے اور پھر وہیں سے آواز لگا کر کھانا منگوایا اور ان کے کہنے کے باوجود انہیں نہیں لے کر گئے۔ انہیں بھانجی سے زیادہ بیٹی کا دکھ ہوا جس سے وہ صبا سے زیادہ پیار کرتے تھے۔

☼ ☼ ☼

آج ہادی پندرہ دنوں کے بعد ڈسچارج ہو کر گھر آرہا تھا۔ سب سے زیادہ فروا کو انتظار تھا۔ وہ پندرہ دنوں میں کئی بار کوشش کر چکی تھی لیکن کوئی اسے ساتھ لے جانے کے لیے نہیں مانا۔ البتہ ہانیہ دو بار زبردستی ہو آئی تھی۔ فروا نے زبردستی کرنا سیکھی ہی نہیں تھی۔ آج سب کو اس کی یہ عادت بھی بہت بری لگ رہی تھی۔

ایک دم شور بلند ہوا تو اس نے کچن کی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔

ہادی' ماموں کے سہارے آہستہ آہستہ چلتا ہوا آرہا تھا۔ فروا نے بے اختیار دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا اور دوبارہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

ہادی اب صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ سر کی چوٹیں تو ٹھیک ہو گئی تھیں' لیکن ٹانگ ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔

فروا نے پیالے میں سوپ ڈالا اور دوپٹہ درست کرتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہو گئی۔

"السلام علیکم۔۔۔"

اس کے سلام کرنے پر سب نے عجیب نظروں سے

دیکھا لیکن وہ نظرانداز کرتے ہوئے ہادی کی طرف بڑھ گئی۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" فروا نے سوپ کا پیالہ آگے کرتے ہوئے پوچھا۔ لیکن ہادی نے پیالہ پکڑ کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ بھی دوسروں کی زبانی سن چکا تھا کہ اسے یہاں تک لانے والی وہی ہے۔ اسے یقین تو نہیں آیا تھا لیکن اپنی حالت اتنی آسانی سے نظرانداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"ہوں! تو موصوف ناراض ہیں۔ کوئی بات نہیں' میں سوری کر لوں گی اور بتا دوں گی کہ میں نے بہت کوشش کی تھی اسپتال جانے کی لیکن کوئی لے کر ہی نہیں گیا اور پھر پرہیزی کھانا بھی بنانا تھا۔"

فروا سوچتی ہوئی دوبارہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ہانیہ بھی اس کے پیچھے ہی کچن میں آگئی تھی۔

"دیکھو بہن! ہم تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔ فروا نے خود سے معافی نہیں مانگی تو ہم بھی مجبور نہیں کریں گے' لیکن دوبارہ اس بات کا ذکر نہ سنوں۔ کل کلاں کو رشتہ بھی کرنا ہے اور پھر لوگ کیا کہیں گے۔ اس طرح بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ خاموشی اختیار کر لی جائے۔" سجاد نے مریم کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر اٹھ کر کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

ہادی کو سہارے کی ضرورت رہتی تھی اسی لیے ہر وقت ایک مرد گھر میں موجود ہوتا تھا۔ ہادی اکثر لڈو کھیلتا رہتا یا ٹی وی دیکھ لیتا تھا۔ ایک کیپٹن کے لیے یہ زندگی بہت مشکل تھی' لیکن گزارنی تھی۔ صبا پہلے کچھ دن تو خوب باتیں کرتی رہی' لیکن پھر اس زندگی سے بور ہو گئی۔ اب وہ زیادہ وقت ہادی کے ساتھ گزارنے کی بجائے کمرے میں گزارتی اور ہادی کے پوچھنے پر کوئی بہانہ بنا دیتی۔

اب بھی فروا ہی پرہیزی کھانا بناتی تھی گو کہ نجمہ منع کرتی رہتی تھیں۔ لیکن اسے ہادی کے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن پھر بھی ہادی صحیح طریقے سے بات نہیں کرتا تھا۔

فروا' ہانیہ سے پوچھتی تو وہ "بیماری کی وجہ سے چڑچڑا ہو گیا ہے" کہہ کر ٹال دیتی۔ ہادی کی ٹانگ کے زخم خاصے بگڑ گئے تھے۔ اسے اسپتال میں دوبارہ داخل کرا دیا گیا۔ پاؤں زیادہ خراب ہو جانے کی وجہ سے کاٹنا پڑا۔

سب کے لیے یہ دل دہلا دینے والی خبر تھی۔ لیکن ہادی کی خاطر برداشت کر لیا تھا۔ ہادی کو بھی پتا چل گیا تھا لیکن وہ بڑوں کی خاطر برداشت کر گیا اور وہ تو پھر جہاں خدا رکھے' وہیں خوش رہنے والا بندہ تھا۔

☼ ☼ ☼

زندگی دوبارہ معمول کے مطابق چل پڑی۔ وہی دن' وہی راتیں اگر فرق آیا تھا تو وہ صبا اور ہادی کی زندگی میں۔ صبا اب ہادی سے دور بھاگتی تھی بلکہ ایک' دو بار کہہ بھی چکی تھی کہ وہ اب معذور کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ وہ ایک معذور کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ وہ اس بندھن سے جان چھڑوانے کے نئے نئے منصوبے بناتی رہتی' رہی سہی کسر دوستوں نے پوری کر دی۔

"صبا! تم اتنی خوبصورت ہو۔ کیا ساری زندگی ایک معذور کے ساتھ گزارا کر لوگی۔ وہ تمہیں دے گا ہی کیا؟ چھوڑو یار!" اس کی دوستیں آئیں تو ہادی کی عیادت کے لیے تھیں' لیکن اب اس کے کمرے میں بیٹھی نئے مشوروں سے نواز رہی تھیں۔ صبا جب سے ہی سوچوں میں گم تھی کہ ایسا کیا کیا جائے کہ "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"۔ اتنے میں ہادی نے بلاوا بھیج دیا۔

"صبا آپی! آپ کو ہادی بھائی اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔" ہاشم کہہ کر بھاگ گیا اور صبا ہادی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی۔ ہادی وہیل چیئر پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ دستک پر چونک گیا۔

"تمہیں دستک دینے کی ضرورت کب سے پیش آنے لگی؟" ہادی نے صبا کو دیکھ کر کہا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے کمرے میں بغیر دستک کے جاتے تھے۔

"جی! آپ نے بلایا تھا؟" صبا نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

ہادی گہرا سانس لے کر بولا۔ "مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے صبا! بیٹھو۔" بیڈ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ صبا کو نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنا پڑا۔

"صبا! میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔" ہادی اتنا کہہ کر چپ ہوگیا۔ اس کے لیے یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔

"آپ چپ کیوں کر گئے ہادی!" صبا نے بے چینی سے کہا۔ اس کی سانس اٹکی ہوئی تھی' ہادی کیا کہنا چاہتا ہے۔

"میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔" وہ ایک بار پھر چپ ہوگیا۔ صبا کی بے چینی اور بڑھ گئی۔

"آپ بتایئے نا ہادی! چپ کیوں ہوگئے؟"

"تم۔۔۔ تم کسی اور سے شادی کرلو۔ میں اب تمہارے قابل نہیں رہا۔" ہادی نے اٹک اٹک کر بیان کیا۔ صبا کے سینے سے بھاری سل ہٹ گئی۔

"لیکن آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟" اس کا دل ناچنے کو چاہ رہا تھا لیکن ایسا ممکن نہیں تھا' اسی لیے مارے مروت کہ اسے پوچھنا پڑا۔

"میں اب معذور ہوں۔ میں خود دوسروں کا محتاج ہوں' پھر تمہیں کیسے خوش رکھ سکوں گا۔" ہادی کے لیے یہ سب بہت مشکل تھا۔ صبا فوراً" اٹھ کر باہر بھاگ گئی۔ اسے ڈر تھا کہیں اندر کی خوشی باہر نہ نکل پڑے۔ باہر کھڑی ہانیہ ایک طرف ہوگئی۔ صبا کے جاتے ہی قدم اندر کی جانب بڑھا دیے۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ہادی بھی یہ بات کہہ کر اتنا ہی خوش ہے' جتنی سن کر صبا۔

ہادی کی بند آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر وہ جس خاموشی سے اندر گئی تھی' اسی خاموشی سے باہر آگئی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے اس بات پر ندامت ہو رہی ہے کہ آپ میری بہن ہیں۔" ہانیہ صبا کے کمرے میں چلی آئی۔

"کیوں؟ میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟" صبا نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"آپ کی وجہ سے ہادی بھائی یہاں تک پہنچے اور آپ کو ذرا ندامت نہیں ہے۔ یہ کیسی محبت ہے آپ کی؟ ایک ہادی بھائی ہیں جنہوں نے صرف آپ کی خاطر انکار کر دیا۔ صرف آپ کی زندگی کی خاطر اور آپ کو ذرا دکھ نہیں ہوا بلکہ دکھ تو کیا خوشیاں منا رہی ہیں۔" ہانیہ بولنے پہ آئی تو بولتی چلی گئی۔ ان کی آواز سن کر کشمالہ بھی ادھر ہی آگئیں۔

"کیا ہوا ہے ہانیہ؟" اس نے ہانیہ سے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے ماما! اس سے میری خوشیاں برداشت نہیں ہو رہیں۔ یہ چاہتی ہے کہ میں ایک معذور کے ساتھ پوری زندگی سسک سسک کے گزار دوں۔" ہانیہ سے پہلے صبا نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ پوری بات بتاؤ۔" کشمالہ نے دونوں کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ آج سے پہلے کبھی دونوں اس طرح نہیں جھگڑی تھیں۔

"ماما! اس کی وجہ سے آج ہادی کی یہ حالت ہے۔" ہانیہ نے کشمالہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں؟ میری وجہ سے کیوں ہے؟ وہ صرف ایک مذاق تھا۔ ویسے بھی سب قسمت کی بات ہے اور پھر میں نے نہیں' ہادی نے شادی سے انکار کیا ہے۔" کشمالہ کے سر پر دھماکا ہوا۔

"ہادی نے تمہارے ساتھ شادی سے انکار کر دیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ماما! وہ چاہتا ہے کہ میں اپنے جیسے کسی مکمل انسان سے شادی کروں لیکن یہ سب ہانیہ سے برداشت نہیں ہو رہا۔" صبا نے کہا۔

"مجھے بھی اس بات کی بہت فکر تھی۔ چلو! شکر ہے' ہادی نے خود ہی انکار کر دیا۔" ہانیہ کی آنکھیں اپنی ماں کی بات سن کر کھلی رہ گئیں۔

"کیا ماما آپ بھی۔۔۔؟" دکھ کی وجہ سے ہانیہ سے بولا

نہیں گیا۔

"تو۔۔۔؟ والدین اپنے بچوں کے بارے میں اچھا ہی سوچتے ہیں۔ تم ابھی نادان ہو۔ تمہیں کیا پتا زندگی کیسے گزرتی ہے۔" کشمالہ نے ہانیہ کو جھاڑ دیا۔

ہانیہ آنسو ضبط کیے سر جھکا کر باہر کی طرف چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

"ہادی نے صبا سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔"

دو دن بعد ہی پورے گھر میں یہ بات جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ سب نے باری باری ہادی سے پوچھا، سمجھایا، لیکن اس کی نہ "ہاں" میں نہیں بدلی۔ ہانیہ کو اپنی بہن پر بہت غصہ آرہا تھا، لیکن بڑوں کی وجہ سے خاموش تھی۔ اس کا زیادہ وقت ہادی کے ساتھ گزرتا۔ بہت بار ہادی سے پوچھا، لیکن وہ مسکرا کر ٹال دیتا۔ پھر بہت جلد ہی فروا کے لیے آیا ہوا رشتہ صبا کے لیے پسند کر لیا گیا۔ انہیں تو پہلے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ صبا کو برا تو بہت لگا لیکن پھر ایاز کے ڈاکٹر ہونے اور معذور شخص سے اتنی جلدی جان چھوٹ جانے پر مطمئن بھی تھی پھر اس خوشی کے آگے نفرت، غصہ سب کچھ ماند پڑ گیا کہ وہ ایک بار پھر فروا سے جیت گئی ہے۔

ایاز کو لندن میں ملازمت مل گئی تھی گو کہ وہ پاکستان میں بھی اچھی جاب کر رہا تھا لیکن انسان کو ہمیشہ بہتر کی تلاش رہتی ہے۔ اس طرح ایک مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی اور وہ دونوں لندن چلے ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

ہادی کو مصنوعی پاؤں لگوا دیا تھا۔ شروع میں مشکل تو ہوئی، لیکن پھر آہستہ آہستہ عادت ہو گئی۔

آج اس کا ایکسیڈنٹ کے بعد آفس میں پہلا دن تھا۔ سب لوگ اس کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے، جو خیریت پوچھنے کے بجائے پاؤں دیکھنے کے لیے زیادہ اشتیاق رکھتے تھے۔

ہادی ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا۔ ہر کسی کا جواب مسکرا کر دے رہا تھا۔ بظاہر تو سب ٹھیک تھا لیکن یہ کوئی ہادی کے دل سے پوچھتا کہ پاؤں کے بارے میں کیے گئے ہر سوال پر اسے کتنی تکلیف ہوتی تھی۔

چھ مہینوں کے بعد دفتر آیا تھا۔ اسے امید تو نہیں تھی کہ دوبارہ جاب کے لیے اجازت ملے گی لیکن یہاں پر اس کی قابلیت کام آگئی تھی۔ آج اسی سلسلے میں ایک میٹنگ رکھی گئی تھی۔ سب میٹنگ روم میں جمع ہو گئے تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن ہادی خود میں ہمت نہیں پا رہا تھا۔ دوسری بار انٹر کام بجا تو اسے حوصلہ پیدا کرنا پڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھول کر اسی انداز سے چلتا ہوا اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن کرسی کے پاس جا کر ایک بار پھر ہمت کھو دی۔

اس کے اندر اس پل بہت کچھ ٹوٹ کے بکھرا تھا۔ پچھلے چھ مہینوں میں اس نے سب کچھ کھو دیا تھا۔ اپنا پاؤں، جان سے عزیز صبا۔ اسی جگہ پر کال آئی تھی اور پھر بہت کچھ غلط ہو گیا تھا۔ کسی کی مذاق میں کی گئی کال نے اسے ہمیشہ کے لیے ادھورا کر دیا تھا۔ وہ یہ سب کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن آج تو اسے اپنی سوچ پر بھی قابو نہیں رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کرسی کی پشت کو تھام لیا۔

میٹنگ کے لیے آئے ہوئے سب لوگ میٹنگ بھول چکے تھے۔ ہادی کو کانپتا ہوا دیکھ کر فوراً" وقار آگے بڑھا اور اسے کرسی پر بٹھا دیا اور میٹنگ کینسل کرنے کو کہہ دیا۔ ہادی کے وجود نے کانپنا بند کر دیا اور اب تواتر سے اس کی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا۔ وقار اس کے پاس دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ آج پہلی بار رویا تھا اور شاید آخری بار بھی۔ وقار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔

☼ ☼ ☼

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔

ہادی پہلے کی طرح ڈیوٹی پر جاتا تھا لیکن اب وہ بہت خاموش ہو گیا تھا۔ مسکرانا تو جیسے بھول ہی گیا تھا۔ صبح آفس جاتا اور واپسی پر پہلے کی طرح چھیڑ چھاڑ کرنے کی بجائے سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا اور زیادہ تر رات کا کھانا بھی اپنے کمرے میں ہی منگوا لیتا۔

اب سب لوگ اس کی شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے اور لڑکی بھی ان کی نظر میں تھی۔ ان سب کا خیال تھا کہ جس نے ہادی کی زندگی کو ادھورا کیا تھا، اب وہ ہی اسے پورا کرے۔ شاید اسی طرح خدا اسے بھی بخش دے۔

اور آج اسی سلسلے میں سجاد اس کے کمرے میں آئے تھے۔

"پاپا! آپ نے مجھے بلوا لیا ہوتا۔" ہادی باپ کو دیکھ کر فوراً" کھڑا ہو گیا اور کمپیوٹر بند کر دیا اور پھر اپنے باپ کے منہ سے شادی کے لیے فروا کا نام سن کر حیران رہ گیا۔

"پاپا! آپ میرے لیے اس لڑکی کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے میری زندگی برباد ہوئی؟"

"بیٹا! خدا شاید اسی طرح اسے بخش دے۔" سجاد نے کہا۔

"نہیں پاپا! میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں کبھی اسے خوش نہیں رکھ سکوں گا۔"

"تمہیں اب بھی اس کی خوشیوں کا خیال ہے؟" سجاد نے غصے سے کہا۔

"کیا میں بھی ویسا ہی کروں جیسا اس نے کیا؟ نہیں پاپا! ہرگز نہیں اور پلیز آپ مجھے مجبور مت کریں، میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔" اور پھر اس کی ماں نے بھی بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔

یہ خبر صبا تک بھی پہنچ گئی جو آج کل پاکستان آئی ہوئی تھی۔ سب گھر والے راضی تھے۔ فروا سے کسی نے پوچھنے کی ضرورت تک نہیں سمجھی تھی، لیکن ہانیہ یہ سب برداشت نہیں کر سکی اور فروا کے پاس پہنچ گئی۔

"آپ کس مٹی سے بنی ہیں آپی! آپ کہتی کیوں نہیں؟ کسی کی سزا آپ کو کیوں ملے؟"

"چپ کر جاؤ ہانیہ! آگے ایک لفظ بھی مت کہنا۔"

اس کا ڈائری پر چلتا ہوا ہاتھ لفظ "سزا" پر رک گیا تھا۔

"کیوں۔۔۔ کیوں نہ کہوں؟ آپ کو کیا سمجھ رکھا ہے سب نے؟ آپ میں اتنی ہمت نہیں ہے تو میں کہہ دیتی ہوں۔"

"کہا نا ہانیہ! چپ کر جاؤ اور دعا کرو، جیسا سب چاہتے ہیں ویسا ہی ہو جائے۔" فروا نے مسکرا کر کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہے آپی!" ہانیہ حیران رہ گئی۔

فروا مسکرا کر دوبارہ مصروف ہو گئی۔ ہانیہ صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آبیٹھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی مسکراہٹ نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا وہ جس طرح چیختے، چلاتے ہوئے آئی تھی، اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

صبا پاکستان آئی ہوئی تھی۔ ایاز اور صبا سب سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سب نے اصرار کر کے صبا کو رات تک روک لیا تھا۔ ایاز کو کام تھا، جس کی وجہ سے وہ نہیں رکا۔ ایاز کے جاتے ہی سب صبا کے سر ہو گئے کہ وہ ہادی کو شادی کا کہے، وہ اس کی بات نہیں ٹالے گا۔ سب کے بار بار کہنے پر صبا کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

وہ جو اپنے لندن کے قصے سنانے کو بے تاب تھی، سب بھول گئی اور ہادی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

آج اتوار تھا۔ ہادی بھی گھر پر ہی تھا۔ وہ کچھ دیر ایاز کے پاس بیٹھ کر اٹھ آیا تھا اور اب کمپیوٹر پر ٹائپنگ کرنے میں مصروف تھا۔ صبا دستک دے کر اندر آگئی۔

"کیسے ہو ہادی؟" وہ ہادی کے پاس ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ارے صبا تم۔۔۔!" کی بورڈ پر چلتی ہوئی انگلیاں ایک پل کے لیے رکیں اور پھر اسی رفتار سے چلنے لگیں۔

صبا خاموشی سے ہادی کو دیکھتے ہوئے دماغ میں الفاظ

ترتیب دینے لگی۔ اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

"ایک بات مانو گے ہادی؟" صبا نے بالاخر بات شروع کی۔

"بولو!" ہادی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"پہلے وعدہ کرو؟" اس کے اجازت دینے پر اس نے شرط بھی رکھ دی۔

"وعدے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی تمہاری کوئی بات نہیں ٹالی۔" ہادی نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔

"ہادی! تم فروا سے شادی کرلو۔" صبا نے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

"صبا! یہ تم کہہ رہی ہو؟" ہادی نے بے یقینی سے صبا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دراصل میں ہادی! فروا بہت شرمندہ ہے اور وہ تم سے معافی مانگنا چاہتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں۔" صبا نے جلدی جلدی جواب دیا۔

"لیکن صبا! میرے لیے یہ بہت مشکل ہے۔" ہادی نے اس کی طرف بے بسی سے دیکھا۔

"لیکن ناممکن تو نہیں ہے۔ پھر تم جانتے ہو کہ سب گھر والے بھی یہی چاہتے ہیں۔ فروا اچھی لڑکی ہے۔" صبا نے کہا۔ ہادی نے صبا کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں بچھڑ جانے کا کوئی ملال نہیں تھا۔ اس کے اندر دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"تم بھی تو اچھی لڑکی تھیں' پھر مجھ سے محبت بھی کرتی تھیں۔ جب تم نہیں تو پھر خاندان کی کوئی اور لڑکی کیوں۔۔۔؟" وہ یہ سب صرف سوچ سکا کہ کہنے سے کچھ واپس نہیں آسکتا۔

"میں آج کے بعد تم سے کچھ نہیں کہوں گی لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اچھی زندگی گزارو۔ صرف یہی بات مان لو۔ پلیز! شادی کرلو۔" صبا نے ہادی کو اپنی طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا تو جلدی میں جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی۔

"ٹھیک ہے! تم جاؤ۔" اب ہادی نے سخت لہجے میں کہا تو صبا فوراً اٹھ گئی اور جاتے جاتے ایک بار پھر فروا کا نام یاد دلانا نہ بھولی۔

☼ ☼ ☼

پھر سب نے ہادی کا اقرار سنا۔ صبا کو واپس جانا تھا۔ اس لیے پندرہ دن کے بعد ہی سادگی سے شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

کوئی اور خوش تھا یا نہیں لیکن فروا بہت خوش تھی۔ ابٹن' مہندی' سب بہت سادگی سے ہوا۔

مختلف رسموں کے بعد فروا کو ہادی کے کمرے تک پہنچا دیا گیا۔ میرون لہنگے میں فروا پر روپ آیا تھا تو ہادی بھی بلیک تھری پیس میں بہت جچ رہا تھا۔

اس کے جاتے ہی فروا نے سادہ کپڑے اٹھائے اور باتھ روم میں گھس گئی۔ وہ ہادی کے آنے سے پہلے پہلے شکرانے کے نفل پڑھنا چاہتی تھی۔

فروا شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے بعد کچھ دیر تک ہادی کا انتظار کرتی رہی۔ اسے خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ جب خاصی دیر ہوگئی تو اس نے تکیہ اٹھایا اور صوفے کی جانب بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

جس خاموشی سے شادی ہوئی تھی' ولیمہ بھی اسی خاموشی سے گزر گیا اور زندگی دوبارہ اپنی ڈگر پر چل پڑی۔ ہادی کو اب اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے نوکرانی کو آواز نہیں لگانی پڑتی تھی۔ کہتا تو وہ فروا کو بھی نہیں تھا' لیکن وہ خود ہی ہر چیز تیار رکھتی تھی۔ وہ فروا کو اس کا مقام نہیں دے پا رہا تھا۔ سوچوں کو کم کرنے کے لیے زیادہ وقت باہر گزارتا۔ فروا خود کوئی شکایت نہیں کرتی تھی اور کوشش کرتی کہ اسے بھی شکایت کا موقع نہ دے۔

ہادی پہلے دن کی طرح ہی ڈریسنگ روم میں سوتا تھا۔ البتہ فروا نے بیڈ پر سونا شروع کردیا تھا۔ فروا خود ہی سامنے کم آتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہادی اسے دیکھتے ہی ڈپریشن کا شکار ہوجاتا ہے اور وہ اسے کسی قسم کی

تکلیف سے دوچار کرنا نہیں چاہتی تھی۔

صبا کی تین دن کے بعد فلائٹ تھی۔ وہ آج ملنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔

اس وقت ہانیہ' فروا اور صبا لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ صبا کو آج لندن کے قصے سنانے کا موقع مل گیا تھا اور وہ خوب بڑھا چڑھا کر سنا رہی تھی۔

"فروا! تم لوگ ہنی مون کے لیے کب جا رہے ہو؟ مجھے تو ایاز نے پورا لندن ہی دکھا دیا ہے۔ تم لوگ بھی لندن ہی آنا ہنی مون کے لیے۔" صبا نے بالوں کو کیچر میں باندھتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ ہنی مون کے لیے نہیں جائیں گے۔" فروا نے کہا۔

"کیوں۔۔۔ کیوں نہیں جاؤ گے؟" صبا نے حیرانی سے دیکھ کر کہا۔

"بس ویسے ہی نہیں جائیں گے۔" فروا فضول خرچی کا کہتے کہتے رک گئی۔

"اوہ! اچھا تم بھی نا' فروا! بات گھما کر کرنے سے باز نہیں آتیں۔ سیدھی طرح کہو کہ ہادی کے پاؤں کا مسئلہ ہے۔۔۔ بے چارہ۔" صبا قہقہہ لگا کر ہنسی اور اندر داخل ہوتے ہادی کے قدم وہیں جم گئے۔

"صبا! تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ہادی کو ایسا کچھ کہو۔" فروا نے غصے سے کہا۔

"تو چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔" صبا نے ناک سکوڑ کر کہا۔

"آپی! آپ کو شرم آنی چاہیے۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا اور آپ ہی مذاق اڑا رہی ہیں۔" ہانیہ سے رہا نہ گیا تو بول پڑی۔

"تم ابھی تک اس کی چمچی ہو؟ اسے تو اچھا بننے کا شوق ہے' تم بھی اسی کی طرح کسی اندھے' لنگڑے کا انتخاب نہ کرلینا۔" صبا نے فوراً کہا۔

فروا خاموشی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ صبا سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جتنا سمجھانے کی کوشش کرتی بات کو اتنا ہی بڑھاتی۔

"میں کسی اندھے کا انتخاب کروں یا لنگڑے کا لیکن آپ کی طرح کبھی سیلفش نہیں بن سکتی۔" ہانیہ سے دکھ کی وجہ سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"تم نے کیا میری خود غرضی دیکھی ہے؟ اپنا کون برا سوچتا ہے؟ میں نے تو پھر فروا کی محبت کی قدر کی ہے۔ اس کی خاطر ہادی کو منایا ہے ورنہ وہ تو شادی ہی کرنا نہیں چاہتا تھا۔" صبا نے کہا۔

ہادی کے لیے اب ضبط کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ وہ خاموشی سے واپس مڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

ہادی کو لان میں بیٹھے نجانے کتنا وقت گزر گیا تھا اور کتنا مزید گزر جاتا اگر فروا وہاں نہ آجاتی۔

وہ روزانہ ہادی کا انتظار کرتی' پھر کھانے وغیرہ کا پوچھتی اور چھوٹی چھوٹی چیزیں اٹھا کر جگہ پر رکھتی تھی۔ جب تک ہادی ڈریسنگ روم میں نہ چلا جاتا۔ وہ یونہی اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی۔ اکثر اسے ہادی پر بہت ترس آتا۔ اس کی وجہ سے اسے ڈریسنگ روم میں سونا پڑتا تھا لیکن وہ کوشش کے باوجود بیڈ پر سونے کے لیے کہہ نہ پاتی۔

آج بھی جب ہادی کمرے میں آیا ہی نہیں تو اسے فکر ہونے لگی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد لاؤنج میں نکل آئی لیکن جب وہاں بھی نہ پایا تو لان میں آگئی اور اب ہادی کو اتنی سردی میں لان میں کرسی پر بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کچھ دیر تک کھڑی دیکھتی رہی' پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہادی کی طرف بڑھ گئی۔

"ہادی۔۔۔!" فروا نے دھیمی آواز میں پکارا۔ لیکن جب کچھ دیر تک ہادی نے کوئی جواب نہ دیا تو ایک دم پریشان ہوگئی اور فوراً آگے بڑھی۔

"ہادی۔۔۔ ہادی! کیا ہوا ہے آپ کو؟" فروا نے ہادی کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

چاند کی روشنی میں گالوں پر شبنم کی طرح پھیلے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر وہ ایک پل میں سب کچھ سمجھ گئی۔ اسی دن کے ڈر سے وہ خود بتانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ محبت کا دکھ جانتی تھی۔

وہ وہیں بیٹھ گئی اور ایک بار پھر ہادی کو پکارا۔ ہادی نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں اور اپنے پاس بیٹھی فروا کو دیکھا تو خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور روتے ہوئے فروا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"مجھے معاف کردو فری! میں نے تمہیں بہت دکھ دیا۔ ایک بار بھی حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی اور تم نے بھی نہیں بتایا۔" وہ معافی مانگتے مانگتے شکوے پر اتر آیا۔

فروا نے ہادی کے ہاتھ تھام لیے۔

"یہ ہاتھ معافی مانگنے کے لیے نہیں بنائے گئے ہادی! میں جانتی ہوں۔ آپ غلط فہمی کا شکار ہوگئے تھے۔ جن سے محبت ہوتی ہے' ان کی بات کبھی جھوٹی نہیں لگتی۔ اگر میں بتاتی تو آپ کو کبھی یقین نہیں آنا تھا۔" اس نے ہادی کے گالوں پر لڑھکتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا۔

"اندر چلیں۔ باہر بہت سردی ہے۔ جو کچھ ہوا' اسے بھلا دیں۔ یاد کرنے سے صرف تکلیف ہوتی ہے۔" فروا ہادی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

آنکھوں سے نفرت کی پٹی اتری تو اسے سب کچھ بہت اچھا لگنے لگا۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا تھا کہ اسے فروا جیسی محبت کرنے والی بیوی ملی۔ خدا کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ صبا جیسی خود پرست' انا کی ماری ہوئی لڑکی کے ساتھ ہادی جیسے نفیس بندے کی زندگی بہت گراں گزرتی۔ ہادی سب کو بتانا چاہتا تھا لیکن فروا نے منع کردیا۔

صبا واپس لندن چلی گئی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ سب بہت مطمئن تھے کہ ایک بار پھر بھونچال آگیا۔ صبا کو لندن گئے ہوئے سات ماہ ہوئے تھے کہ ڈاکٹر ایاز کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ صبا کا بیٹا تین مہینے کا تھا۔ ایاز کی جان بچ گئی تھی' لیکن ہمیشہ کے لیے معذور ہوگیا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد وہ پاکستان شفٹ ہوگئے۔

صبا بہت جلد ایاز کی معذوری سے تنگ آگئی' لیکن اب اس کا بیٹا حسام اس کے رستے کی دیوار بن گیا۔ اس کی حالت اب ایسی تھی کہ نہ اگل سکتی نہ نگل سکتی۔ اسے اب پچھتاووں نے گھیرنا شروع کردیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ پچھتاوے بڑھتے ہی جارہے تھے اسے ایسے لگتا کہ فروا کی بددعا لگ گئی ہے۔

"میں فروا کے ساتھ کتنی زیادتی کرتی تھی اس کی محبت کو چھینا اس کی ہر چھوٹی موٹی خوشیوں کو چھینا اور کبھی احساس تک نہیں ہوا۔ یہ سب اسی وجہ سے ہوا ہے۔

جب انسان اپنی حدوں سے نکل جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی رسی کو کھینچ لیتا ہے۔ ایسے میں اس کے پاس پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ وہ معافی مانگنا چاہتی تھی۔ فروا سے' ہادی سے' سب سے..... لیکن خود میں اتنی ہمت نہیں پارہی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اسے اپنے کیے کی سزا اب تمام عمر بھگتنی تھی۔ بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتی۔ ہادی سے تو جان چھڑوالی تھی' لیکن ایاز سے جان بھی نہیں چھڑوا سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"صبا کتنے دن رہے گی یہاں؟" ہادی نے فروا سے پوچھا جو اس کی چیزیں اٹھا کر رکھ رہی تھی۔

"شاید دو دن۔ آپ ملے ہیں اس سے؟" فروا نے جواب کے ساتھ ہی سوال کر ڈالا۔

"ہاں! بہت چپ چپ تھی۔ بس سلام کیا اور دوبارہ حسام کے ساتھ مصروف ہوگئی۔" ہادی نے کہا۔

"مجھے دیکھ کر بہت دکھ ہوا ہے' میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ نہ ہی کبھی بددعا دی تھی' میں تو بس ہمیشہ دعا مانگتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے۔" فروا نے ہادی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ لوگ ٹھوکر کے بغیر نہیں سنبھلتے فری! یہ دنیا تو مکافات عمل کا نام ہے۔ جو جیسا بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے۔ چھوڑو! ہم کن باتوں میں الجھ گئے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے گھر میں سکون دے۔ آمین۔" ہادی نے کہا

اور ساتھ ہی ڈریسنگ روم کی طرف چل پڑا۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ سب لوگ ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھے۔ چھٹی کے دن ہی سب اکھٹے ناشتا کرتے اور ڈھیر ساری باتیں کرتے تھے' لیکن آج سب خاموش تھے۔ سب کو صبا کا بہت دکھ تھا۔ صبا کھانا کھانے کی بجائے سلائس ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ اپنے ذہن میں مناسب الفاظ ترتیب دے رہی تھی۔

"وہ..... میں آپ سب سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔" صبا نے سلائس پلیٹ میں رکھ دیا تھا اور اب ہاتھ مروڑ رہی تھی۔ سب نے حیران ہو کر سر اٹھایا ماسوائے ہادی اور فروا کے۔ ہادی تو کل ہی جان گیا تھا کہ وہ معافی مانگنے آئی ہے۔

"کس بات کی معافی بیٹا!" سجاد نے پوچھا تو وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور ساتھ ہی ساری بات کہہ ڈالی۔ سب کے ہاتھوں سے کانٹے' چمچے ٹیبل پر گر گئے۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو صبا!" جواد نے اونچی آواز میں کہا۔

"پاپا! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔" وہ فوراً" اٹھ کر فروا کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ "مجھے معاف کردو فروا! میں نے ہمیشہ تمہارے راستے میں کانٹے بوئے۔ تم پر الزام لگایا۔ لیکن تم نے کبھی پلٹ کر کچھ نہیں کہا۔ پلیز فروہ! مجھے معاف کردو۔" صبا نے روتے ہوئے فروا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"یہ تم کیا کررہی ہو صبا! پاگل ہوگئی ہو کیا؟" فروا نے کرسی دھکیل کر صبا کو کندھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

سب کرسیاں چھوڑ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ صبا اب ہادی کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی' لیکن ہادی خاموشی سے اندر کی جانب بڑھ گیا اور اس کے پیچھے ایک' ایک کرکے سب چلے گئے۔

اسے کسی نے معاف کیا تھا یا نہیں' وہ نہیں جانتی تھی لیکن اب وہ پہلے کی طرح بے سکون نہیں تھی۔

ایاز نے اسے فون کیا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ لینے آرہا تھا۔ صبا ایک بار پھر ہادی سے معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن فروا نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ وہ اسے پہلے ہی معاف کرچکا ہے۔

"تو ہادی پہلے ہی سب کچھ جان گیا تھا۔ کتنا ظرف ہے ہادی کا۔ ایک بار بھی گلہ نہیں کیا۔"

گاڑی کا مخصوص ہارن سن کر وہ فوراً" اندر کی جانب بڑھی۔

ڈرائیور نے جلدی سے وہیل چیئر نکالی اور ایاز کو سہارا دے کر اوپر بٹھایا ایاز ایکسیڈنٹ کے بعد پہلی بار آیا تھا۔ سب بڑے کمرے میں جمع ہوگئے۔ ڈرائیور وہیل چیئر کو گھماتے ہوئے اندر لے آیا۔ کچھ دیر بعد صبا تیار ہوکر حسام کو اٹھائے وہیں آگئی۔

"چلو صبا! امی انتظار کررہی ہوں گی۔" ایاز نے کھانا کھاتے ہی کہا تو صبا بھی اٹھ گئی۔ سب انہیں چھوڑنے گاڑی تک آئے۔ آج شادی کے بعد پہلی بار سب جمع تھے۔ ایاز سے ملنے کے بعد سب صبا سے مل رہے تھے۔

صبا سے شرمندگی کے باعث نظریں اٹھائی نہیں جارہی تھی۔ ہانیہ اپنی بہن کا یہ روپ دیکھ کر بہت خوش تھی۔ صبا سے ملنے کے بعد مبارک باد دیتے ہوئے فروا کے گلے لگ گئی۔ سب نے صبا کو معاف کردیا۔ صبا کو رخصت کرنے کے بعد سب اپنے کمروں میں چلے گئے سوائے ہادی اور فروا کے۔

ہادی پاس ہی کیاریوں میں لگے ہوئے گلاب کے پھول توڑ کر فروا کی طرف بڑھ گیا جو ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔

"میری محبت کی پہلی نشانی۔" ہادی نے ہاتھ میں پکڑا پھول اس کی طرف بڑھا دیا۔

فروا نے مسکراتے ہوئے پھول لے لیا۔

"محبت سچی ہو اور پانے کی لگن ہو تو اللہ تعالیٰ کبھی اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔"

ٹیرس پر کھڑی مسکراتے ہوئے نیچے دیکھتی ہانیہ نے سوچا۔

☼

راحت جبین

ساری بھول ہماری تھی

عریشہ عادلہ کی بیٹی ہے۔ عادلہ بیوہ ہیں اور اسکول میں ملازمت کرتی ہیں' مکان کے دوسرے حصے میں ان کے جیٹھ اور جٹھانی اپنے بچوں نعمان' ثوبان' فرید' فاطمہ اور مریم کے ساتھ رہتے ہیں' بانو اور ساجدہ شادی شدہ بیٹیاں ہیں' عریشہ ثوبان کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے۔ ثوبان کو علم ہے مگر ابھی اس کی طرف سے اعتراف نہیں ہے۔ عادلہ کو یہ چیز پسند نہیں کیونکہ ان کے جیٹھ کا گھرانہ جاہل ہے۔

نبیلہ' عادلہ اور حمیداں کی نند ہیں' ان کے دو بیٹے ہیں محسن اور جمال' جمال ملک سے باہر مگر اس کی بد مزاج بیوی طیبہ یہیں رہتی ہے۔

ابرار جمیلہ کا بیٹا ہے شہر میں پڑھتا ہے' باپ کی وفات کے بعد چچا کے ساتھ رہتا ہے۔ چاچی کبری کا سلوک اس کے اور اس کی ماں کے ساتھ ناروا ہے۔ اپنے شوہر اصغر سے اکثر ڈانٹ پڑواتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کی بیٹی بشری کی ابرار سے شادی ہو جائے مگر ابرار صاف انکار کر دیتا ہے۔ اصغر کو غصہ آتا ہے وہ ابرار پر ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ ابرار ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیتا ہے اور شہر آکر حمیداں کے گھر رہنے لگتا ہے۔ برکت حسین اس کی ماں کے چچا زاد بھائی ہیں۔ حمیداں' ابرار سے سخت بیزار رہنے لگتی ہیں۔

ناولٹ



نعمان اپنے اسٹور سے سودا لینے والے ماسٹر صاحب کی بیٹی عائشہ کو پسند کرتا ہے۔ وہ گورنمنٹ ٹیچر ہے۔ نعمان عائشہ کی ماں سے رشتے کی بات کرتا ہے اور ان سے فاطمہ کی شادی تک انتظار کرنے کو کہتا ہے کیونکہ حمیداں کا دونوں بیٹیوں سے پہلے بیٹوں کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ عائشہ اور اس کے گھر والے تھوڑی سی حیل حجت کے بعد مان جاتے ہیں۔

عادلہ نبیلہ کے کہنے پر بچت کر کے عریشہ کے لیے سونے کا سیٹ بنواتی ہیں۔ عادلہ کے منع کرنے کے باوجود عریشہ حمیداں کو وہ سیٹ دکھا دیتی ہے۔ حمیداں کی عریشہ سے لگاوٹ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

فاطمہ کی شادی پر حمیداں' عادلہ سے وہ سیٹ مانگتی ہیں۔ عادلہ پریشان ہو جاتی ہیں کیونکہ انہوں نے وہ سیٹ عریشہ کے لیے بہت مشقت سے بنایا ہوتا ہے۔ حمیداں بضد ہوتی ہیں کہ فاطمہ کو شادی پر سونے کا سیٹ دیا جائے جبکہ ان کی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ ثوبان کی فیس کے پیسے نکال لیتی ہیں۔ ثوبان بہت بگڑتا ہے۔ عریشہ ثوبان کی پریشانی دیکھ کر چپکے سے وہ سیٹ نکال کر حمیداں کو دے دیتی ہے۔

شادی والے دن نبیلہ' فاطمہ کے گلے میں وہی سیٹ دیکھتی ہیں تو عادلہ سے کہتی ہیں۔ عادلہ' عریشہ سے پوچھتی ہیں تو بجائے شرمندہ ہونے کے دھڑلے سے اعتراف کرتی ہے کہ اس سے ثوبان کی پریشانی نہیں دیکھی گئی۔ عادلہ' عریشہ کی حرکت سے اتنی دل برداشتہ ہوتی ہیں کہ ان کا دل بند ہو جاتا ہے۔ عریشہ پچھتاتی ہے۔ ثوبان لگاوٹ سے اسے بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔

ابرار کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ عریشہ ثوبان کو پسند کرتی ہے' ساتھ ہی وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ ثوبان اپنے فائدے کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی خود غرضی جان کر ابرار اس سے سخت کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے۔

حمیداں کو نعمان کی خواہش کا علم ہو جاتا ہے اور جب عائشہ کی والدہ عادلہ کی تعزیت کرنے حمیداں کے پاس آتی ہیں تو وہ ان سے خوش اخلاقی سے نہیں ملتیں۔

"آج کل ماں باپ نے لڑکوں کو پھانسنے کے لیے اپنی لڑکیوں کو آگے کر رکھا ہے اور لڑکیاں خود ہی معاملہ سیٹ کر لیتی ہیں۔" جیسے سخت الفاظ کہہ کر ان کی بے عزتی کر دیتی ہیں۔

عائشہ کی والدہ دلبرداشتہ ہو کر ان کے گھر سے چلی جاتی ہیں بلکہ وہ عائشہ کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چند دنوں کے لیے دوسرے شہر چلی جاتی ہیں۔ نعمان اس تمام عرصہ میں سخت پریشان رہتا ہے۔ ان کی واپسی پر ان کے گھر جاتا ہے تو وہ بتاتی ہیں کہ انہوں نے عائشہ کا کہیں اور نکاح کر دیا ہے۔ وہ مغموم سا واپس آ جاتا ہے۔

نبیلہ' عریشہ کا سیٹ لے لینے پر فاطمہ سے برگشتہ ہوتی ہیں تاہم فاطمہ کے وہ سیٹ لوٹا دینے کا وعدہ کرنے پر وہ راضی ہو جاتی ہیں۔

ابرار' باسط کو ٹیوشن پڑھانے جاتا ہے۔ وہاں باسط کی بڑی بہن سنعیہ کے ساتھ ثوبان کی بے تکلفی دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتا ہے۔

ابرار' عریشہ کو ثوبان کے ساتھ چھت پر تنہا دیکھ کر اسے متنبہ کرتا ہے کہ دو نامحرم کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔

گاؤں میں کوئی جمیلاں کی بھینس کو زہر دے کر مار دیتا ہے۔ عریشہ اور مریم نے بی ایڈ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں مریم کا کوئی افیئر شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے عریشہ بے خبر ہوتی ہے۔

سنعیہ' ثوبان کو شادی کی آفر کرتی ہے' مگر ثوبان انکار کر دیتا ہے تو سنعیہ بالکل پروا نہیں کرتی۔ ثوبان' نعمان سے باہر جانے کے لیے پیسے مانگتا ہے۔ اس کے انکار پر دونوں میں تلخ کلامی ہو جاتی ہے۔ نعمان حمیداں سے کہتا ہے کہ وہ عریشہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حمیداں مان جاتی ہیں۔ نعمان کے انداز بدل جاتے ہیں۔ عریشہ گھبرانے لگتی ہے۔

حمیداں' مریم کی زبردستی منگنی کر دیتی ہیں۔ وہ پھر بھی فہد سے رابطے میں رہتی ہے۔ نبیلہ کے پاس جاتی ہے۔ نبیلہ اسے سمجھاتی ہیں' مگر وہ نہیں مانتی۔ کاغذات لے کر وہ گھر آتی ہے تو حمیداں' ثوبان اور نعمان کی باتیں سن لیتی ہے۔ جس میں وہ اس کے مکان اور دکان کو ہتھیانے کا منصوبہ بنا رہے ہوتے ہیں۔ وہ غصے میں ثوبان کا گریبان پکڑ لیتی ہے۔ ابرار اسے نبیلہ کے پاس لے جاتا ہے۔

بشریٰ اپنے سسرال میں خوش نہیں رہتی۔ نعمان' فہد اور مریم کو ایک ساتھ دیکھ لیتا ہے۔ اور گھر آ کر خوب ہنگامہ کرتا ہے۔ مریم کو مارتا ہے اور جلد نکاح کرنے کا کہتا ہے۔

عریشہ' نبیلہ سے کہتی ہے کہ حمیداں سے مکان خالی کروا دیں۔ عریشہ مکان کی چابیاں لینے حمیداں کے گھر جاتی ہے۔ وہاں حمیداں اور نعمان اس سے زبردستی نکاح نامہ پر سائن کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ساتویں قسط

"کیسے کاغذات...؟" عریشہ نے حیرت سے کاغذ دیکھا۔

"نکاح نامہ ہے۔" نعمان ہنسا۔

"کیا بکواس ہے..." وہ ڈر گئی۔ "جائیں یہاں سے ورنہ میں شور مچا دوں گی اور تائی! آپ' آپ کو شرم نہیں آئی...؟ آپ کے اپنے گھر میں بھی بیٹی ہے اور..."

"ایویں بکواس کر رہا ہے' تو ہٹ پیچھے..." تائی نے دھپ لگا کر نعمان کو پیچھے کیا۔

"دیکھ عرشی! میں تیری ماں کی جگہ ہوں... ہمیشہ عادلہ سے بڑھ کر تجھے چاہا..." حمیدہ نے چاپلوسانہ انداز میں کہنا شروع کیا' مگر عریشہ نے تلخی سے بات کاٹ دی۔

"ہاں! اپنے مقصد اور فائدے کے لیے۔"

"چلو! یوں ہی سہی... اب تو اتنا بڑا مکان اور دکانیں رکھ کر کیا کرے گی؟ تیرے کون سے اتنے خرچے ہیں۔ سائن کر دے... مریم کی شادی بھی کرنی ہے اور..."

"میں نے آپ کے سارے کام سنوارنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟" عریشہ بپھر گئی۔ "کبھی فاطمہ کی شادی ہے' کبھی مریم کی۔ آپ جیسے لالچی اور خود غرض لوگ میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ میں اور میری ماں آپ کو بہت کچھ دے چکے... اب میرے پاس کچھ نہیں... آپ لوگ چلے جائیں... ورنہ میں چیخ چیخ کر سارا محلہ اکٹھا کر لوں گی۔"

"عرشی! میری بات..." حمیدہ نے کچھ کہنا چاہا' مگر نعمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اماں! تم جاؤ... میں اس سے خود بات کرتا ہوں۔"

نعمان کی آواز و نگاہوں نے عریشہ کے وجود میں پھریری سی دوڑا دی۔

اسے یقین تھا تائی نہیں جائیں گی... مگر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جب اس نے تائی کو ڈیوڑھی کے دروازے کو پار کرتے اور پھر دروازہ بند کرتے دیکھا۔

وہ ان کے پیچھے لپک کر جانے کو تھی' جب نعمان نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے دھکیلا۔ عریشہ کے لبوں سے تیز چیخ نکلی... مگر نعمان کے ہاتھ نے اس کی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ پوری طرح اس کے شکنجے میں تھی اور وہ اسے کھینچ کر کمرے میں لے جانا چاہتا تھا شاید وہ ڈرتا تھا کہ کہیں ہمسائے اس کی چیخ و پکار نہ سن لیں... مگر عریشہ کی مزاحمت شدید تھی۔

"الو کی پٹھی..." نعمان نے ہاتھ ہٹا کر پوری قوت سے اس کے چہرے پہ تھپڑ مارا... عریشہ کا ہونٹ پھٹ گیا۔ وہ پورے قد سے گر گئی... نعمان کے ہاتھ سے کاغذ بھی چھوٹ گیا۔ عریشہ نے جنونی انداز میں اس کاغذ کو پرزے پرزے کر ڈالا۔

نعمان گویا غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔ عریشہ کو تابڑ توڑ مکوں اور لاتوں کی زد پر رکھ لیا۔

اس کی چیخوں نے آسمان ہلا ڈالا۔

"نہیں دوں گی... مار دو گے تب بھی' نہیں دوں گی... یہ میری جائیداد ہے... میرے باپ کی ہے۔"

نجانے اس میں اتنی بے خوفی کہاں سے آئی کہ وہ پورے مقابلے پر اتر آئی تھی اور یہی چیز نعمان کو پاگل بنانے لگی۔ ظلم و تشدد کا دورانیہ نجانے کتنا طویل ہوتا کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر ابرار اندر آگیا۔ عریشہ اور نعمان کی آواز دیوار پار بھی سنائی دی تھی تب ہی وہ بغیر سوچے سمجھے پرائی آگ میں کود پڑا تھا۔

"تو ہوتا کون ہے ہمارے گھر کے معاملے میں بولنے والا؟" نعمان اس پر پل پڑا۔

"گھر کا معاملہ تھا تو آوازیں باہر کیوں گئیں؟ شکر کریں کہ میں آیا ہوں، ساتھ میں پولیس کو نہیں لایا۔"

"تیری یہ اوقات کہ مجھے پولیس کی دھمکی دے دی؟"

"اوقات تو آپ نے دکھائی ہے..... جائیداد کے لیے مرحوم چچا کی بیٹی پر ظلم کرتے ہو....."

نیچے گری عریشہ نے سر اٹھا کر مددگار فرشتے کو دیکھنا چاہا مگر آنکھیں دھندلا گئیں۔

اب وہ دونوں دست و گریبان تھے۔

ابرار نے بڑے زور سے نعمان کو دھکا دیا۔ وہ جا کر دیوار سے ٹکرایا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو.....؟" وہ پلٹ کر عریشہ کو اٹھانے لگا..... ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق عریشہ نے اس کا بازو دبوچ لیا۔

اور وہی لمحہ تھا جب بیرونی دروازہ ٹھاہ کی آواز کے ساتھ کھلا اور محلے کے چند لوگ اندر گھستے چلے آئے .....

حمیدہ ان میں سب سے آگے تھیں۔

"لو..... دیکھ لو..... اپنی آنکھوں سے اس کے کرتوت..... یہاں یہ گل کھلائے جارہے ہیں۔ نعمان کی جگہ کوئی اور غیرت مند ہوتا تو بھی یہی کچھ کرتا۔"

چند لمحے لگے حمیدہ کی بات کو سمجھنے میں۔

ابرار کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور عریشہ بے جان گڑیا کی طرح زمین بوس ہو گئی۔

"دونوں کو زمین میں زندہ گاڑ دوں گا..... میں بے غیرت نہیں ہوں..... مرحوم چچا کی عزت کو مٹی میں ملاتے ذرا حیا نہ آئی۔"

"ہائے..... ہائے! ماں باپ سر پر نہ ہوں تو لڑکیاں یوں عزت نیلام کرنے لگتی ہیں۔" حمیدہ سینہ کوبی کر رہی تھیں۔

عریشہ نے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولا اور ایک نفرت بھری نگاہ نعمان اور حمیدہ پر ڈالی۔ ہر گزرا دن ان لوگوں کا اک نیا روپ سامنے لا رہا تھا۔

عریشہ نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

"دیکھا..... دیکھا اس کی اکڑ....." نعمان کی ٹھوکر نے عریشہ کا جبڑا ہلا دیا۔

بے ہوشی کے آخری لمحوں میں اس نے سب کے عقب میں جھانکتے اس چہرے کو بھی دیکھا، جسے اس نے زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا۔

اس چہرے پر بھی عریشہ کے لیے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

اگلے پل عریشہ نے خود کو طویل اندھیروں کے سپرد کر دیا تھا۔

"میں نے کہا بھی تھا..... ہاتھ ہولا رکھنا۔ پر تو تو غصے میں جلاد بن گیا تھا۔" حمیدہ نے دوہتڑ نعمان کے مارے تو وہ جھنجلا کر کھڑا ہو گیا۔

"بس کرو اماں..... تم بھی تو ساتھ ہی تھیں۔ بلکہ سارا پلان تمہارا ہی تھا..... خود ہی کہہ رہی تھیں کہ تم سے وہ چھٹانک بھر لڑکی ڈرائی نہیں جاتی۔ میں تو صرف ڈرا دھمکا کر سائن کروانا چاہتا تھا۔ تم نے پکڑ کر اس پر الزام ہی دھر دیا۔"

"لو..... میں نے کب؟" حمیدہ کے ہاتھوں کے توتے برکت حسین کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر اڑ گئے۔

"تو یہ سارا کچھ تیری شہہ پر ہوا ہے۔ بے غیرت عورت! یہ بھی بھول گئی کہ تیرے اپنے گھر میں دو دو بیٹیاں ہیں۔ اب جو عریشہ کے غصے میں نبیلہ نے فاطمہ

کو گھر سے نکال دیا تو؟"

برکت حسین کو حقیقی غصہ آیا تھا..... حمیدہ زندگی میں پہلی بار گھبرائیں۔ حواس باختہ تو نعمان بھی ہو گیا تھا۔ محلے میں الگ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں..... پھر نبیلہ کے رد عمل کا خطرہ بھی تھا۔

"ارے! انہیں نکالتے فاطمہ کو..... کیوں دہلائے دیتے ہو؟"

"بے شرم..... بے غیرت لوگ..... میری بھتیجی پر الزام دھرتے حیا نہ آئی.....؟ یتیم ہوئی تھی پر اس کا تایا تو زندہ تھا..... ایسی نیچ حرکت۔"

"بس کرو برکت حسین..... پہلے تو یتیم بھتیجی کا خیال نہ آیا۔"

"یہ تو ہے ہی شاطر عورت..... اور تو، تو کسی ٹرین کے نیچے آکر مر بھی جائے، مجھے تب بھی افسوس نہ ہو۔" انہوں نے نعمان کو دیکھا۔

"ہائے! اللہ نہ کرے۔" حمیدہ نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

"اپنی اولاد کی دفعہ بہت دکھ ہوتا ہے اور اس لڑکی کو جو جیتے جی مار ڈالا وہ.....؟" وہ ڈھے سے گئے۔

"کچھ نہ کچھ دیکھا تھا، تب ہی کہا تھا۔" حمیدہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

"بس کر حمیدہ! خود پر اور اپنی اولاد پر رحم کر..... اپنا کیا ہی آگے آتا ہے..... عریشہ بھتیجی تھی تو وہ لڑکا بھی میری نظروں کے سامنے ہی رہتا تھا۔"

نعمان جھنجلا کر باہر نکل گیا۔ اسے احساس ہوا، ماں کے پیچھے لگ کر معاملہ بالکل ہی الٹے رخ پر چلا گیا ہے۔

برکت حسین سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ انہیں زندگی میں پہلی بار لگا کہ ان کے گھر میں کچھ غلط ہو رہا ہے، ورنہ وہ تو سب کچھ حمیدہ کے ہاتھ میں دے کر بے فکر بیٹھے تھے۔



ابرار نے ہلکا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو عریشہ کے پاس بیٹھی نبیلہ نے مڑ کر دیکھا، پھر ابرار کو چپ کا اشارہ کیا۔ ابرار دروازہ بند کر کے کوریڈور میں آکھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میں نبیلہ اس کے پاس تھیں۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" ابرار نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ دوا کے زیر اثر سو رہی ہے۔"

"فاطمہ آپی نے کھانا بھجوایا ہے۔"

"ابرار! وہاں کیا ہوا تھا؟"

"پتا نہیں خالہ! میں دیر سے پہنچا۔" وہ نظریں چرا گیا۔

"عریشہ پر ہاتھ کس نے اٹھایا؟" وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔

"مجھے نہیں پتا....." وہ رخ ہی بدل گیا۔

"ابرار! مجھ سے جھوٹ مت بولو..... کھل کر بتاؤ۔" نبیلہ کے لہجے میں سختی سی در آئی۔

"خالہ! عریشہ ہوش میں آئے گی تو خود ہی بتا دے گی..... میں گاڑی سے سامان نکال لوں۔"

"یہ بھی شکر ہے کہ محسن شہر سے باہر ہے..... ورنہ جذباتی ہو کر نجانے کیا کر بیٹھتا۔" وہ بڑبڑائیں۔

ابرار نظر انداز کر کے چلا گیا۔ محسن کی گاڑی اسی کے پاس تھی کچھ دوستوں کی مہربانی سے وہ ڈرائیونگ بھی سیکھ چکا تھا۔

نبیلہ اندر آگئیں..... عریشہ کسمسا رہی تھی۔ وہ لپک کر قریب آئیں اور پیار سے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"عرشی! میری جان! اب کیسی طبیعت ہے؟"

"امی! امی....."

"عرشی! ادھر دیکھو' میں ہوں تمہاری پھوپھو....." وہ اس کے گال تھپتھپانے لگیں۔

"میری امی! پھوپھو..... میری امی مر گئیں..... میں نے انہیں مار ڈالا....." وہ چلانے لگی..... اسے خود بھی یاد نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اسے صرف ماں یاد آرہی تھی۔

اسے یہ یاد آرہا تھا کہ ان لوگوں کے لیے اس نے اپنی ماں کے ساتھ کیا کیا۔

اسے یہ احساس مار رہا تھا کہ ماں نے کس کس طرح اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی..... مگر وہ اپنی نادانی میں سمجھ ہی نہ پائی۔

اسے دکھ حمیدہ کے رویے پر تھا' نہ نعمان کے سلوک پر۔

اسے تو ثوبان کی بے حسی' دھوکے بازی' خود غرضی کسی سے بھی غرض نہ رہی تھی۔

بس اک دکھ' پشیمانی' بہت کچھ ختم ہو جانے اور اپنی جنت کھو دینے کا احساس ہر جذبے پر حاوی تھا۔

نبیلہ نے اسے خود میں سمیٹ لیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی عریشہ کو اس احساس زیاں سے نکال نہیں سکتی تھیں۔

کچھ دنوں میں وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو گئی..... وجود کے زخم بھر گئے۔ مگر روح کے زخم ناسور بنتے جا رہے تھے۔

"عریشہ! دودھ لے لو۔" فاطمہ کی آواز پر کھڑکی سے باہر جھانکتی عریشہ نے چونک کر دیکھا' مگر ہاتھ نہیں بڑھایا۔

فاطمہ نے گلاس میز پر رکھا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

"کل محسن واپس آرہے ہیں۔" فاطمہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

عریشہ! میں جانتی ہوں' گھر والوں نے تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ میں اس سب کے لیے بہت شرمندہ ہوں..... یقین جانو! میں نے سب سے رابطہ ختم کر لیا ہے..... کسی سے نہیں ملتی۔"

عریشہ نے الجھ کر اسے دیکھا..... فاطمہ یہ سب اس سے کیوں کہہ رہی ہے۔ نبیلہ یا عریشہ نے تو اسے اس کے گھر والوں سے ملنے سے منع نہیں کیا تھا۔

"میری اچھی بہن پلیز..... تم محسن سے کچھ مت کہنا' وہ تمہارے معاملے میں بہت تپے ہیں۔ عریشہ! تم سن رہی ہو..... میرا گھر خراب ہو جائے گا۔" فاطمہ روہانسی ہو گئی۔

"نہیں کہوں گی۔" عریشہ نے تین لفظوں میں بات ختم کر دی۔

فاطمہ کچھ اور شرمندہ ہو گئی۔ اس نے بے اختیار عریشہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم بہت اچھی ہو..... پلیز! جو کچھ ہوا....."

عریشہ نے ہاتھ چھڑا لیا..... تب ہی نبیلہ آگئیں۔

"تم نے ابھی تک دودھ نہیں پیا؟"

"وہی تو اصرار کر رہی ہوں' مگر یہ مان ہی نہیں رہی۔" فاطمہ نے گھبرا کر گلاس اٹھایا۔

"عریشہ!" نبیلہ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "اتنی گم صم کیوں بیٹھی ہو..... کچھ بولا کرو۔"

"کیا بولوں؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"جو کچھ ہوا' اسے بھول جاؤ۔"

عریشہ نے حیران کن نظروں سے انہیں دیکھا..... ابھی تو اس کی چوٹوں کے نشان بھی مندمل نہ ہوئے تھے۔

"جو الزام ان لوگوں نے مجھ پر لگایا ہے۔ پھوپھو! نجانے کس کس نے اعتبار کیا ہو گا۔"

"عرشی! لوگ اندھے نہیں ہیں....."

"کسی کی پارسائی پر حرف آئے تو سب پتھر مارنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ سچ جھوٹ کی کھوج کون کرتا ہے۔"

فاطمہ کی نظریں جھک گئیں۔ وہ اپنے گھر والوں سے ہر بات کی توقع رکھتی تھی' سوائے اس ایک کے۔

"کیا کوئی اتنا سفاک اور بے حس ہو سکتا ہے.....؟ میں نے ان کے لیے کیا کچھ نہیں کیا.....؟ اپنی ماں کو جھٹلایا..... وہ میری وجہ سے مر گئیں۔ صرف اس لیے کہ میں نے ان کی نسبت ان لوگوں کو اپنا سمجھا..... میں کیوں نہیں پہچان سکی۔ ہر دن ان کے چہروں سے نیا نقاب نوچ لیتا ہے اور میں ہکا بکا رہ جاتی ہوں..... یہ کیسے خونی رشتے ہیں' جنہوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا..... میرا مان' اعتبار..... میری جنت..... میں کیا کروں' کہاں جاؤں..... میرے ہاتھ خالی ہیں..... میں خالی ہوں..... میرا دل خالی ہے..... میرے پاس کچھ نہیں بچا..... انہیں میری دکانیں اور مکان چاہیے..... سب لے لیں..... سب کچھ لے لیں' بس! میری امی واپس دلا دیں..... میرا اعتبار' میرا بھروسا لوٹا دیں۔"

وہ جنونی انداز میں رونے اور چلانے لگی۔

فاطمہ نے گھبرا کر گلاس رکھا اور روتے ہوئے باہر نکل گئی۔

نبیلہ نے اسے خود میں بھینچ لیا۔ یہاں تک کہ وہ روتے چلاتے نڈھال ہو کر بستر پر گر سی گئی۔

☆ ☆ ☆

ثوبان اپنے کمرے میں دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے گھومتے پنکھے پر نظریں جمائے ہوئے چت لیٹا تھا۔ ذہن میں خیالات کی رفتار پنکھے کی رفتار سے بھی زیادہ تیز تھی۔

سنیعہ ابھی تک امریکا سے نہیں لوٹی تھی۔ اور ہر گزرتا دن اس کے حوصلے پست کر رہا تھا۔ اس تمام عرصے میں اس نے ایک بار بھی عریشہ کے بارے میں نہیں سوچا تھا..... لیکن یہ بھی اس کی خام خیالی ہی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں اس کی بے یقین نگاہیں اب بھی بے سکونی پھیلاتیں..... لیکن وہ دانستہ اس احساس ندامت سے نظریں چرائے صرف سنیعہ اور اس سے وابستہ اپنے روشن مستقبل کے بارے میں سوچا کرتا۔

"شاید مجھ سے غلطی ہوئی' مجھے اسی وقت سنیعہ کے پروپوزل پر ہاں کہہ دینی چاہیے تھی..... آخر اتنی انا دکھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کاش! وقت پلٹ جائے اور میں اس پل کو مٹھی میں جکڑ لوں۔ قسمت کی دیوی کو قید کر لوں یا خود اس کا غلام ہو جاؤں۔"

اس کے عین نیچے والے کمرے میں نعمان بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

"یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے..... اتنا غصہ' اتنی جذباتیت.....؟ اماں کی باتوں میں آکر میں نے بہت ہی غلط قدم اٹھا لیا..... اس طرح تو سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا..... پھوپھو اور محسن اب کبھی یہ دکانیں میرے نام نہیں ہونے دیں گے۔ عریشہ کی شادی ثوبان سے ہو جاتی' تب بھی دکانیں گھر میں ہی رہنی تھیں۔ پھر وہ اس سے محبت بھی تو کرتی تھی....."

"محبت" وہ اس لفظ پر اٹک سا گیا۔

"اسی محبت کے چھن جانے نے مجھے اتنا انتقامی بنا دیا کہ میں....."

وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا..... اسے عائشہ بے حد شدت سے یاد آئی۔

"اگر مجھے عائشہ مل جاتی تو کیا میں تب بھی یہ سب کرتا.....؟"

اس نے اپنے ہی سوال کے اندر سے اٹھتے جواب پر غور کیا۔ اس کے اندر آتش فشاں ابلنے لگا۔

"ہاں! ٹھیک ہے' جب میرا دل ویران ہو چکا..... تو کسی کا کیوں آباد ہو..... یہی سب ہونا چاہیے تھا۔"

وہ اپنے اندر کے غصے پر قابو پاتا گھر سے ہی نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"کب تک اپنے ہوتے سوتے کو روتی رہے گی؟"

حمیدہ تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آئیں۔

مریم نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر انہیں دیکھا۔

"جب تک مجھے اس کمرے میں بند رکھیں گی۔"
"مجھے کوئی شوق نہیں تیرے جیسی اولاد کو گھر میں رکھ کے گند ڈالنے کا۔"
"تو کر دیں رخصت..... جان چھڑالیں اس گند سے۔" وہ بدلحاظی سے گویا ہوئی۔
"وہی کرنے لگی ہوں..... آئی بیٹھی ہے تمہاری ساس..... ابھی شادی کی بات کر کے دفع کرتی ہوں۔"
"اماں....." وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"اب ایک لفظ نہ کہنا' زبان کاٹ دوں گی۔ اب اٹھ کر حلیہ ٹھیک کر اور چائے لے کر آ۔ تیرا باپ وہیں بیٹھا ہے..... زیادہ آنا کانی کی تو نعمان کو بلالوں گی۔" حمیدہ غضب ناک ہوئیں۔
"جس کو مرضی بلالیں۔ میں چائے نہیں بنا رہی۔" مریم ہٹ دھرمی سے بولی۔
"بے غیرت' کمینی!" حمیدہ ہاتھ تان کر اس کی طرف لپکیں۔
"بہن جی.....!" مریم کے عین سر پر جا کر انہیں ساکت ہونا پڑا..... پھر کھسیانی سی ہنسی ہنستے مڑیں۔
"وہ میں....."
"ہاتھ نیچے کر لیجیے۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔
حمیدہ نے کھسیا کر ہاتھ نیچے کیا۔
"دراصل' اس کی طبیعت....."
"جانتی ہوں اور یہ بھی پتا ہے' کیوں خراب ہے۔" ان کے لہجے میں طنز ہی طنز تھا۔ مریم نے بھی الجھ کر انہیں دیکھا۔
"آپ بیٹھیں....."
"میں بیٹھنے نہیں..... صرف اتنا کہنے آئی ہوں کہ اپنے گھر کا گند اپنے گھر میں ہی سنبھال کر رکھیں۔"
"جی....." حمیدہ ہکا بکا رہ گئی۔
"میرے اپنے گھر میں بیٹیاں ہیں اور ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے اور اس قسم کی لڑکیاں پورے خاندان کو بدنام کرتی ہیں۔" انہوں نے ہاتھ سے مریم کی طرف اشارہ کیا۔
"آپ کیا بولے جا رہی ہیں؟ میرے ہی گھر میں کھڑی ہو کر میری بیٹی پر الزام لگا رہی ہیں؟" ہوش میں آ کر غصے سے بولیں۔
"میں نہیں لگا رہی۔ اس کے عاشق کا فون آیا اگر لڑکی راضی نہیں۔ تو کیوں زبردستی لے جا رہی ہوں۔ اس نے صاف کہا ہے کہ یہ لڑکی اس سے محبت کرتی ہے۔ زبردستی ہوئی تو گھر سے بھاگ جائے گی۔"
حمیدہ دل پر ہاتھ رکھے کرسی پر ڈھے گئیں۔
مریم خود بھی حق دق رہ گئی تھی۔
خاتون اچھی طرح برس کے اور انگوٹھی منہ پر مار چلی گئیں۔
مریم نے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا وہ چپل لے کر اس پر ٹوٹ پڑیں گی' مگر وہ اپنی جگہ ساکت و صامت بیٹھی تھیں۔

☼ ☼ ☼

فضا میں ڈھلتی سہ پہر کی اداسی تھی' آم کے درخت پر پتوں میں چھپی کوئل دھیرے دھیرے کوک رہی تھی۔ عریشہ نے پورے لان پر بے توجہی سے نگاہ دوڑائی۔ وہ کب سے بیرونی کوریڈور میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا تھا' مگر کسی ایک نقطے پر جمتا نہ تھا۔ نبیلہ اسے دو تین بار کہہ گئی تھیں۔ مگر وہ وہاں سے اٹھنے پر آمادہ نہ تھی۔ آخر تھک کر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اندر چلی گئیں۔ ابرار نے اسے گیٹ سے ہی دیکھ لیا تھا' مگر اس کے برآمدے میں قدم رکھنے تک عریشہ متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہولے سے کھنکارا۔
"السلام علیکم!" عریشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ کچھ لمحے غائب دماغی سے دیکھنے کے بعد سر جھکا لیا۔
"طبیعت کیسی ہے؟" ابرار نے نرمی سے پوچھا۔
"اچھی ہے۔" آواز اتنی مدھم تھی کہ ابرار کو صرف اندازہ ہوا کہ جواب آیا ہے۔
"یونیورسٹی کب سے جا رہی ہیں؟"
"یونیورسٹی؟" وہ ٹکر ٹکر ابرار کی شکل دیکھنے لگی۔
"نہیں جا رہیں؟" ابرار کو اندازہ ہوا۔

"کیا کروں گی جا کر؟" عریشہ کے لہجے میں تلخی سمٹ آئی۔
"نہ جا کر کیا کریں گی؟" وہ مسکرایا۔ عریشہ کو اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔
"آپ کا فائنل ایئر ہے۔"
"کوئی فرق نہیں پڑتا..... مجھے اب کس کے لیے پڑھنا ہے۔ کون ہے جو میری کامیابیوں کا منتظر ہو گا؟" وہ بے زاری سے بولی۔ "زندگی تو یوں بھی گزر ہی جائے گی۔"
"ٹھیک کہا آپ نے' زندگی تو یوں بھی گزر جائے گی۔" اس نے فوراً" اتفاق کیا۔ "لوگ تو خوامخواہ اتنی اسٹرگل میں لگے ہیں۔ حالانکہ زندگی تو ایک کرسی پر بیٹھ کر بھی گزر جائے گی۔"
"تم....." عریشہ نے جھنجلا کر کچھ کہنا چاہا۔ ابرار نے سنجیدگی سے بات قطع کی۔
"عریشہ بی بی! زندگی کی علامت آب رواں ہے..... ایک جگہ ٹھہرا متعفن گدلا پانی نہیں۔ لوگ بھی آب رواں کی روانی دیکھتے ہیں۔ ٹھہرے پانیوں کا تعفن سونگھنے نہیں بیٹھ جاتے۔ اب آپ کو طے کرنا ہے کہ آپ خود کو کس مقام پر رکھتی ہیں۔"
عریشہ کچھ لمحے بول ہی نہیں سکی۔ وہ اس کے سامنے پڑی کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ جما کر جھکا۔
"ابھی تک ثوبان کو بھولی نہیں؟"
ایک غیر متوقع سوال۔ عریشہ تڑپ کر رہ گئی۔
"میں اسے اپنی نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔"
"ویری گڈ....." اس نے کرسی پر ہاتھ مارا۔
"تو پھر یوں جوگ لے کر اس کی تسکین کا سامان کیوں بنا رہی ہو؟ اس نے تمہیں چیٹ کیا..... تمہاری محبت کا مذاق بنایا۔ گھر والوں نے تمہارے کردار پر کیچڑ اچھالا اور تم منہ چھپا کر بیٹھ گئیں۔ کم آن عریشہ! بریو بنو۔ ثابت کرو کہ تم اتنی کمزور نہیں ہو کہ لوگ یوں تمہیں رگید کر گزر جائیں۔ اس خود ترسی سے نکلو..... خود کو اس مقام تک لے جاؤ کہ یہ لوگ تمہیں کھونے

پُر لُطف افسوس میں۔ اس طرح ہار کر بیٹھ جانے سے کچھ نہیں ہونے والا..... سوائے اس کے کہ لوگ تم پر ہنسیں گے، تمہاری کمزوریوں کو اچھالیں گے..... اور عریشہ! تم کمزور نہیں ہو۔" وہ مدھم لہجے میں سمجھاتا چلا گیا۔

عریشہ نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ لبوں پر جیسے منجمد ہو گئے۔

"سوری! میں شاید کچھ زیادہ بول گیا..... لیکن میری باتوں پر غور ضرور کرنا..... میں خالہ سے مل لوں۔" وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

عریشہ نے دھندلائی نگاہوں سے اسے جاتے دیکھا۔

"کیا واقعی کچھ لوگوں کے چند لفظوں میں اتنی تاثیر ہوتی ہے کہ وہ حوصلہ ہارے لوگوں کو پھر سے کھڑا کر دیں۔"

عریشہ کو واقعی لگا کہ وہ اسے دھیرے سے کھڑا کر گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

ثوبان نے اپنے سامنے بیٹھی سنیعہ کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت اور چارمنگ ہو گئی تھی۔ ریسٹورنٹ کی نیم تاریک فضا میں وہ ہیرے کی طرح دمک رہی تھی۔

"اور سناؤ! کیا ہوتا رہا؟" سنیعہ نے بے حد نزاکت سے اپنے لب ٹشو سے صاف کیے۔

"وہی روٹین ورک....." ثوبان نے جوس کا گھونٹ بھرا۔

"شادی کرلی.....؟ وہ تمہاری کزن..... کیا نام تھا؟"

"عریشہ....." ثوبان نے مدھم لہجے میں بتایا۔

"ہاں! عریشہ..... کیسی ہے؟ اب تو ٹیچر و یچر بن گئی ہو گی....."

"پتا نہیں....." ثوبان نے بے زاری سے جواب دیا۔

"کیا مطلب 'پتا نہیں'؟ وہ تم لوگوں کے ساتھ ہی تو رہتی تھی۔" سنیعہ نے حیرت سے پوچھا۔

"اب نہیں رہتی۔" ثوبان نے مختصراً" کہا۔ وہ جلد از جلد اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

"کیا مطلب؟" وہ الجھ گئی۔

"سنیعہ! ہم یہاں عریشہ کو ڈسکس کرنے بیٹھے ہیں؟" وہ بے حد اکتاہٹ سے بولا۔

وہ اس سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ کیسے اس نے پل پل سنیعہ کے لوٹنے کا انتظار کیا تھا..... اور یہ کہ وہ اس نیلے ٹاپ اور سفید ٹراؤزر میں کتنی ینگ اور خوب صورت لگ رہی ہے..... حالانکہ سنیعہ کو خود بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا۔

سنیعہ نے بغور ثوبان کو دیکھا اور مسکرا دی۔

"آف کورس! ناٹ....."

"تم نے اتنا عرصہ کیوں لگا دیا..... جبکہ گئی تو صرف دو ماہ کے لیے تھیں۔"

"وہاں سے واپسی کا دل کہاں چاہتا ہے۔ اب بھی سمجھو! یہاں کے کچھ ادھورے کام وائنڈ اپ کرنے آئی ہوں۔" سنیعہ نے مینیو کارڈ اٹھاتے لاپروائی سے کہا۔

ثوبان نے اسے رشک سے دیکھا۔ وہ جس دن سے پاکستان آئی تھی۔ ثوبان اس سے ملنے کے لیے مسلسل رابطہ کر رہا تھا۔ بس سنیعہ کے پاس ہی وقت نہیں تھا۔ آج بھی بڑی مشکلوں سے لنچ کے لیے آمادہ ہوئی تھی۔ ثوبان آج دل لگا کر تیار ہوا تھا۔ خوشی سے قدم زمین پر نہیں ٹھہر رہے تھے۔ آج وہ اپنی زندگی کا بہت اہم فیصلہ کرنے جا رہا تھا۔ ایسا فیصلہ، جس کے بعد وہ لمحوں میں آسمان چھونے کو تیار تھا۔

"بس اماں! دیکھنا اب تیرے بیٹے کے دن پھرنے والے ہیں۔" اس نے خود پر ڈھیر سارا پرفیوم چھڑکتے ہوئے ماں سے کہا تھا۔ اس کے لہجے میں ایسی سرشاری تھی کہ نعمان بھی ٹھٹک کر رک گیا اور طنز سے کہنے لگا۔

"کیوں، تمہاری لاٹری نکلنے والی ہے؟"

"یہی سمجھ لیں....." ثوبان نے قہقہہ لگایا، پھر مصنوعی حیرت سے نعمان کو دیکھا۔

"مگر بھائی جان! آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ جائیں! جا کر عریشہ کی منتیں کریں۔ ورنہ ایسا نہ ہو جس دن میں بیس لاکھ کی گاڑی میں بیٹھوں..... آپ سڑک پر آجائیں۔" نعمان اس کا گریبان پکڑنے کو تیار تھا، مگر حمیدہ بیچ میں آگئیں۔

سنیعہ نے مختصر سا آرڈر دیا۔

"بس.....؟" ثوبان نے حیرت سے پوچھا..... ورنہ وہ عریشہ خوامخواہ ڈشز منگواتی جاتی خواہ بعد میں چکھنے کی نوبت بھی نہ آئے۔

"ہاں بھئی! تمہاری جیب کا خیال بھی تو کرنا ہے..... آخر یہ لنچ تمہاری طرف سے ہے۔" وہ ہنسی۔

ثوبان کو ایک ہی پل میں اپنی اوقات یاد آگئی۔ وہ ہلکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

"تم چینج ہو گئے ہو یا مجھے لگ رہا ہے؟" وہ اب فرصت سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

"نہیں تو، ویسے کا ویسا ہوں۔"

"اب تمہیں شادی کر لینی چاہیے..... کس بات کا انتظار ہے؟" وہ اپنی انگلی میں پڑی انگوٹھی گھمانے لگی۔

"تمہارا....." ثوبان نے اس پل کو گزرنے نہیں دیا۔ فورا" پکڑ لیا۔

سنیعہ اس کے انداز پر ٹھٹکی، پھر لاپروائی سے کندھے اچکا کر بولی۔

"تو جلدی کرو۔ میں تو یہاں صرف ایک ماہ کے لیے ہوں۔ اس کے بعد جاذب کے ساتھ کینیڈا شفٹ ہو جاؤں گی۔"

"جاذب؟" ثوبان نے چونک کر پوچھا۔

"مائی فیانسی.....!" سنیعہ نے اطمینان اور سکون سے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔

"ہم نے امریکا میں منگنی کر لی تھی۔"

"لیکن تم نے..... تم نے تو مجھے....." الفاظ حلق میں پھنس گئے۔

"وہ میرا جذباتی پن تھا۔" سنیعہ نے ازلی اطمینان سے بات کا آغاز کیا۔ "لیکن وہاں اپنے کزن سے مل کر احساس ہوا۔ لائف پارٹنر ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ آپ پر رشک کریں نا کہ ترس کھائیں۔ انسان کی حیثیت شادی کے بعد کچھ اور بلند ہو..... آپ اپنے اسٹیپ سے کئی اسٹیپ اوپر چلے جائیں..... یہ نہیں کہ خود نیچے اترنا پڑے..... اور ثوبان! تم بالکل ٹھیک تھے۔ تمہارے لیے وہی لڑکی مناسب ہے..... عریشہ ساری زندگی تم سے محبت بھی کرے گی اور خدمت بھی....." اس نے شرارتی انداز میں لفظ خدمت ادا کیا۔ "تم دونوں ایک جیسے ہو۔ تمہارا اسٹیٹس، لائف اسٹائل میرے ساتھ کبھی مینیج نہیں کر پاتے۔ ویسے بھی تم نے انکار کر دیا تھا تو مجھے کہیں تو شادی کرنا ہی تھی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اپنے بال ٹھیک کرنے لگی..... اس کی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ دمک رہی تھی۔

لیکن ثوبان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ کچھ لمحوں پہلے وہ آسمان پر تھا اور اب قدموں تلے زمین بھی نہ تھی۔

ویٹر کھانا چننے لگا۔

ثوبان نے اپنی بچی کھچی ہمت مجتمع کی اور خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

سنیعہ اس کی حرکت کو اپنی توہین سمجھتی، اگر ثوبان کی کیفیت سمجھ نہ رہی ہوتی۔

اس نے اطمینان سے نیپکن بچھایا اور کھانا کھانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے پہلے ہی پتا تھا..... یہ لڑکی کوئی نہ کوئی گل کھلائے گی..... اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں اماں! بس تم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔" بانو کی پاٹ دار آواز پورے صحن میں گونج رہی تھی۔

"ابھی تک تو کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ پر تو ایسا کر، لاؤڈ اسپیکر لے کر پورے محلے میں نشر کر آ..... آہستہ آواز میں بات نہیں کر سکتی؟" حمیدہ نے جل بھن کر کہا۔

"منگنی ٹوٹی ہے۔ خبر تو پھیلے گی۔ ایسی باتیں چھپی تھوڑی رہتی ہیں۔ یوں، یوں....." چٹکی بجاتے

ہوئے۔ "پھیلتی ہے۔"

لگ ہی نہیں رہا تھا کہ ان کی بیٹی ان کا دکھ بانٹنے آئی ہے۔ وہ تو کسی کٹنی سی محلے دارنی کی طرح چسکے لے رہی تھی۔ حمیدہ بدمزا ہو گئیں۔

"کیا کروں؟ سمجھ میں نہیں آتا' اسے کہاں دفع کروں ۔۔۔ ادھر نعمان کہتا ہے۔ ہفتے کے اندر اندر رخصت کرو۔ ورنہ گلا گھونٹ کر مار دوں گا۔" حمیدہ سچ مچ پریشان تھیں۔

"تو اسی کو بلا لو ۔۔۔ ساتھ میں دفع کرو ۔۔۔ ایویں کیوں پریشان ہوتی ہو اماں ۔۔۔ جب لڑکا لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔" بانو نے مزے سے مشورہ دیا۔

"نعمان نے اسے نہ دیکھا ہوتا تو بہانے سے بلوا لیتی' اب سامنے آیا تو نعمان نے دونوں کے ٹکڑے کر دینے ہیں۔"

"ہے کہاں؟" بانو نے متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"دکان پر ہو گا۔"

"مریم کا پوچھ رہی ہوں۔"

"کمرے میں ہی ہو گی۔"

"ویسے ایک بات کہوں ۔۔۔" بانو نے رک کر ماں کو دیکھا۔

"تب سے باتیں ہی کیے جا رہی ہے۔ آگے بول ۔۔۔" حمیدہ بے زار ہوئیں۔

"اکرم کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی ۔۔۔" بانو نے اپنے دیور کا نام لیا۔

"ہیں۔" حمیدہ جو ڈھیلی ڈھالی بیٹھی تھیں فوراً" چوکنا ہوئیں۔ "اب وہ مان جائے گا؟"

"کیوں نہیں مانے گا۔ لالچ ہی ایسا دوں گی۔"

"کیسا لالچ؟ ہمارے پاس کون سی زمین جائیداد ہے جو مریم کے نام لگا دوں گی۔"

"سیدھی سی بات ہے۔ مریم کا رشتہ اب کہیں اور نہیں ہونے والا۔ جنہوں نے منگنی توڑی ہے' وہ چپ نہیں رہیں گے۔ ہر جگہ منگنی ٹوٹنے کی وجہ دو سے ضرب لگا کر دیں گے ۔۔۔ اور ایسی باتیں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ بدنامی تو ہو گی۔ ان حالات میں اکرم سے اچھا رشتہ مریم کے لیے نہیں ملے گا۔ بس اتنا کرو کہ نعمان کے لیے میری نند کا رشتہ لے لو۔" حمیدہ حق دق رہ گئیں۔

"تو بڑی چالاک ہے بانو ۔۔۔"

"میری نند اتنی بھی بری نہیں۔ ایف اے پاس ہے۔ سلائی کڑھائی میں ماہر ہے اور تجھے کیا چاہیے اماں! دونوں ایک گھر میں نمٹ جائیں گے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"لیکن اگر اس کے ہوتے سوتے نے پھر فون کر دیا تو ۔۔۔؟" حمیدہ متذبذب تھیں۔

"اماں! تو اکرم کو کیا سمجھتی ہے۔ سارا محلہ اسے اکرم بد ۔۔۔" بانو نے "بدمعاش" کہتے کہتے زبان دانتوں تلے دبالی۔ "فون کرنے والے کی گچی مروڑ دے گا ۔۔۔ میں پہلے ہی اس کے کان میں یہ بات ڈال دوں گی کہ کوئی آوارہ لفنگا ہماری مریم کو تنگ کر رہا ہے ۔۔۔ اسی لیے تو جلدی جلدی شادی کرنا پڑی۔"

"بانو! تو سچ مچ بڑی چالاک ہے۔" حمیدہ کانوں کان راضی ہو گئی۔

"اماں! آخر تیری بیٹی ہوں۔" بانو نے خود ہی اپنے کندھے پر تھپکی دی۔

"پر اماں! مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ مریم کا اس لڑکے کے ساتھ رابطہ کیسے ہو رہا ہے؟"

"لو ۔۔۔ رابطہ کیسے ہو گا؟ عزت کے ڈر سے اس کی نوکری چھڑا کر گھر بٹھا لیا۔ سارا دن کمرے میں بند رہتی ہے۔"

"نہ اماں! ایسے کام بغیر رابطوں کے نہیں ہوتے۔" بانو نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔ "کوئی نہ کوئی ذریعہ تو ہے۔"

"کیا ذریعہ ہو گا؟ عریشہ ہوتی تو میں سمجھتی اس کے ذریعے رابطہ ہے۔ وہ بھی دفع ہوئی۔ ابرار بھی چلا گیا ۔۔۔ یہاں نہ کوئی آئے' نہ جائے ۔۔۔ میں اور تمہارا باپ سارا دن گھر پر ہی ہوتے ہیں۔"

"اچھا ۔۔۔" بانو سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔

"تو نے واپس جانا ہے؟" حمیدہ نے پوچھا۔
"نہیں! رات رکوں گی۔"
"بچے ساتھ نہیں آئے.....؟"
"وہ لئیق کے دادی کے پاس..... کون سا چھوٹے ہیں۔" بانو نے لاپروائی سے ہاتھ ہلایا۔
"اچھا..... میں ہانڈی چڑھادوں۔"
"ہاں اور اماں! نعمان سے بھی بات کر لینا۔ یہ نہ ہو کہ عین وقت پر مکر جائے۔ یہ روز روز کے تماشے اچھے نہیں۔"
"ہاں..... ہاں کرلوں گی۔"
تب ہی ثوبان اندر آیا۔ اور ان کی طرف دیکھے بغیر سیدھا سیڑھیاں چڑھ گیا۔
"نہ سلام نہ دعا..... اس کا بوتھا کیوں سوجا ہوا ہے۔" بانو نے تیوری چڑھا کر کہا۔
"اللہ جانے! گیا تو بڑا خوش باش تھا۔" حمیدہ بڑبڑائیں۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ، محسن اور نبیلہ کے سامنے ناشتے کے لوازمات چن رہی تھی۔
"عریشہ کو بھی بلا لیا کرو....."
"بہت زور دیتی ہوں، مگر وہ آتی ہی نہیں ہے..... اسی لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔" نبیلہ نے بتایا۔
"میں جب سے واپس آیا ہوں..... اسے بہت گم صم اور اداس دیکھ رہا ہوں۔ یونیورسٹی بھی نہیں جاتی۔" محسن نے متفکر انداز میں کہا تو فاطمہ نے گھبرا کر نبیلہ کو دیکھا۔
"کبھی کبھی ڈپریشن میں آجاتی ہے..... تو یوں ہی ہر چیز سے کٹ جاتی ہے۔" انہوں نے نارمل انداز میں بتایا۔
"یہ تو اچھی بات نہیں..... اسے کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھائیں۔"
"دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے تھوڑا وقت دو۔ سنبھل جائے گی۔"
"بہت برا سلوک کیا ہے ماموں لوگوں نے ہمارے ساتھ..... کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے۔" اس کے دبے دبے لہجے میں شدید غصہ تھا۔
فاطمہ نے سر جھکا لیا۔
"بس! جو ہوگیا۔ اسے بار بار دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" نبیلہ نے ہاتھ اٹھا کر محسن کو مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔
"جی! آپ کے تو بھائی بھاوج ہیں۔ آپ کیوں کچھ کہیں گی۔"
"جو غلط ہے، وہ غلط ہے، لیکن ناشتے کے وقت اس ٹاپک کو چھیڑنا ضروری ہے؟"
نبیلہ کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری در آئی، جسے محسوس کر کے محسن چپ کر گیا۔
"فاطمہ! ڈھنگ سے ناشتا کرو۔"
نبیلہ کے کہنے پر محسن نے چونک کر فاطمہ کو دیکھا۔ وہ اب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ اسے بھی احساس ہوا کہ اسے احتیاط سے کام لینا چاہیے..... آخر اس سب میں فاطمہ کا کیا قصور۔
"بس! عریشہ پر بہت ترس آتا ہے..... اتنی سی عمر میں اتنے سارے دکھ دیکھ لیے، اس لیے کبھی کبھار جذباتی ہو جاتا ہوں۔" یہ معذرت خواہانہ انداز یقیناً فاطمہ کے لیے تھا۔
فاطمہ نے ہلکی سی نظر اٹھا کر محسن کو دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔ لیکن دروازے میں کھڑی عریشہ ابھی محسن کے جملے پر اٹکی تھی۔
"تو کیا واقعی وہ اب اسی قابل ہے کہ لوگ اس پر ترس کھائیں؟"
وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔
"لیں! نعمان بھی آگیا..... اماں! اس سے بات کر لو تو میں آج ہی گھر بات کرلیتی ہوں۔" بیرونی دروازے سے اندر آتے نعمان کو دیکھ کر بانو نے سرگوشی میں کہا۔
"کیسی ہو آپا....." نعمان قریب آگیا۔
"میں ٹھیک ہوں۔"

"اماں! فون کر دیتیں۔ میں بچوں کے لیے کچھ پھل فل لے آتا۔"
"بچے تو ساتھ آئے نہیں۔ رات ادھر ہی ہے، جو مرضی لے آنا۔" حمیدہ نے کہا۔
بانو نہانے کے بہانے سے اٹھ کر مریم کے کمرے میں آگئی۔ مریم نہانے گئی تھی۔ بانو نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی متجسس طبیعت نے اسے بیٹھنے نہیں دیا۔ تب ہی وہ مریم کی الماری تلپٹ کرنے لگی۔ ایک ایک کپڑا جھاڑ جھاڑ کے دیکھا..... پھر نیچے بیٹھ کر جوتوں والا خانہ بھی کھول لیا اور جوتے کے ڈبے میں اسے گوہر مقصود مل گیا۔
"یہ کوئی بات ہے کرنے والی۔" نعمان جھنجلا گیا۔
"میں نے تجھے ساری بات کھول کر بتا دی ہے..... آگے اپنی مرضی دیکھ لے..... میرا تجھ پر کوئی زور نہیں پر کیا کروں؟ پیٹ کی جنی ہے..... آخر کدھر دھکا دوں۔"
"میں نے کہا نا..... جو بات تھی، تجھے بتا دی..... آگے تو مختار ہے۔" حمیدہ اولاد کے ہاتھوں بے بس ہو چکی تھیں۔
"کیا تھا اماں! جو تو میری شادی عائشہ سے ہو جانے دیتی۔" دل میں تیر کی طرح گڑا شکوہ زبان پر آہی گیا۔
حمیدہ بری طرح چونکیں۔
"میں..... میں نے کیا کیا ہے؟"
"تمہیں اچھی طرح پتا ہے اماں! ساری زندگی تو نے ہر اچھی چیز ثوبان کو دی اور میں نے خوشی خوشی دے بھی دی..... بس! ایک میرے دل کی خوشی مجھے دے دیتیں..... میں ساری زندگی احسان مند رہتا۔" وہ افسوس اور تلخی سے کہتا چلا گیا۔
"میں نے کچھ نہیں کیا..... پھر تو نے کون سا مجھے بتایا تھا کہ تو اس استانی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ خود ہی تو عریشہ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔" حمیدہ بوکھلا گئیں۔
"ٹھیک کہا، ساری غلطی تو میری ہی تھی بہرحال..... وہ کھڑا ہوا۔ "یہ بے جوڑ شادی نہیں ہو سکتی۔"
"لیکن مریم....."
"جہنم میں جائے مریم۔ میں نے اس سارے خاندان کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ سارے مسئلے میں نے ہی حل کرنے ہیں؟ وہ نواب کا بچہ بھی تو ہے..... اس کی کرو۔" وہ بھڑک اٹھا تب ہی اندر شور سا ہوا۔
مریم نہا کر تولیے سے بال رگڑتی غسل خانے سے نکلی تو بانو کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر بوکھلا کر لپکی۔
"آپا! یہ....."
"اچھا..... تو اس پہ سارے صلاح مشورے ہوتے ہیں۔" بانو نے موبائل لہرایا۔
"آپا! یہ مجھے واپس کردیں۔" اس نے لپک کر پکڑنا چاہا۔ بانو نے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔
"تو تو کچھ زیادہ ہی بے حیا ہو گئی ہے..... تیرے جیسی بے شرم لڑکی تو ہمارے پورے خاندان میں نہیں..... کھے ڈال رہی ہے بوڑھے ماں باپ کے سروں پر۔" وہ زور زور سے بولنے لگی۔ مریم کو ڈر تھا' آوازیں باہر گئیں تو نعمان اندر آجائے گا۔
"آپا! یہ مجھے دے دیں..... اس کے بعد بات کریں گے۔" وہ موبائل چھیننے کی کوشش کرنے لگی۔
"کیوں؟ اب اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے کے منصوبے بنانے ہیں؟ بے غیرت! ڈوب کے مرجا۔"
وہی ہوا۔ بانو کی چیخ و پکار پر نعمان اور حمیدہ اندر آگئے۔
"کیا آفت آگئی ہے.....؟ اس گھر میں کوئی بات سکون کے ساتھ نہیں ہوسکتی؟" نعمان چلایا۔
"نعمان! یہ دیکھ اس کمینی کے کرتوت۔ اس موبائل پر رابطے رکھے ہوئے ہیں اور میری بھولی ماں کہتی ہے' رابطہ کیسے ہو سکتا ہے۔"
بانو نے لپک کر موبائل نعمان کو تھمایا۔
مریم اپنی جگہ بت بن گئی۔
نعمان نے پہلے موبائل کو پھر مریم کو شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا۔
دوسرے لمحے موبائل پوری قوت سے مریم کے سر کے عین پاس دیوار سے ٹکرایا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

مقدس مشعل

احساسِ زیاں جب ہوا

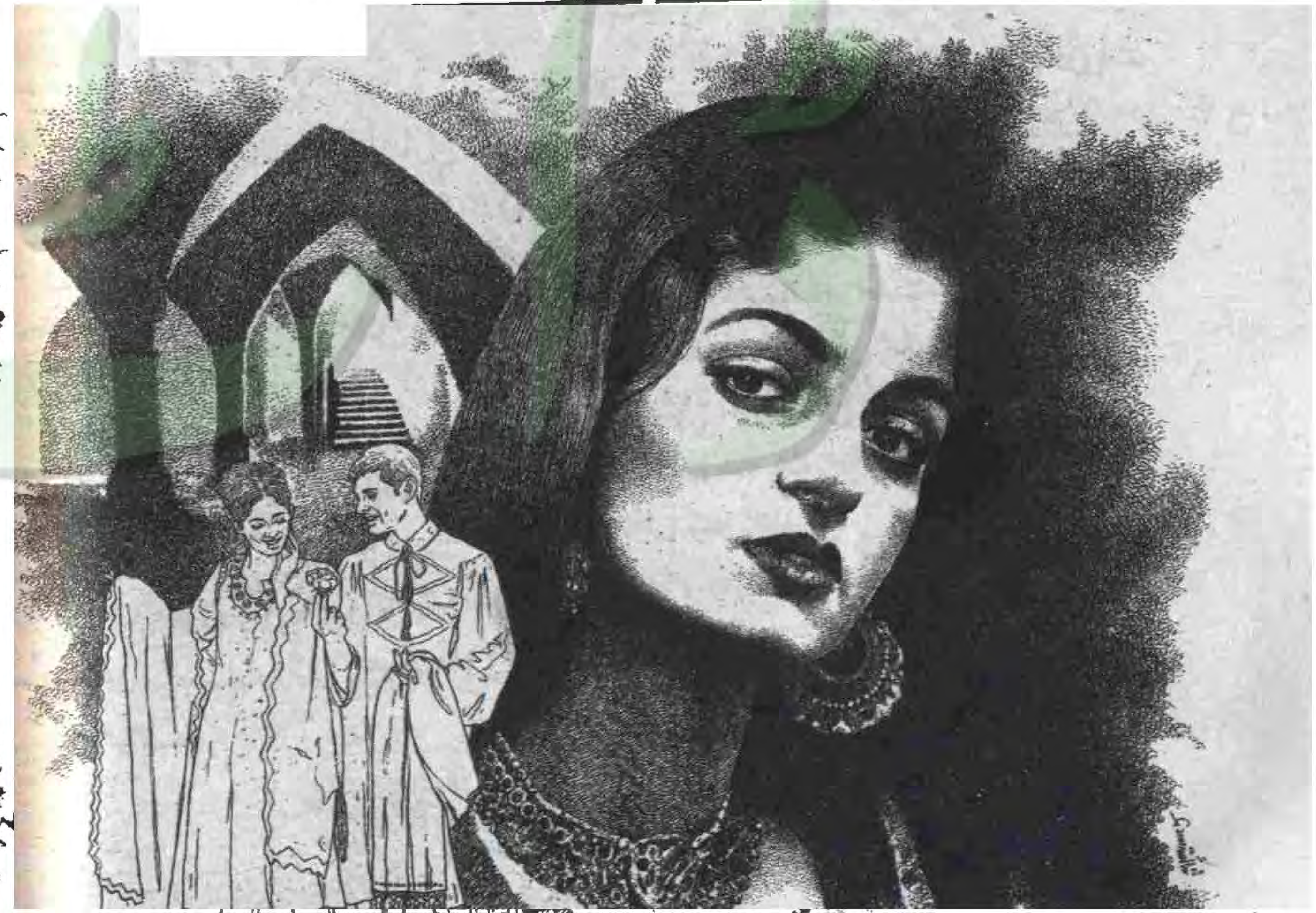
اس کے اردگرد ہنستے کھلکھلاتے شور مچاتے زندگی سے بھرپور لوگوں کا ہجوم سا تھا۔ وہ سب لوگ کاروبار زندگی اور مصروفیات کو ترک کر کے کچھ دیر کے لیے زندگی کے کچھ فارغ لمحات سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہی تو سی ویو پر آئے تھے۔

وہ بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ بہت مصروف رہنے والا انسان آج چھٹی کے دن فارغ وقت کو خوب صورت طریقے سے گزارنے کے لیے یہاں چلا آیا تھا۔

پچھلی شب اس کی بہت تکلیف میں گزری تھی۔ ساری رات جاگتے اور سگریٹ پھونکتے ہوئے وہ اک نہ سمجھ میں آنے والی ذہنی و دلی اذیت میں مبتلا رہا تھا اور ایسی جاگتی مضطرب پشیماں راتیں تو اب اکثر و بیشتر ہی اس کی زندگی میں آنے لگی تھیں۔ الجھنیں اور وسوسے بڑھنے لگے تھے۔ وہ اپنے ہی ضمیر کے نوکیلے سوالوں سے گھبرانے لگا تھا۔ فرار کے کئی راستے تلاشتا مگر دل کا سکون کسی راستے پر بھی میسر نہیں تھا۔

ابھی بھی گھر سے تو وہ اکیلا ہی نکلا تھا مگر اس وقت

ناولٹ



یاسیت اور حسرت بھرے دل لے ساتھ کھڑا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اس نے ہر کام سوچ کر اس کے نتائج اور اثرات کو مد نظر رکھ کر کیا تھا اور اسے اپنی خواہشوں' اپنے کاموں اور اپنے فیصلوں پر ناز تھا کہ آج تک اسے کسی خواہش کے لیے شرمندہ حسرت ہونا پڑا تھا۔ ناکامیوں کا سامنا بہت کم ہوا تھا۔ مگر ایک فیصلہ جو اس نے ایک منہ زور خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا تھا' آج وہ فیصلہ ایک پچھتاوا بن کر لمحہ لمحہ اسے ڈستا رہتا تھا۔

"ہائے حذیفہ!" اک خوش کن اور دوستانہ سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا اور اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اسے حیرانی کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

"انصر تم!" اس کے لہجے میں بے یقینی کے ساتھ ساتھ بے ساختہ خوشی کا تاثر بھی تھا۔ انصر اس کے بہترین دوستوں میں سے ایک تھا اور آج تقریباً" ساڑھے پانچ سال بعد اس کے روبرو تھا۔

"ہاں یار! میں انصر ہی ہوں کیا میری شکل چینج ہو گئی ہے جو تمہیں پہچاننے میں دشواری ہو رہی ہے۔" اس کا وہی نٹ کھٹ اور لاپروا سا انداز تھا۔

"تم بالکل نہیں بدلے ہو یار! شکل و صورت اور انداز سب ویسے ہی ہیں۔" اسے گلے سے لگاتے ہوئے حذیفہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"مگر تم تو پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ اور ریزرو محسوس ہو رہے ہو!" انصر نے بے تکلفی سے کہا اور غور سے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھا تھا۔

"ہاں یار! حالات کر دیتے ہیں سنجیدہ..... تم بتاؤ پاکستان کب آئے؟ اپنے آنے کی خبر تک نہیں دی۔" حذیفہ نے خوشگوار انداز میں پوچھا۔ اتنے عرصے بعد انصر سے مل کر وہ دلی خوشی محسوس کر رہا تھا جو اس کے چہرے سے بھی عیاں تھی۔

"تقریباً" تین ماہ ہو چکے ہیں پاکستان آئے ہوئے۔" انصر نے سامنے بنچ کی طرف قدم بڑھاتے

"یہ بتاؤ لائف کیسی جا رہی ہے۔ گھر والوں کا کیا حال ہے۔ بھابھی اور اپنے بیٹے کے بارے میں بتاؤ!" وہ بنچ کے قریب آ چکے تھے۔ انصر نے ٹانگیں پھیلا کر بینچ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"سب ٹھیک ٹھاک اپنی اپنی جگہوں پر فٹ فاٹ ہیں۔ تم سناؤ مستقل پاکستان آئے ہو یا پھر عارضی طور پر؟" حذیفہ نے ایک پاؤں بنچ پر رکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

"یار! ممی ڈیڈی نے اصرار کر کر کے بلایا ہے ان کا کہنا ہے کہ میری شادی ہر حال میں پاکستان میں ہی ہونی چاہیے کسی مشرقی لڑکی سے' پھر چاہے دوبارہ واپس چلا جاؤں مگر حقیقتاً" وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ میں بڑے بھائی جان کے ساتھ مل کر اب ڈیڈی کا بزنس سنبھالوں اور انگلینڈ واپس جانے کا ارادہ ترک کر دوں۔ مگر مجھے ان کی یہ دونوں باتیں ناقابل فہم لگتی ہیں۔ بھلا اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ پاکستانی لڑکی ہی ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہو سکتی ہے اور جب سرور بھائی اتنے اچھے طریقے سے یہاں بزنس کو دیکھ رہے ہیں تو مجھے وہاں اچھی خاصی جاب آفر ہو رہی ہے۔ میں تو اب واپس انگلینڈ جانا چاہ رہا ہوں مگر ممی کہتی ہیں شادی کیے بغیر نہیں جانا..... بقول ان کے میری عمر کے لڑکے اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کروا رہے ہیں۔" اس کے آخری جملے پر حذیفہ بے ساختہ ہنسا۔

"آنٹی کا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔ اب تمہیں گھر بسانا چاہیے۔ تمہاری زندگی میں کبھی لڑکیوں کی کمی نہیں رہی خوب صورت سے خوب صورت لڑکیوں سے دوستی رکھی ہے مگر شادی کے لیے جس نے کہا تم نے ریجیکٹ کر دیا۔ کیا بڑھاپے میں کرو گے؟"

"یار! شادی کے لیے کوئی لڑکی ملے بھی تو فرینڈ شپ تو ہزاروں لڑکیوں سے کی جا سکتی ہے مگر شادی ہر ایک سے نہیں کی جا سکتی۔ شادی تو ایک ہی لڑکی سے کروں گا اور وہ ایک لڑکی ابھی تک ملی نہیں مجھے۔" انصر کے لہجے میں محسوس کی جانے والی جستجو تھی

کسی ان دیکھی لڑکی بے بسے۔

"مغرب و مشرق کی کئی لڑکیوں سے دوستیاں رکھنے کے باوجود تمہیں اپنی من پسند لڑکی نہیں ملی کہیں امبر کی بد دعا تو نہیں لگ گئی تمہیں..... یاد ہے نا تمہیں امبر' اب یہ نہ کہنا کہ اتنی ساری لڑکیوں کے جھرمٹ میں مجھے امبر بھول گئی۔" حذیفہ نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یاد ہے یاد ہے اور میری حالیہ معلومات کے مطابق وہ اپنے شوہر اور ایک عدد بے بی کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہے انگلینڈ میں۔" انصر کا انداز بیزار سا تھا۔

"تمہیں اس کو ریجیکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا اتنی زیادہ انڈر اسٹینڈنگ تھی تم دونوں کی..... اور پھر وہ پاکستانی بھی تھی۔ انگلینڈ کی نیشنیلٹی بھی تھی اس کے پاس' اتنے امیر باپ کی بیٹی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تم سے محبت کرتی تھی اور خود اس نے اپنا پرپوزل تمہیں دیا جسے تم نے بے دردی سے ٹھکرا دیا۔ کتنا روئی تھی بے چاری اور تقریباً" ایک مہینہ بیمار رہی تھی۔ میں آج تک حیران ہوں تم نے اسے کیوں ٹھکرایا جبکہ تمہاری فیملی بھی اس لڑکی کو پسند کرتی تھی اور سب سے اہم بات پوری یونیورسٹی میں اس کی صرف تم سے دوستی تھی اور کوئی اس کا بوائے فرینڈ نہیں تھا۔" اس بات کو دہراتے ہوئے آج بھی حذیفہ کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

"اونہہ..... محبت۔ تم تو فارغ ہوتے ہی پاکستان آ گئے تھے۔ اور ان دنوں وہ میرے غم میں مبتلا بیمار تھی مگر بعد میں جب میں نے تحقیق کی اور اپنی اس خوش فہمی کو یقین دلانا چاہا کہ اتنی حسین' امیر کبیر اسٹائلش سی لڑکی واقعی مجھ سے ہی محبت کرتی ہے تو معلوم ہوا وہ ابارشن کرانے کی وجہ سے بیمار پڑی تھی اور یہ اسے اس وجہ سے کرانا پڑا کیونکہ پاکستان سے گئے اپنے ایک کزن میں وہ کچھ زیادہ ہی انوالو ہو گئی جس کی وہ آج کل بیوی ہوتی ہے۔ بس تب سے ان اسٹائلش اور ماڈرن

حذیفہ جیسے بت بن گیا تھا اور بے یقین ساکت نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"یار! حیرت کے مارے کہیں زمین بوس نہ ہو جانا ادھر بنچ پر بیٹھ جاؤ۔" انصر نے بنچ پر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔

"مجھے حیرت اس لیے ہو رہی ہے کہ میں ہی بدھو آدمی ہوں جو عورت کو پہچان نہیں سکا یا پھر عورت اصلی روپ ہی ظاہر نہیں ہوتا۔" حذیفہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

"بچپن میں کبھی اپنے دادا کے منہ سے سنا تھا کہ عورت کی چال ڈھال اس کے کردار اور اس کے خیالات کی عکاسی کر دیتی ہے۔ تب تو یہ بات سر سے گزر گئی مگر گزرتے وقت نے اس بات کا مفہوم بتا دیا۔ یار! شادی صرف نفس کے لوازمات پورے کرنے کے لیے تو نہیں کی جاتی۔ شادی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ شادی دو انسانوں کے درمیان ایک عہد ہوتا ہے

جسے دونوں نے باوفا طریقے سے نبھانا ہوتا ہے۔ شادی کے بعد آگے ایک نسل کی افزائش ہوتی ہے اور میں چاہتا ہوں میری اولاد میری نسل ایک ایسی عورت کی گود میں پروان چڑھے جو واقعی ہی میں عورت ہو!"

انفر کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ حذیفہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ کیا یہ وہی انفر ہے جو انگلینڈ میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران اپنا ہیر اسٹائل اور گرل فرینڈ آئے روز تبدیل کرتا تھا بیوی کے لیے اس نے الگ ہی معیار سوچ رکھا تھا۔

"انفر! تم جب شادی کرو گے تو کیسے جان پاؤ گے کہ جس لڑکی کا تم انتخاب کر رہے ہو وہ سچی مخلص باوفا اور باکردار ہے؟" حذیفہ کے لہجے میں تجسس تھا۔

"ہوں انٹرسٹنگ کونسچن.... اس کی آنکھوں میں تو حیا کا عکس ہو گا جب وہ بات کرے گی تو اس کے لفظوں میں سچائی کی مہک ہو گی.... اور جب وہ باکردار باحیا اور سچی ہو گی تو یقیناً وفادار بھی ہو گی اور ایسی لڑکی کو میں شرابیوں کی محفل میں بھی پہچان لوں گا خدانخواستہ اگر وہ مجھے ایسی کسی محفل میں بھی ملی۔"

آخری جملہ اس نے ایسے یقین سے کہا تھا کہ حذیفہ کو اپنے آپ سے ندامت محسوس ہوئی کہ اس نے عورت کو پہچاننے میں خاصی بد عقلی سے کام لیا تھا۔

"انفر لڑکیوں سے دوستیاں پالنے کا اتنا فائدہ تو ہوا کہ تمہیں لڑکیوں کو سمجھنا آگیا۔ میری طرح نا سمجھ نہیں ہو۔" حذیفہ نے کچھ خفت آمیز انداز میں کہا۔

"اوہ یار! سارے مردوں کے اندر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ عورت کو پہچان سکے خاص کر اس کے کردار کو.... چاہے وہ لڑکیوں کے قریب رہے یا نہیں.... اگر پہچاننے میں غلطی کرتے ہیں تو اس میں ان کی اپنی سوچ اور نظریات کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔"

انفر کی پر اعتماد بات نے حذیفہ کو ایک اور دھچکا لگایا۔

"چلو آج میری طرف سے لنچ.... اتنے عرصے بعد ملے ہیں۔" اپنے اندر بڑھتے شور کو نظر انداز کرتے ہوئے حذیفہ نے لہجے کو بشاش کرتے ہوئے کہا۔

"وائے ناٹ.... چلو چلتے ہیں!" انفر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا.... اب وہ دونوں اپنی اپنی گاڑی کی طرف جا رہے تھے، جو کہ پارکنگ ایریا میں کھڑی تھیں۔



حذیفہ اور انفر دونوں بزنس ایڈمنسٹریشن کی اعلا تعلیم کے لیے ایک ہی سال انگلینڈ کی یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ دونوں اجنبی دیس میں پہلے پہل کنفیوز رہے مگر چند ہی دنوں میں انفر نے وہاں کے ماحول اور اثرات کو قبول کر لیا۔ لہٰذا غیر ملکی لڑکے لڑکیوں سے دوستیاں کرنے اور روابط بڑھانے میں اسے کسی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غیر معمولی ذہانت رکھنے کے علاوہ وہ پرکشش اور پر اعتماد شخصیت کا حامل زندہ دل، شوخ اور خوش مزاج سا لڑکا تھا۔ اس کی ہلکی گندمی رنگت اور گہری کالی سیاہ آنکھوں میں بہت جاذبیت پائی جاتی تھی۔ نیلی، سبز، سنہری آنکھوں اور گوری رنگت والی انگریز لڑکیوں کو اپنے شکنجے میں پھنسانا تو جیسے اس کے دائیں ہاتھ کا کام تھا۔ وہ کروڑپتی باپ کا بگڑا ہوا لاڈلا بیٹا تھا۔ جو زندگی کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ تعلیم میں دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود وہ اسکول سے لے کر اب تک ذہین اسٹوڈنٹس اور اچھی پوزیشن رکھنے والے اسٹوڈنٹس میں رہا تھا۔ مگر اس کا ذاتی کردار شریف النفس طالب علموں کے لیے ناپسندیدہ تھا۔

ہر لڑکی سے اس کا ایسا زور دار افیئر چلتا کہ دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا یہ اس کا آخری افیئر ہے۔ مگر کچھ ہی عرصے بعد اس لڑکی کو پہچاننے میں بھی اسے وقت کا سامنا ہوتا۔ اپنی اس ہرجائی فطرت کے باوجود وہ لڑکیوں میں مقبول تھا۔ شانوں تک آتے لمبے بال اور مسکرانے کا مخصوص اسٹائل کسی بھی لڑکی کو پاگل کر دیتا تھا۔

اس کے برعکس حذیفہ طبعاً" شریف محتاط اور

سنجیدہ سا تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور دو بہنوں کی امیدوں کا مرکز تھا۔ تعلیمی ریکارڈ اس کا ہمیشہ اچھا رہا تھا والدین کی سپورٹ اور اپنے شوق کی بنا پر وہ انگلینڈ تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔ اس کے والد سکندر علی بھی ایک بزنس مین تھے۔ مگر جدی پشتی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی شب و روز محنت کی بدولت آج ہائی سوسائٹی میں مقام پایا تھا۔ حذیفہ اس بات کا احساس رکھتا تھا کہ اس کے والد صاحب نے جو کچھ بھی بنایا بہت محنت سے بنایا اور آگے جا کر اسے ہی یہ سب سنبھالنا ہے لہٰذا وہ پوری نیک نیتی سے خود کو اس قابل بنا رہا تھا تاکہ والد کے بنائے ہوئے کاروبار کو مزید ترقی دے سکے۔ لہٰذا انگلینڈ جا کر مغربی فضا میں بھی اس کی توجہ کا مرکز اس کی پڑھائی تھی۔

پہلے پہل حذیفہ کو انفر ایک آنکھ نہ بھایا۔ مگر پھر کلاس میں اس کی نمایاں پوزیشن، پروفیسرز پر سوالات کی بوچھاڑ کر کے زچ کر دینے کا انداز اور اپنی متاثر کن شخصیت کی بدولت اس نے حذیفہ کو اپنی طرف کھینچ ہی لیا اور چند بار کی ملاقات نے ہی حذیفہ کو باور کروا دیا کہ یہ لاابالی اور کھلنڈری طبیعت رکھنے والا شخص اندر سے کتنا گہرا اور ہر چیز کا بغور مشاہدہ کرنے والی آنکھ رکھتا ہے۔

دونوں کے مزاج عادات اور فطری ذوق و شوق میں فرق کے باوجود دوستی ہو ہی گئی اور پھر تعلیم مکمل ہونے تک رہی۔ حذیفہ نے فوراً" ہی واپسی کی ٹکٹ لی تھی جبکہ انفر کا فی الحال کوئی پروگرام نہ تھا پاکستان واپس جانے کا۔ آج عرصے بعد ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کو ساتھ بیتے دن یاد آئے اور دونوں ہی ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوئے تھے۔



"منیرہ! اٹھ جاؤ بچے کب تک سوؤ گی۔ دیکھو تو شام ہو رہی ہے.... چلو اٹھو میرا بیٹا پھر رات ساری تمہیں نیند نہیں آتی ہے۔ یہ بے وقت کا سونا چھوڑ دو۔" کلثوم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا پھر آگے بڑھ کر کھڑکی کے آگے پردہ ہٹایا۔ وہ تھوڑا سا کسمسائی۔

"اٹھ جاؤ بیٹا! روبی کے ساتھ ذرا میکرو چلی جاؤ اس مہینے کا راشن نہیں آیا۔ آج دس تاریخ ہو رہی ہے۔" کلثوم بیگم نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔

"امی! بھابھی کے ساتھ آپ چلی جائیں یا سہیل بھائی کو بھیج دیں وہ آ ہی چکے ہوں گے۔" بند آنکھوں کے ساتھ وہ خمار آلود آواز میں بولی۔

"بیٹا تم جانتی ہو گاڑی مجھے بھی نہیں چلانی آتی اور نہ ہی روبی کو.... ورنہ وہ اکیلی ہی چلی جاتی اور سہیل ابھی ابھی آیا ہے، دفتر سے تھکا ہوا۔ وہ جانا نہیں چاہ رہا۔ تم چلی جاؤ نا روبی کے ساتھ۔"

کلثوم بیگم نے نرمی سے کہا تو منیرہ مزید پس و پیش نہ کر سکی۔ دو تین بار پلکیں جھپکانے کے بعد اس نے پوری آنکھیں کھولیں تو کلثوم بیگم کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

"کتنی بار کہا ہے یہ نیند کی گولی مت لیا کرو۔" کلثوم بیگم نے کہا تو ایک تلخ سی مسکراہٹ منیرہ کے ہونٹوں پر آئی۔

"امی! نیند نہ آئے تو کیا کروں۔ مجبوراً" لیتی ہوں۔ شوق سے تو نہیں۔" دھیمی آواز میں کہتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھی اور سلیپر پہن کر کمرے سے ملحق باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ کلثوم بیگم کے سینے سے ایک افسردہ سی آہ خارج ہوئی۔



میکرو کے پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد وہ دونوں ٹرالیوں کی طرف آئیں۔ روبی نے ایک ٹرالی گھسیٹ لی۔ منیرہ راستے بھر چپ چاپ ڈرائیونگ ہی کرتی آئی تھی۔ روبی کی ایک دو بات کے جواب میں اس نے فقط ہوں ہاں ہی کیا تھا۔ پھر روبی نے بھی اسے زیادہ مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ منیرہ ابھی بھی نیند کے زیر اثر ہے.... خریداری بھی

روبی نے خود ہی شروع کی۔ منیرہ بس چپ چاپ اس کے ساتھ چلتی جارہی تھی۔

ضرورت کی ہر چیز وہ تقریباً" خرید ہی چکی تھیں اور پھر آخر میں وہ اس رو کی طرف آئیں جہاں چائنیز چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

"منیرہ! بھئی۔ اب یہاں شاپنگ کا مرحلہ تمہیں سر کرنا ہے کیونکہ تم ہی جانتی ہو بچوں کی پسند۔" روبی نے اب اسے آگے کیا۔ وہ مسکراتے ہوئے چائنیز کی طرف آئی۔

"ہیلو مس! کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ روزانہ تین ٹائم کھانے میں اسپیگٹی کھانا ہو تو ایک مہینے کے لیے یہ اسٹاک کافی ہے؟"

اس کے قریب کھڑے شخص نے بہت بے تکلفی سے دریافت کیا تھا۔ منیرہ نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

گلابی ڈوروں والی' صاف شفاف بچوں کی سی معصومیت رکھنے والی بڑی بڑی آنکھیں جن میں پھیلی حیرانی انہیں مزید غضب ناک بنارہی تھی۔ پھر اس نے ٹرالی کی طرف دیکھا' جس میں دس بارہ پیکٹ اسپیگٹی کے رکھے ہوئے تھے۔

"یہ بہت زیادہ ہیں مسٹر! کوئی بھی شخص روزانہ تین ٹائم کھانے میں اسپیگٹی نہیں کھا سکتا۔ یہ مزے دار ہیں مگر کوئی چیز کتنی ہی مزے دار کیوں نہ ہو' روزانہ تین ٹائم کھائی جائے تو اس سے دل اوب جاتا ہے۔ اور مزید یہ کہ ہر جانے انجانے سے بے تکلف ہونے اور مذاق کرنے کی عادت بھی خاصی خراب ہے۔" بے تاثر لہجے میں جواب دیتے ہوئے آخری جملہ اس نے مذمت آمیز انداز میں کہا۔

"کبھی کبھی یہ عادت خاصی فائدہ مند بھی ہوتی ہے۔" اس شخص نے فوراً" جواب دیا۔

"جی۔" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"میرا کہنے کا مطلب ہے میں پہلی بار شاپنگ کر رہا ہوں گھریلو خاص کر کچن کی چیزوں کا کچھ تجربہ نہیں۔ اب میں اندازہ لگالوں گا کہ کبھی کبھی اسپیگٹی کھانے کے لیے مجھے کتنے پیکٹ درکار ہوں گے ویسے میں بھی چائنیز کھانوں کا خاصا شوقین ہوں۔"

"جی اچھا!" منیرہ نے لفظوں کو خاصا دبا کر ادا کیا اور آگے بڑھ گئی۔

"سنیے پلیز۔" پیچھے سے اس کی پکار پر وہ دانت کچکچاتے ہوئے مڑی۔

"آپ کی آنکھیں بے حد منفرد اور حسین ہیں۔" حسب عادت اور حسب مزاج وہ یہ کہنا چاہتا تھا۔ مگر الفاظ اس کے لبوں تک نہ آسکے۔

"آپ کا بہت شکریہ۔" اس نے کھوئے سے انداز میں کہا تھا۔

منیرہ نے لوگوں کی موجودگی کے باعث اسے سخت سست سنانے سے پرہیز کیا اور روبی کی طرف آگئی۔

اسے وہ لڑکی کچھ منفرد سی لگی تھی۔ اس کی شکل و صورت میں انفرادیت تھی یا کچھ اور جس نے اسے اس لڑکی سے مخاطب ہونے پر اکسایا۔ کوئی بھی لڑکی پہلی نظر میں اسے متاثر کرتی تو وہ تعارف حاصل کرنے میں لمحہ نہ لگاتا۔

اپنی مطلوبہ چیزیں لینے کے بعد وہ میکرو سے نکلا اور گھر کی طرف جانے لگا۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس کے تصور میں بار بار منیرہ کی حیرانی بھری گلابی گلابی آنکھیں آتی رہیں۔ ممی اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ اور ان کے اندر موجود اشیاء دیکھ کر خاصا حیران ہوئیں۔

"انصر بیٹا یہ سب کیوں لے آئے ہو۔ اس مہینے کا سارا راشن تو میں ابھی تین دن پہلے لا چکی ہوں۔ اور یہ اسپیگٹی کے اتنے پیکٹ؟" وہ چیزوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ممی! ایئرپورٹ پر دوست کو ریسیو کرنے کے بعد نکلا تو یاد آیا کہ ٹائی لینی تھی' بس وہیں سے میکرو چلا گیا اور یہ بھی خرید ڈالے۔"

صوفے پر بیٹھے انصر نے ٹی وی کے چینل چینج کرتے ہوئے اطمینان سے بتایا۔ انصر کا سارا دھیان بظاہر ٹی وی کی طرف تھا۔ جہاں ریسلنگ چل رہی تھی۔ مگر اندرونی طور پر وہ ابھی بھی میکرو میں ہی تھا۔

اس لڑکی کے ساتھ بلا مقصد باتیں کرتا ہوا۔ اسے اس لڑکی کا نام تو معلوم ہو ہی گیا تھا جب ساتھ والی لڑکی نے اسے پکارا تھا۔ مگر نجانے کیوں وہ اس سے مزید تعارف حاصل کرنے کے لیے خود کو بے چین محسوس کر رہا تھا۔ کون تھی' کہاں رہتی تھی' کیا کرتی ہے۔ میرڈ ہے یا ان میرڈ۔ یہ سب سوال اس کے اندر اٹھ رہے تھے۔ اسی وقت اس کا سیل بجنے لگا۔ دانیال کا نمبر تھا۔ شاید گھر پہنچنے کے بعد وہ اسے کال کر رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کرنے سے پہلے ٹی وی کا والیوم کم کیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے کئی دن ادھر ادھر گھومتے ہوئے بلا ارادہ ہی وہ ہر لڑکی کے چہرے میں سے اس کا چہرہ کھوجتا رہا اور اپنی کیفیت پر حیران ہوتا رہا کہ آخر ایسا کیا تھا اس سادہ سی لڑکی کی شخصیت میں جس نے اسے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی زندگی میں ہزاروں لڑکیاں آئی اور گئی تھیں اور کئی ایسی لڑکیاں جن کے ساتھ اچھا خاصا وقت بھی گزارا تھا پھر بھی ان کے چہرے ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ مگر وہ لڑکی کیا تھی۔ اور اس کی آنکھیں۔

اسے ایسا محسوس ہوتا' اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں پہلی بار ایسی آنکھیں دیکھی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں خاص قسم کی بے نیازی' اداسی اور پاکیزگی تھی اور شاید یہ اس کی گہری جستجو کا ہی نتیجہ تھا کہ اس دن طارق روڈ پر ہفتہ کی شام گھومتے ہوئے وہ اسے اچانک ہی نظر آگئی۔ اس کے ساتھ آج بھی وہی والی لڑکی تھی جو اس دن میکرو میں اس کے ہمراہ تھی۔

وہ دونوں کپڑے کی دکان میں کھڑی تھیں اور کپڑا ہاتھ میں پکڑے آپس میں کوئی بات کر رہی تھیں۔ انصر کا دل یوں اسے اچانک سامنے پا کر بے ساختہ دھڑکا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ وہ کس بہانے اس لڑکی کے قریب جائے اور اسے مخاطب کرے۔ پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑے وہ اسے دیکھ رہا تھا جب اس کی نظر منیرہ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ایک نوجوان پر پڑی جو غیر محسوس انداز میں منیرہ پر اپنے موبائل لے یمرے کو فٹ کیے ہوئے تھا۔

پہلی نظر میں تو وہ نظر انداز کر گیا مگر پھر غور کرنے پر محسوس ہوا کہ وہ لڑکا منیرہ کی تصویریں لے رہا ہے۔ اگرچہ منیرہ نے اچھی طرح ماتھے تک اسکارف لپیٹ رکھا تھا۔ لیکن چہرہ واضح تھا۔ گول بیضوی چہرہ اور اس پر سجے خوب صورت نقوش' جاذب نظر اور دلکش تھے۔ خصوصاً" چہرے کی انفرادیت اور دودھیا چمکتی رنگت کسی کو بھی متوجہ کر سکتی تھی اور اس لڑکے کی حرکت انصر جیسے شخص کے لیے قابل مذمت یا معیوب نہیں تھی۔ مغربی ملک میں اس نے وہاں کے ماحول کو اپنا کر اپنی آزاد طبیعت کا ثبوت دیا تھا۔ مگر نجانے کیوں اس وقت اسے یہ منظر خاصا ناقابل برداشت لگ رہا تھا۔ ماتھے پہ بل چڑھاتے ہوئے اس نے رخ بدل لیا۔ ایک لمحے بعد ہی اسے ایک لڑکی کے زور سے بولنے کی آواز آئی تو وہ بے اختیار پلٹا۔

"بے ہودہ انسان! تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری تصویر لینے کی؟"

غیظ و غضب میں بولتے ہوئے اس نے اس لڑکے کے منہ پر زوردار چانٹا رسید کیا۔ آس پاس کے کئی لوگ متوجہ ہو گئے۔ وہ شاید جان گئی تھی کہ وہ لڑکا چپکے چپکے اس کی تصویریں اپنے موبائل سے لے رہا ہے اور یہ جانتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گئی تھی۔ اس کے ردعمل نے نہ صرف اس لڑکے کو حواس باختہ کر دیا بلکہ انصر بھی دم بخود تھا۔ اس کا سفید دودھیا چہرہ غصے سے لال ہو کر تمتما رہا تھا۔ صاف شفاف آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں کسی انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔

اس لڑکے نے ایک لمحے کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگنا چاہا مگر اگلے ہی لمحے منیرہ نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ پھر اس کے بالوں سے پکڑ کر اس کے سر کو زور دار جھٹکے دیے۔ وہ لڑکا بلبلا کر رہ گیا۔ موبائل اس کے ہاتھ سے گر کر زمین بوس ہو گیا تھا۔ جسے روبی نے تیزی سے آگے ہو کر قابو میں کر لیا تھا۔ منیرہ کا انداز ایسا جنونی

...میں کر رہا تھا۔
"منیرہ! بس کرو۔ چھوڑ دو اسے..... دیکھو کتنے لوگ اکٹھے ہو گئے اگر ان میں سے کسی نے ویڈیو بنا کر کسی چینل کو بھیج دی یا نیٹ پر اپ لوڈ کروادی تو زیادہ رسوائی ہے۔ بس چھوڑو اسے۔" روبی نے اس کے قریب جا کر اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے لڑکے کو چھوڑ دیا اور تیزی سے رش میں سے نکل گئی۔

انصر جو اس سارے واقعہ کا خاموش تماشائی تھا بلا ارادہ ہی ان کی گاڑی کا پیچھا کرنے لگا۔ جب منیرہ نے اپنے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو وہ قریب ہی سے گاڑی زن سے بھگا لے گیا۔

یہ اپر مڈل کلاس لوگوں کا ایریا تھا۔ منیرہ کا گھر دیکھ لینے کے بعد انصر کو اتنا تو اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی بہت امیر کبیر خاندان کی لڑکی نہ تھی۔ واپس گھر جانے تک وہ مسلسل اس لڑکی کے بارے میں ہی سوچتا رہا..... اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کو اس قدر مشتعل دیکھا تھا' وہ بھی ایسی بات پر جو آج کل کی سوسائٹی میں عام ہو چکی تھی۔ عورتوں کے بارے میں تو اس کی ایک رائے کسی اصول اور فارمولے کی طرح پکی ہو چکی تھی کہ وہ اپنے حسن کی تعریف کروانا پسند کرتی ہیں اور غیر لڑکوں کو اپنی جانب متوجہ کروانا لڑکیوں کی کمزوری ہے۔ مگر آج اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو چکا تھا۔

وہ بھی آج کے زمانے کی ہی لڑکی تھی جو غیر لڑکے کو اپنی تصویر لیتے دیکھ کر مشتعل ہو گئی تھی۔ اس کے لہجے کی غضب ناکی' آنکھوں کے شعلے' گالوں کی تمتماہٹ' ہاتھوں کا بے لحاظ ہو کر اٹھنا اور اندھا دھند اسے مارنا..... سارے منظر انصر کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

اس کی شدید خواہش تھی کہ کاش کبھی کوئی ایسی لڑکی بھی اس کے سامنے آئے جو غیر مرد کے متوجہ ہونے تعریف کرنے پر خوش ہونے خود پر فخر کرنے کے بجائے اسے اپنی عزت اور غیرت سے بھی منسلک کرے۔ اپنی تعریف کو اپنی کمزوری نہ بننے دے۔ ہر مرد کے ہاتھ میں کھلونا نہ بن جائے۔ اپنی نسوانیت کے وقار' شرم و حیا اپنی صنف کی آبرو کو اہم سمجھے۔

اس لڑکی کو جب پہلی بار اس نے دیکھا تھا تو اس سے دوستی کرنے کی خواہش ابھری تھی۔ آج دوسری بار دیکھا تھا تو فیصلہ بدل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

انگلش گانے کی دھن پر سیٹی بجاتا ہوا وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ "صاحبزادے! کہاں رہتے ہو سارا دن؟ کبھی آفس بھی چکر لگا لیا کرو۔ اصغر تو آج سارا دن فیکٹریوں کے ٹور پر رہا ہے ہم نے آفس کا کام ہی دیکھ لینا تھا۔" صدیق صاحب نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"اونہہ..... دیکھنا ہے اس نے آفس کا کام۔ واپسی کے لیے بے تاب ہوا پھرتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں آپ خود ہی اس کا رشتہ طے کر دیں۔ اسے تو ساری زندگی کوئی لڑکی پسند نہیں آتی۔"

اس کے بجائے ممتاز بیگم نے جواب دیا تھا۔ ساتھ ہی رائے بھی دی تھی۔

"ہاں تو بیگم لڑکی ڈھونڈنا اور سلیکٹ کرنا تو خواتین خاص کر ماؤں کا کام ہوتا ہے۔ آپ لڑکی پسند کر لیں میں تو خود کہتا ہوں۔ اب اسے نکیل ڈال دیں کافی عمر گزار لی آزاد رہ کر۔" چینل چینج کرتے ہوئے صدیق صاحب نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"سنو انصر! میں بالکل سنجیدہ ہوں آج میں اور تمہارے ڈیڈی اکرم صاحب کے ہاں ڈنر کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی بیٹی سونیا تعلیم مکمل کر کے یو کے سے واپس آئی ہے۔ اسی خوشی میں انہوں نے نزدیکی احباب کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ اگر مجھے سونیا پسند آئی تو میں اکرم اور ان کی مسز سے آج ہی رشتے کی بات کر آؤں گی۔"

ممتاز بیگم کا انداز غیر معمولی طور پر سنجیدہ اور دھمکی آمیز تھا۔ انصر کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

"اوہ..... تو آپ نے حتمی فیصلہ کر لیا۔" وہ ان کے قریب آیا۔

"دیکھیں ممی! دل سے دل کو کس طرح راہ ہوتی ہے۔ آج ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے اب شادی کر لینی چاہیے۔"

"کوئی لڑکی پسند کی؟" اس کی بات مکمل ہوتے ہی مہناز بیگم نے نہال ہوتے ہوئے پوچھا۔ صدیق صاحب کے چہرے کا تناؤ بھی خاصا کم ہوا۔

"جی لڑکی کو دیکھ کر ہی تو فیصلہ کیا ہے۔" انصر نے مسکراتے ہوئے اعتماد سے کہا۔

"کون ہے" کہاں ملی؟" ممی کا لہجہ پرشوق اور دوستانہ تھا۔

"ممی! میں اس کے بارے میں فقط یہ جانتا ہوں کہ اس کا نام منیرہ ہے۔ وہ ایک متوسط فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور...... اور ایک باکردار لڑکی ہے۔ باقی اس کی ایجوکیشن کیا ہے۔ عادت اور مزاج کی کیسی ہے۔ گھریلو ماحول کیسا ہے۔ یہ سب بعد میں معلوم ہو گا۔ آپ کو فی الحال صرف اتنا کرنا ہے کہ میرا رشتہ لے کر جانا ہے' ان کے گھر کا ایڈریس ہے میرے پاس۔ میں آپ کو دے دوں گا جب بھی آپ جانا چاہیں۔" انصر نے سنجیدگی سے بات مکمل کی تھی۔ دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! یہ کیا بات ہوئی کہ تم اس لڑکی کا صرف نام ہی جانتے ہو۔ کیا اس سے دوستی وغیرہ نہیں ہے؟" ممی نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"ممی اسے دیکھتے ہی ایسے لگا کہ مجھے اسی کی تلاش تھی۔" انصر کا لہجہ گمبھیر اور گہرا تھا۔ مہناز بیگم نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا پھر صدیق صاحب کی طرف۔

"بیٹا اگر وہ لوگ امارت میں ہم سے کم ہیں تو یہ کوئی قابل اعتراض یا ہتک آمیز بات نہیں ہے۔ رشتہ کرتے وقت ہم نے تین باتوں کا خیال رکھنا ہے۔ پہلی تو یہ کہ وہ ہمارے ہم مذہب یعنی مسلمان ہوں۔ دوسرے خاندانی لوگ ہوں' باعزت اور اچھی شہرت رکھنے والی فیملی ہو اور تیسری بات یہ کہ ایجوکیٹڈ فیملی ہو۔ باقی ہمیں تمہاری پسند پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا بلکہ اعتماد ہے کہ تم اپنے لیے بہترین جیون ساتھی کا انتخاب کرو گے۔"

صدیق صاحب نے شفقت بھرے انداز میں بات کر کے ایک طرح سے اس کی پسند کو قبول بھی کیا اور دوسری طرف اسے محتاط رہنے کا بھی اشارہ کر دیا۔ مگر وہ ابھی اس کی محبت میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا اسے ان باتوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ اس بات کا ادراک اسے ابھی ابھی ہوا تھا۔

"ممی! آپ جائیں گی تو ان تین باتوں کا اندازہ لگا لیں گی کہ ان میں ہیں یا نہیں۔" وہ ممی سے سنجیدہ انداز میں مخاطب ہوا۔

"کیوں نہیں بیٹا! کل سنڈے ہے۔ میں کل ہی جاؤں گی اور ان لوگوں کے رہن سہن کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام تو نہیں۔"

ممی نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

اک طویل عرصے بعد اسے وہ لڑکی اس لحاظ سے پسند آئی تھی کہ اسے جیون ساتھی بنایا جائے۔ اس کے کردار کی مضبوطی ہی اس کے وفاشعار ہونے کا ثبوت تھی۔ ایسی ہی لڑکی مستقبل میں شوہر کی عزت پر بھی حرف نہ آنے دے گی اپنے کسی بھی عمل سے شوہر کا سر نہ جھکنے دے گی۔ اسے کسی دوست کے منہ سے یہ نہ سننا پڑے کہ یہ لڑکی اس کی بھی گرل فرینڈ رہ چکی ہے اور نہ ہی وہ کسی لڑکے کا تعارف اس سے اپنے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے کروائے۔

آئینے کے سامنے کھڑا وہ اپنے چہرے میں اس کا عکس ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک اس کا سیل فون بجنے لگا۔

"ہائے حذیفہ! کیسے ہو یار! اس دن کے بعد دکھائی ہی نہیں دیے۔" بے تکلفی سے بولتے ہوئے شکوہ بھی کر دیا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں..... بس مصروفیت کی وجہ سے دوبارہ رابطہ نہیں کر سکا۔ سناؤ کیا ہو رہا ہے آج کل کہیں واپسی کا ٹکٹ تو نہیں کٹا لیا۔"

"نہیں یار! فی الحال تو ملتوی کر دیا۔ مسز کو ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔" انصر نے ٹھیک وجہ بتائی۔

"واؤ امیزنگ تو تم نے بھی فیصلہ کر ہی لیا کوئی لڑکی بھی شادی کے لیے پسند آئی یا معاملہ ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔" حذیفہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل۔ لڑکی کو دیکھ کر ہی شادی کا خیال آیا۔ بس دعا کرنا' وہ مان جائے۔" انصر نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو حذیفہ ہنس کر بولا۔

"یار! کس لڑکی میں ہمت ہے تم سے شادی سے انکار کرے..... میں نے تو آج تک لڑکیوں کو تمہارے لیے روتے دیکھا ہے۔ بائی داوے ہے کون..... کیا اس سے دوستی نہیں ہوئی جو تم قبول ہونے کے لیے دعائیں کرا رہے ہو؟" حذیفہ نے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا۔

"نہیں یار! دوستی کرنے کی کوشش کی تو مارا جاؤں گا' لہٰذا اس سے شادی کا ارادہ کر لیا ہے۔" انصر نے سابقہ انداز میں کہا تو حذیفہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں ایسی لڑکی مل گئی جس کی تمہیں تلاش تھی۔"

"ہاں حذیفہ! اسے دیکھ کر ایسے لگا جیسے وہی میری منزل ہے۔ مجھے اسی کی تلاش تھی۔ یقین کرو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا سوائے نام کے میں نے زندگی پہلی بار کوئی باحیا' باکردار اور شفاف لڑکی دیکھی ہے اور اس کی پاکیزگی اور اعلیٰ کردار کی مظہر اس کی آنکھیں دیکھی ہیں۔" انصر جیسے کھوئے کھوئے سے انداز میں بول رہا تھا۔

"اچھا کیا نام ہے اس کا؟" حذیفہ نے کچھ رشک سے پوچھا تھا۔

"منیرہ۔" انصر نے فوراً" بتایا تھا۔ دوسری طرف حذیفہ کے ہاتھ سے موبائل گر کر گود میں آ گیا تھا..... وہ بری طرح چونکا تھا۔ کانپتے دل کے ساتھ اس نے موبائل اٹھایا تھا۔ جس میں سے انصر کی ہیلو ہیلو کی آواز آ رہی تھی۔

"انصر! میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں او کے پھر بات کریں گے ابھی مجھے امی جان کا بلاوا آیا ہے۔ میں ان کے پاس جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔"

انصر کا جواب سنے بنا حذیفہ نے کال منقطع کی۔

اسے ساڑھے پانچ سال قبل کی ایک کال یاد آ گئی جو پاکستان آنے سے پہلے اس نے گھر پر کی تھی۔

"امی جان! کل دوپہر کی فلائٹ ہے میری ان شاء اللہ کل رات میں آپ کے پاس ہوں گا۔"

اس نے بہت خوشی سے فون پر امی کو بتایا تھا۔

"بیٹا! اب تو خوشی کے مارے رات بھر نیند بھی نہیں آئے گی۔ اور پتا ہے، ہم نے تمہارے لیے لڑکی منتخب کر لی ہے۔ نیک سیرت' صوم و صلوٰۃ کی پابند' پاک باز' باحیا' باکردار بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ ایسی کہ سب رشک کریں گے۔" میمونہ بیگم لہجے میں فخر لیے ممتا بھری آواز میں بول رہی تھیں۔

"اُفوہ امی جان ابھی میں آیا بھی نہیں ہوں اور لڑکی آپ پہلے ہی پسند کر چکی ہیں۔ یہ تو بتا دیں' ہے کون؟ نام کیا ہے؟" حذیفہ نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا۔

"تمہاری پھوپھو کی بیٹی منیرہ....." میمونہ بیگم نے بہت نرم اور شیریں لہجے میں بتایا۔

حذیفہ کو ایسا لگا جیسے کرنٹ بھرے لفظوں نے اس کی سماعت کو چھوا ہے یا اسے سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ وہ اس سے تقریباً" دس سال چھوٹی تھی اور اسکول میں پڑھتی تھی۔ وہ اس کی شکل و صورت کو ذہن میں واضح کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب اچانک ہی کال ڈس کنکٹ ہو گئی۔ دوبارہ کال ملانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور اپنی ہونے والی منگیتر کے بارے میں سوچنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"مبارک ہو' مبارک ہو!" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے گھنے دراز بالوں کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھی جب معیز لہک لہک کر کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ہاتھ روک کر اس نے کچھ تعجب سے معیز کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر بلا کا اطمینان اور خوشی رقصاں تھی۔

"کس بات کی مبارک باد دے رہے ہو۔" اس نے بلا ارادہ پوچھا۔

"اس بات کی' حذیفہ بھائی واپس آچکے ہیں۔"

"اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے وہ پڑھائی کے لیے گئے تھے۔ پڑھائی مکمل ہوئی تو لوٹ آئے۔" اگرچہ وہ خاص بات سمجھ چکی تھی تاہم بے نیازی سے کہا۔

"اچھا تو یہ بات بھی خاص نہیں کہ ان کے آنے کی خوشی میں کل شام کو میمونہ آنٹی نے سب کو پارٹی دی ہے اور اسی پارٹی میں تمہیں حذیفہ بھائی کے نام کی اور حذیفہ بھائی کو تمہارے نام کی انگوٹھی پہنا دی جائے گی۔" منیرہ کے لبوں پہ بے ساختہ تبسم پھیلا' وہ اپنے تاثرات معیز سے چھپانا چاہ رہی تھی مگر چھپا نہ پائی۔

"اوں ہوں۔ اب مان گئیں نا خاص بات کو؟" معیز نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا تو وہ بری طرح جھنجلائی۔

"معیز باز آجاؤ اپنی حرکتوں سے ورنہ میں پٹائی کر دوں گی۔ سب لڑکے لڑکیوں کی منگنیاں' شادیاں ہوتی ہیں اس میں کون سی انوکھی بات ہے۔" اپنی اندرونی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے وہ جھنجلا کر بولی۔

اپنے فیلو' کلاس فیلو اور چچا زاد کزن ہونے کی بدولت اگرچہ معیز سے وہ کافی بے تکلف تھی۔ دونوں کی آپس میں خوب بنتی تھی مگر اس وقت تو وہ جیسے خود سے بھی شرما رہی تھی۔ معیز زور سے ہنسا اور پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو منیرہ ..... میں تو صرف یہ جاننے کے لیے تمہیں مبارک دے رہا تھا کہ تم اس رشتے پر خوش بھی ہو یا نہیں۔"

"تو تمہیں کیا معلوم ہوا؟" منیرہ کا سوال بے ساختہ تھا۔

"تمہارا چہرہ تو بتا رہا ہے' تم بہت خوش ہو۔ اچھی بات ہے مشرقی لڑکیاں یونہی بڑوں کے فیصلوں پر رضا مند ہو جاتی ہیں۔ میں خود بھی بہت خوش ہوں۔" معیز نے بزرگوں کے سے انداز میں کہا۔

منیرہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"تم کیوں خوش ہو؟" اس کا انداز تفتیشی تھا۔

"بھئی تمہارے ساتھ ہونے والے مقابلوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ میمونہ آنٹی کا پروگرام ہے کہ وہ ایک سال کے اندر اندر حذیفہ بھائی کی شادی کر دیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک سال بعد اسٹوڈنٹ سے ہاؤس وائف بن جاؤ گی۔ پھر کوئی میرا مقابلہ تم سے نہیں کرے گا اور نہ ہی تم سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کے لیے مجھے راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھنا پڑے گا۔" معیز نے اطمینان سے اپنی خوشی کی وجہ بتائی۔

"اونہہ منہ دھو رکھو جناب! تم کیا سمجھتے ہو میں شادی کے بعد پڑھائی چھوڑ دوں گی۔ امپاسبل' ماسٹر کی ڈگری لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھنے والی ..... میں پڑھائی جاری رکھوں گی اور دیکھنا ہمیشہ کی طرح تم سے بہتر کارکردگی دکھاؤں گی۔" بالوں کی چوٹی بنا کر وہ پرعزم انداز میں بولی۔

"اس ..... تم تو میری ڈبل بے عزتی کرواؤ گی سب کہیں گے تمہارے جتنی ہے۔ شادی شدہ بھی ہو گئی اور پڑھائی کے میدان میں بھی پیچھے چھوڑ رہی ہے۔ بھئی اب کوئی جگہ تو صرف میرے لیے رہنے دو۔ زندگی کے سارے مرحلے ایک ساتھ طے نہیں کرنے چاہئیں۔" معیز نے بے چارگی سے کہا اور وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز سب ہی ہنسی خوشی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ شام کو مغرب کے بعد روانہ ہونا تھا۔ منیرہ پہلے بھی کبھی کبھار ہی ماموں کے ہاں جایا کرتی تھی۔ مگر آج شرم اور جھجک کے مارے پاؤں نہیں اٹھائے جا رہے تھے۔ وہ عجیب سے احساسات اور جذبات سے دوچار تھی۔

حذیفہ اسے پسند تھا۔ کزن اور بڑے بھائی کی حیثیت سے وہ بہت فخر سے اپنی فرینڈ کے ساتھ اس کی باتیں کرتی تھی اور یہ سب باتیں کرتے ہوئے اس کے کبھی وہم و گماں میں بھی نہیں آیا تھا کہ ایک دن وہ اس کے جیون ساتھی کے حوالے سے سامنے آئے گا۔

وہ منیرہ سے تقریباً" دس گیارہ سال بڑا تھا۔ اسے یاد تھا جب وہ چھوٹی تھی تو حذیفہ اسے اپنے پیچھے بائیک پہ بٹھا کر آئس کریم کھلانے جاتا تھا۔ جب اس نے پانچویں کلاس میں پہلی پوزیشن لی تھی تو حذیفہ نے اسے بہت خوب صورت ڈانسنگ ڈول گفٹ کی تھی۔ جب وہ انگلینڈ گیا تھا تب منیرہ میٹرک میں تھی۔ اس نے جب منیرہ سے پوچھا تھا کہ وہ اس کے لیے انگلینڈ سے کیا بھیجے تو اس نے فوراً" جواب دیا تھا چاکلیٹ اور ڈائری ..... جو اسے تقریباً" چار ماہ بعد مل بھی گئے تھے۔ وہ اسے ہمیشہ بچوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔

دونوں کے درمیان عمر کا فرق تھا۔ مگر منیرہ میمونہ بیگم کو ایسی بھائی کہ انہوں نے اس فرق کو نظر انداز کر کے اپنی نند کلثوم بیگم سے اپنا مدعا بیان کیا۔ پہلے تو وہ کافی حیران ہوئیں' تاہم بعد میں سوچا تو انہیں حذیفہ کے ساتھ اپنی بیٹی کا مستقبل روشن نظر آیا سو انہوں نے بھی عمر کے فرق کو درخور اعتنا نہ جانا۔ بات چلی اور پھر سب کی رضا مندی سے رشتہ طے ہو گیا جس کی باقاعدہ رسم آج ہونا تھی۔

جب وہ لوگ پہنچے تقریباً" سارے مہمان آچکے تھے۔ میمونہ بیگم اور باقی گھر والوں نے بہت گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا تھا۔ منیرہ بظاہر بہت پراعتماد نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اندر ہی اندر سمٹی جا رہی تھی۔

اس نے گہرے نیلے رنگ کا سلک کا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ جس پر سلور کلر کا کام ہوا تھا۔ میچنگ جیولری اور میچنگ شوز پہن رکھے تھے۔ بلاشبہ وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ شازیہ اور نازیہ نے اسے خصوصی پروٹوکول دیا۔

حذیفہ ڈرائنگ روم میں اپنے دوستوں سے مل کر ہال میں آیا تو نئے آنے والے مہمان بڑے والہانہ انداز میں اس سے ملے۔ کلثوم بیگم اور باقی سب بھی بہت محبت سے ملے۔ دائیں طرف ایک کونے پر وہ جھینپی جھینپی ۔۔۔ سی کھڑی تھی۔ حذیفہ کی نظر اس کی جانب مڑی اور پھر سرتاپا اس کا جائزہ لینے لگی۔ وہ پہلے سے کافی بدل چکی تھی۔

لمبا قد' نازک سا پتلا سا سراپا..... گوری شہابی رنگت بڑی بڑی حیران سی نظریں اور مسکراتے لب۔ چہرے پہ بلا کی معصومیت اور سادگی' نوخیز پنے کی شگفتگی اور تازگی حذیفہ کے دل کو بے ساختہ خوشی محسوس ہوئی۔ یہ کھلتی نوخیز کلی اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ اس کی ہونے والی تھی۔

اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسی چمک آئی جس نے منیرہ کو بھی متوجہ کر لیا۔ حذیفہ کو یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ اس کی یہ ادا حذیفہ کو بے حد بھائی۔

سب کے درمیان بھی وہ الگ تھلگ لگ رہی تھی۔ اور جب انگوٹھی پہنانے کا مرحلہ آیا تو دونوں نے شادولوں کے ساتھ ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی۔

تقریب بخوبی اختتام پذیر ہوئی اور ساتھ ہی مہمان بھی رخصت ہونا شروع ہوئے۔

منیرہ یوں تو کبھی بھی ماموں کے گھر سے خالی ہاتھ نہیں گئی تھی مگر آج جو کچھ ہمراہ لیے ان کے گھر سے نکلی' وہ کبھی پہلے نہیں ملا تھا۔ بہت سے ارمان' بہت حسین خواب اور نئی آرزوئیں امنگیں ساتھ لیے اس نے ماموں کے گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ وہ خوش تھی اور اپنی قسمت پر بے حد نازاں بھی۔ گھر آتے ہی نماز عشاء کے بعد اس نے شکرانے کے دو نفل بھی ادا کیے۔

☼ ☼ ☼

رحیم حسن اور کریم حسن' علیم حسن کے بیٹے تھے۔ کلثوم اور عظمیٰ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ گاؤں میں ہائی اسکول میں ماسٹر تھے۔ بہت امیر کبیر تو نہ تھے مگر بہت باعزت اور خوشحال زندگی گزر رہی تھی۔ انہوں نے چاروں بچوں کو تعلیم دلائی تھی۔ دونوں بیٹیوں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ رحیم حسن نے بی اے کے بعد گاؤں ہی میں ایک جنرل اسٹور اور ساتھ

میں پی سی او کھول لیا۔ آمدنی میں اضافہ ہوا تو والدین نے فوراً" شادی بھی کردی۔ وہ ابھی بھی اسی گاؤں میں تھے جو اب قصبے کی شکل اختیار کرچکا تھا کیونکہ وہاں جدید زمانے کی کافی سہولیات پہنچ چکی تھیں۔ جنرل اسٹور کے ساتھ انہوں نے ایک میڈیکل اسٹور بھی کھول لیا تھا' جو آگے ان کے بیٹے ہی سنبھال رہے تھے۔

علیم حسن کے بچوں میں سب سے قابل سب سے چھوٹے بیٹے کریم حسن تھے۔ وہ بچپن ہی سے ہر کام میں محنت کرنے کے عادی تھے اور پڑھائی میں تو انہوں نے خوب جی لگایا۔ تعلیم کے بعد انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا ایک پرائیویٹ کمپنی میں انہیں اچھے عہدے پر جاب ملی۔ اور پھر چند ہی سالوں میں وہ اسی فرم میں پارٹنر ہوگئے۔ اسی دوران ان کی شادی میمونہ بیگم سے ہوئی جو عادات و اطوار کی بہت اچھی ثابت ہوئیں۔

کلثوم اور عظمیٰ کی شادی ایک ہی گھر میں تایا زاد کزنز سے ہوئی۔ دونوں بھائی گورنمنٹ ملازم تھے۔ کلثوم کے شوہر عباس احمد واپڈا کے محکمے میں ایک مناسب پوسٹ پر تھے اور عظمیٰ کے شوہر ریاض احمد محکمہ کمیونیکیشن میں تھے۔ بہنیں ابتدا میں ایک ہی گھر میں رہیں۔ مگر چند سالوں بعد جب بچے ہوئے' ذمے داریاں بڑھیں تو دونوں نے اپنے اپنے پورشن الگ کر لیے۔ ان کے گھرانے کا شمار مڈل کلاس گھرانے میں ہوتا تھا۔ وہ سفید پوش اور خوددار لوگ تھے۔ بچوں کے اخراجات اور ان کی اچھی تعلیم کے لیے دونوں بہنوں کو اکثر و بیشتر اپنا پیٹ کاٹنا پڑا۔ کافی تنگی اور غریبی کی حالت میں بھی دونوں بہنوں نے اپنا بھرم نہیں جانے دیا تھا۔

کلثوم بیگم کے چار بچے تھے۔ بڑے دونوں بیٹے روحیل اور سہیل اور پھر منیرہ اور صغیرہ تھیں۔

عظمیٰ کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی روبی جو سہیل سے ایک سال چھوٹی تھی اور بچپن ہی میں اس سے منسوب بھی ہوگئی۔ پھر معیز تھا جو منیرہ کا ہم عمر تھا اور ایک ماہ ہی منیرہ سے بڑا تھا۔ پھر وقاص تھا۔

دونوں بہنوں نے اپنے بچوں کی تربیت اخلاقی اقدار پر مبنی اصولوں پر کی تھی۔ اور بچوں نے اپنے والدین کی تربیتوں کا اثر بھی خوب لیا تھا۔ روحیل اور سہیل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی انہیں جابز بھی مل گئیں روحیل جونہی الیکٹریکل انجینئر بنا' کلثوم بیگم نے اپنی کزن کی بیٹی فائزہ سے اس کا بیاہ کردیا اور شادی کے کچھ ہی عرصے بعد روحیل اپنی بیگم کے ساتھ اس فلیٹ میں شفٹ ہوگیا جو اسے کمپنی کی طرف سے ملا۔

سہیل کو بینک میں منیجر کی جاب مل گئی تھی۔ کلثوم بیگم آج کل روبی کو بھی گھر لانے کے چکروں میں تھیں کہ جب بالکل اچانک میمونہ بیگم نے منیرہ کو حذیفہ کے لیے مانگ لیا۔ دونوں میں نند اور بھابھی کی روایتی چپقلش کبھی بھی نہیں رہی تھی وہ دونوں کبھی کبھار بھائی کے ہاں جاتیں تو میمونہ بیگم بہت خوشی سے ملتیں اور جتنی دیر بھی وہ وہاں ٹھہرتیں یا ان کے بچے وہ کبھی بھی تنگ نہ پڑتیں۔

ان کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑا حذیفہ پھر شازیہ اور سب سے چھوٹی نازیہ۔ بچے بھی ماں کی طرح خوش اخلاق اور ملنسار تھے۔ کلثوم بیگم کو اپنی بھابھی میمونہ بہت پسند تھیں۔ مگر انہوں نے کبھی بھی نہ سوچا تھا کہ یہ رشتہ مزید مضبوط ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں بچوں کی عمروں میں واضح تفاوت اور عدم توازن تھا اور دوسری وجہ رہن سہن میں فرق تھا۔ کریم حسن دو کنال کے گھر میں رہتے تھے۔ رہن سہن' اٹھنا بیٹھنا امیرانہ تھا۔ گھر میں نوکر چاکر بھی تھے گاڑیاں بھی..... پر آسائش زندگی گزار رہے تھے۔ جبکہ کلثوم بیگم دس مرلہ کے گھر میں رہتی تھیں۔ جہاں کبھی اپنی تنگی دیکھنا پڑی تو کبھی اچھے دن..... روحیل اور سہیل کے برسرِ روزگار ہونے کے بعد گھر کے حالات میں بہت خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اخراجات بھی بڑھے تاہم ابھی بھی ان کا اور کریم حسن کے گھرانے کا مقابلہ نہیں تھا۔ اس سب کے باوجود میمونہ بیگم کا منیرہ کے لیے جھولی پھیلانا کلثوم بیگم کے لیے بہت بڑی

بات تھی۔ حذیفہ انہیں ہر لحاظ سے پسند تھا۔ سوائے اس بات کے کہ وہ عمر میں منیرہ سے گیارہ سال بڑا تھا۔ مگر یہ بھی کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس کی وجہ سے انکار کیا جاتا۔ حذیفہ جیسا خوبرو' اعلا تعلیم یافتہ اور کاروباری لڑکا داماد کی حیثیت سے بھلا کس کو ناپسند ہوتا اور سب سے بڑھ کر وہ ان کا سگا بھتیجا تھا۔

سب سے مشورے کے بعد باہمی رضامندی سے انہوں نے رشتہ قبول کیا تھا اور بہت خوش تھیں۔

منیرہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ وہ اور معیز ایک ہی کلاس میں تھے۔ بچپن ہی سے ان دونوں کا مقابلہ چلتا آرہا تھا جو آج بھی جاری تھا۔ منیرہ کی پوزیشن اور نمبر ہمیشہ نمایاں ہوتے جبکہ معیز پڑھائی سے کچھ لاپروائی برتتا' اس کے باوجود بھی اچھے نمبر لے لیتا۔ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ ہی رہے تھے۔ لہٰذا دونوں کی آپس میں بنتی بھی خوب تھی۔ آج کل دونوں ایف ایس سی پری انجینئرنگ کے فائنل ایگزام کی تیاری کر رہے تھے۔



"یو ویلکم مائی سن..... آؤ آؤ۔" آفس کے دروازے پر دستک کی آواز سن کر کریم حسن نے فائل پر سے سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور حذیفہ کو سامنے پا کر گرم جوشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے باہیں پھیلا کر بیٹے کو خوش آمدید کہا۔ حذیفہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور باپ کے سینے سے لگ گیا۔

"آج تمہیں اپنے آفس میں دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے میری برسوں کی تھکن اتر گئی۔ چلو' آؤ میں تمہیں اپنے سارے اسٹاف سے ملواتا ہوں۔"

دونوں باپ بیٹا آفس سے نکل کر باہر آئے۔ سب سے پہلے ریسپشنسٹ سے تعارف کروایا گیا۔ پھر منیجر کے دفتر کا رخ کیا گیا اور سب سے آخر میں سیکرٹری کے آفس میں وہ لوگ آئے۔

"بیٹا! یہ آپ کی سیکرٹری ہیں۔ مس ماہم نواز اور مس ماہم! اب یہ آپ کے باس ہیں مسٹر حذیفہ حسن!" کریم حسن نے تعارف کروایا۔

"یو ویلکم سر۔" شیریں لہجے میں بولتے ہوئے ماہم نے اپنا سپید نرم گداز ہاتھ آگے بڑھایا۔ حذیفہ نے سرسری سے انداز میں اس سے ہاتھ ملایا تاہم اس لڑکی میں کچھ ایسی بات تھی کہ لمحہ بھر کے لیے وہ اس سے نظر نہ ہٹا سکا۔

ہلکے براؤن رنگ کی ٹی شرٹ کے نیچے گہرے براؤن رنگ کی لیڈیز پینٹ پہن رکھی تھی۔ کندھوں تک آتے نفاست سے کٹے بال بے حد ریشمی اور چمک دار تھے۔ اس کے بالوں اور آنکھوں کے رنگ میں فرق تھا۔ بال لائٹ براؤن اور سبز آنکھیں..... اگرچہ وہ پاکستانی لڑکی تھی اور پاکستان میں ہی رہائش پذیر تھی۔ مگر اس کے ہر انداز میں مغربیت جھلک رہی تھی۔ اس کا یہ انداز حذیفہ کو کچھ ناگوار سا لگا۔

یہ آج آفس میں اس کا پہلا دن تھا۔ کریم حسن نے بہت محنت سے یہ سب اسٹیبلش کیا تھا اور ہر کام بہت طریقے سلیقے سے کیا ہوا تھا۔ کسی بھی پروجیکٹ میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ اس کامیاب اور صاف ستھرے کاروبار کو سنبھالنا اس کے لیے قطعاً" مشکل نہیں تھا۔ بلکہ اب اسے اس کاروبار کو مزید ترقی کے راستے دکھانے تھے۔ اس کے لیے حذیفہ کو اپنے باپ جتنا ہی قابل ہونا تھا۔ اور اسے اپنے باپ پر ناز تھا۔ چند ہی دنوں میں اس نے کافی کچھ سمجھ لیا تھا اور بہت ذمہ دارانہ انداز میں ایم ڈی کے فرائض نبھا رہا تھا۔



رات کو وہ اپنے بیڈ روم میں آیا تو کچھ دیر کمرے میں ہی ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ یوں تو کئی بار اسے خیال آیا تھا کہ منیرہ سے بات چیت کرے۔ مگر ایک عجیب سی جھجک مانع تھی۔ مگر آج میمونہ بیگم کے کہنے پر اس کے شوق اور خواہش کو پر لگے تھے۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملانے لگا۔ منیرہ کے پاس اپنا ذاتی موبائل نہیں تھا۔ پی ٹی سی ایل پر نمبر ملایا۔ کلثوم بیگم نے فون اٹھایا تھا۔

"السلام علیکم پھوپھو جان۔" اس نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا تو کلثوم بیگم نے بھی بڑی شفقت سے جواب دیا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو حذیفہ بیٹا... آتے ہی مصروفیات پال لیں کہ آنا تو در کنار فون بھی اتنے دنوں بعد کیا۔" ان کے لہجے میں پیار بھرا شکوہ تھا۔

"بس پھوپھو جان... مصروفیت ہی آڑے آ گئی۔ آپ سنائیں باقی سب کیسے ہیں؟" اس نے کچھ شرمندگی کا تاثر دیتے ہوئے پوچھا۔

"پھوپھو جان اگر اجازت دیں تو منیرہ سے بات کر لوں!" چند رسمی باتوں کے بعد وہ مطلب کی بات پر بھی آہی گیا۔

"آں... ہاں کیوں نہیں... وہ اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہے۔ تم ہولڈ کرو میں بلاتی ہوں اسے۔" کلثوم بیگم نے کہا اور ریسیور رکھ کر منیرہ کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ چند لمحوں بعد اسے فون پر منیرہ کی جھینپی جھینپی سی آواز آئی۔

"السلام علیکم..."

"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟" حذیفہ نے دھیمی اور گمبھیر آواز میں پوچھا۔ وہ پہلے بھی اکثر حذیفہ سے فون پر باتیں کر لیا کرتی تھی مگر اس وقت وہ اس قدر کنفیوز تھی کہ ہاتھ میں پکڑا ریسیور بھی اسے کانپتا محسوس ہو رہا تھا اور ٹانگوں میں بھی ہلکی ہلکی لرزش محسوس ہو رہی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں! آپ کیسے ہیں!"

"میں بھی ٹھیک ہوں اور تمہیں مس کر رہا ہوں۔" حذیفہ نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ منیرہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب اسے کیا کہنا چاہیے۔

"اچھا یہ بتاؤ کیا ہو رہا ہے۔ کیا مصروفیات ہیں آج کل۔" حذیفہ نے پوچھا۔

"بدھ کو میرا پہلا پیپر ہے فائنل ایگزام کا... اس کی تیاری کر رہی ہوں۔ دعا کیجیے گا حذیفہ بھائی میرے نمبر بہت اچھے آئیں اور معیز سے تو ضرور اچھے آئیں۔" حذیفہ کا یہ سوال شاید اسے معقول لگا تھا۔ لہٰذا فوراً جواب دیا اور ساتھ ہی اپنے اور اس کے درمیان قائم نئے رشتے کو بھی بھول گئی۔

"حذیفہ بھائی... کیا اب بھی مجھے بھائی بولو گی۔" حذیفہ نے چونکتے ہوئے کچھ خفگی سے کہا۔

"اوہ... نن... نہیں وہ... میں بھول گئی۔ وہ پہلے آپ کو۔ شاید اسی لیے یہ ہی لفظ منہ پر آ گیا۔ آپ مائنڈ کر گئے؟" منیرہ کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

"نہیں بالکل مائنڈ نہیں کیا۔ آئی انڈر اسٹینڈ۔ ابھی وقت تو لگے گا رشتے کی نوعیت کو سمجھنے میں۔ کیا خیال ہے پرسوں میرے ساتھ باہر چلو گی گھومنے پھرنے۔ لنچ باہر ہی کریں گے۔"

منیرہ کے لیے یہ بات خوش کن تھی۔ وہ بہت شوقین تھی گھومنے پھرنے کی۔ مگر اس وقت وہ پہلے کی طرح فوراً "پرجوش انداز میں ہاں کہہ سکی۔

"میں امی سے پوچھوں گی اگر انہوں نے پرمیشن دی تو ضرور جاؤں گی۔" اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"اوکے پھوپھو تو اجازت دیں گی ہی... بس تم تیار رہنا۔ پھر پرسوں ملاقات ہو گی۔" حذیفہ کے انداز میں جلدی تھی۔

"جی۔" منیرہ نے یک لفظ میں جواب دیا۔

"اچھا پھر میرے فرینڈ کی کال آ رہی ہے۔ خدا حافظ۔"

حذیفہ نے فون بند کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے خدا حافظ کہا تو جواباً" اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

انصر نے گاڑی ڈارک براؤن کلر کے گیٹ کے سامنے روکی تو مہناز بیگم نے اس کی جانب دیکھا۔

"یہیں اترنا ہے ماما! یہ سامنے والا گیٹ ہے۔" انصر نے ان کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بتایا اور ساتھ ہی اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔ مہناز بیگم بھی گاڑی سے نیچے اتر آئیں۔ ایک سرسری سی نظر سامنے نظر آتی عمارت اور آس پاس کے مکانوں پر ڈالی۔

مہناز بیگم جدی پشتی رئیس زادی تھیں۔ انہوں نے تو کبھی وہم و گماں میں بھی نہ سوچا تھا کہ اپنے ڈیلے 'پرنس کی شان والے بیٹے کے لیے کسی مڈل کلاس گھرانے کا دروازہ کھٹکھٹائیں گی۔ مگر آج بیٹے کی پسند کو معتبر سمجھتے ہوئے اور اس کی خواہش کی تکمیل کے لیے یہ ناممکن کام بھی وہ ہنسی خوشی کر رہی تھیں۔

انصر کے دوبار ڈور بیل بجانے کے بعد دروازہ کھل چکا تھا۔ دروازہ کھولنے والی روبی تھی۔ انصر کی نگاہوں میں فوراً" شناسائی کی رمق ابھری۔ یہ وہی تھی جو اس دن طارق روڈ پر منیرہ کے ساتھ تھی اور میکرو میں بھی شاید وہی تھی۔

"جی فرمائیے؟" اس نے تعجب سے دریافت کیا۔

"میں انصر ہوں اور یہ میری ممی ہیں۔ یوں دروازے پہ کھڑا اپنا اتنا ہی تعارف کروا سکتا ہوں۔ فی الحال آپ ہمیں اجنبی مہمان ہی سمجھ لیں کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟"

روبی اس پراعتماد سے شخص کی باتوں پر الجھ سی گئی۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو شاید وہ اب تک دروازہ بند کر کے اندر اطلاع کرنے جا چکی ہوتی مگر اس شخص کے ساتھ کھڑی ماڈرن سی اور دھیمی مسکان والی خاتون کو دیکھتے ہوئے وہ ایسا نہ کر سکی۔

"جج... جی آئیے۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے انہیں دعوت دی۔

انصر نے فوراً" اندر قدم رکھا۔ مہناز بیگم اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے اس کے پیچھے داخل ہوئیں۔ روبی انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باقی افراد کو مطلع کرنے چلی گئی ان اجنبی مہمانوں کے بارے میں... کچھ ہی دیر بعد کلثوم بیگم اور سہیل حیران سے

ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

"السلام علیکم بہن۔" مہناز بیگم فوراً" اٹھ کر کھڑی ہوئیں اور انکساری سے سلام کیا۔ جس کا انہیں جواب بھی ملا انصر اور سہیل نے بھی ہاتھ ملایا۔

"بیٹھیے۔" کلثوم بیگم نے کہا تو مہناز بیگم مسکراتے ہوئے بیٹھ گئیں۔ وہ دونوں ماں بیٹا بھی بیٹھ چکے تو مہناز بیگم شیریں آواز میں گویا ہوئیں۔

"بہن! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہم آپ لوگوں کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ مگر میں آپ کو زیادہ دیر تجسس میں رکھنا نہیں چاہوں گی میں ان فیکٹ آپ کی بیٹی سے ملنے آئی ہوں۔ بلکہ اس کے لیے سوالی بن کر آئی ہوں۔"

"جی۔" کلثوم بیگم نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر سہیل کی طرف دیکھا اس کے تاثرات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

"میرے شوہر کامیاب بزنس مین ہیں۔ ہم لوگ ڈیفنس میں رہتے ہیں۔ میرے دو ہی بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا میرڈ ہے۔ یہ چھوٹا ہے انصر..... پچھلے کچھ سالوں سے انگلینڈ میں تھا۔ ابھی حال ہی میں واپس آیا ہے اور میری شدید خواہش ہے میں اس کی شادی کردوں۔ لڑکیاں تو بہت دیکھیں مگر بیٹے کو کوئی پسند نہیں آئی۔ اس نے آپ کی بیٹی منیرہ کو کہیں دیکھا ہے اور یہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو ہمارے بارے میں آئی مین فیملی کے بارے میں تحقیق کرواسکتے ہیں۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ رشتہ اس طرح مانگا جاتا ہے۔ کوئی جان پہچان بھی نہیں۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ کسی رشتہ کروانے والی کو درمیان میں لے آؤں مگر پھر خیال آیا اس طرح معاملہ لٹک بھی سکتا ہے اور خوامخواہ میں تیسرے بندے کو کیوں لایا جائے اسی لیے میں خود آئی ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ آپ آج ہی ہاں کہہ دیں آپ کو پورا حق ہے کہ آپ اطمینان سے سوچیں، سمجھیں اور پھر جواب دیں جواب اگر پوزیٹو ہو تو بہت ہی بہتر ہے۔"

کلثوم بیگم کے تاثرات کو جانچتے ہوئے مہناز بیگم نے بات مکمل کی۔

"مگر اس طرح کیسے؟ آپ نے تو میری بیٹی کو دیکھا بھی نہیں ہوگا۔" کلثوم بیگم ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"میں آپ کی بیٹی کو ہی دیکھنے آئی ہوں ویسے مجھے اپنے بیٹے کی پسند پر پورا اعتماد ہے اور بیٹے کو بھی ساتھ لائی ہوں تاکہ آپ بھی دیکھ لیں۔ میرے بیٹے نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی اعلا تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ کی بیٹی کہاں ہے ملوائیں گی مجھ سے؟" مہناز بیگم نے اپنائیت آمیز انداز میں پوچھا۔

"آں..... ہاں، میں ابھی اسے بلاتی ہوں۔" کلثوم بیگم اٹھتے ہوئے بولیں۔

ڈرائنگ روم سے کچن تک آتے آتے کئی طرح کے خیال ان کے ذہن کو چھو گئے کہ اگر لڑکا خود آیا ہے اور منیرہ کو جانتا بھی ہے تو کیا منیرہ بھی..... مگر ان کا دل نفی میں جواب دے رہا تھا۔

"روبی چائے بن چکی ہے تو منیرہ کے ہاتھ بھجواؤ اور ہاں چائے کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی رکھ دو۔"

کچن کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے روبی کو ہدایات دیں اور خود منیرہ کے کمرے میں آئیں۔ وہ بیڈ پہ آلتی پالتی مارے ڈائجسٹ پڑھنے میں محو تھی۔

"منیرہ! صبح سے منہ بھی دھویا ہے یا نہیں..... چلو اٹھو فریش اپ ہو اور کپڑے چینج کر کے ڈرائنگ روم میں آؤ، کچھ مہمان آئے ہیں۔" انہوں نے کچھ ڈپٹنے کے سے انداز میں کہا تو منیرہ چونک کر متوجہ ہوئی۔

"کون مہمان آئے ہیں؟" اس نے بے زار سے لہجے میں پوچھا۔

"جو بھی ہیں تم آجاؤ۔" کلثوم بیگم نے حکمیہ انداز میں کہا اور واپس ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ سہیل اور انصر آپس میں باتوں میں مصروف ہو چکے تھے۔

منیرہ ٹرالی گھسیٹتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ انصر کے لبوں پر ہلکا سا تبسم پھیلا تھا اسے دیکھ کر۔

سفید اور آسمانی رنگ کے پرنٹڈ سوٹ میں وہ بہت سادہ اور بے نیاز لگ رہی تھی۔ آسمانی رنگ کا شیفون کا دوپٹہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ سیاہ بالوں کی الجھی سی لٹ دائیں گال پر بے ترتیبی سے جھول رہی تھی۔

"یہ میری بیٹی ہے منیرہ۔" کلثوم بیگم نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"ماشاء اللہ ویری کیوٹ..... ادھر آؤ! بیٹی بیٹھو!" مہناز بیگم نے شیریں لہجے میں کہتے ہوئے ساتھ رکھے سنگل صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مہمان خاتون کے دیکھنے اور بولنے کے انداز سے منیرہ کو اندازہ ہو ہی گیا کہ وہ کس نوعیت کے مہمان ہیں۔ جونہی انصر پر نظر پڑی وہ خاصی حیران ہوئی۔ وہ اسے پہچان چکی تھی اور اپنے ڈرائنگ روم میں پہلی بار اس کی موجودگی پر چونکی تھی۔ "یہ یہاں کہاں؟" حیرانی سے سوچتے ہوئے وہ طوعاً" کرہاً" صوفے پر بیٹھ گئی۔ تاہم دل ہی دل میں کافی کوفت زدہ بھی تھی۔

"اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟" مہناز بیگم نے سابقہ لہجے میں پوچھا۔ ملکی اور غیر ملکی ٹرانسپورٹ کے درمیان فرق پر سہیل کے ساتھ بحث کرتے ہوئے انصر کے کان بھی ادھر کو متوجہ ہوئے۔

"جی میں پرائیویٹ کالج میں لیکچرار ہوں میتھس کی۔" اس نے مشینی سے انداز میں جواب دیا۔

"اوہ..... ویری گڈ..... آپ نے میتھس میں ماسٹر کیا ہے؟"

"جی۔" یک لفظی جواب دے کر وہ خاموش ہوگئی۔

وہ پھر سے کلثوم بیگم کی طرف متوجہ ہوئیں جو چائے کا کپ ان کی طرف بڑھا رہی تھیں۔

"منیرہ! تمہاری دوست کا فون ہے سن لو۔" روبی نے آکر اطلاع دی تو دل ہی دل میں شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے وہ جلدی سے اٹھ کر چل دی۔ انصر کو ایسے محسوس ہوا تھا جیسے کمرے میں بہار اپنی جھلک دکھلا کر غائب ہو گئی ہو۔ اب باتوں میں پہلے سے زیادہ روانی آ گئی۔

"اچھا بہن! بہت وقت لیا آپ لوگوں کا..... مگر بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر..... آپ کی بچی مجھے بہت پسند آئی ہے اور میری شدید خواہش ہے منیرہ ہی میرے انصر کی دلہن بنے۔ آپ لوگوں کو سوچنے اور فیصلہ کرنے کا پورا اختیار ہے۔ میری صرف درخواست ہے کہ جواب ہاں میں ہو! بیٹے کو میں اسی لیے ساتھ لائی تھی تاکہ آپ لوگ دیکھ لیں۔"

چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد مہناز بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ باقی افراد بھی اپنی سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جی، جو بھی ہو بہتر ہو!" کلثوم بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ الوداعی کلمات کے بعد وہ لوگ گیٹ سے باہر آگئے۔



کلثوم بیگم نے جب یہ بات عباس احمد، اپنی ساس اور دیگر افراد تک پہنچائی تو سب نے ہی سنجیدگی سے اس رشتہ پر غور کرنا شروع کر دیا۔ عباس احمد کے کہنے پر سہیل نے انصر اور اس کی فیملی کے بارے میں چند ضروری تحقیقات بھی کرلیں۔ سب کچھ قابل اطمینان اور تسلی بخش تھا۔ اس دوران مہناز بیگم نے بھی فون کے ذریعے اصرار جاری رکھا۔ بالآخر سب نے ہی اس رشتے کو قبولیت بخشی..... سب کے باہمی فیصلے کے بعد جب منیرہ کو اطلاع دی گئی تو وہ ایک دم بھڑک گئی۔

"امی! یہ سب آپ لوگ کیا فیصلے کرتے پھر رہے ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ پھر آئے روز یہ سلسلہ کیوں شروع کردیتی ہیں۔"

"پہلے بھی اتنے اچھے اچھے رشتے آئے۔ تم نے کوئی نہ کوئی جواز نکال کے انکار کر دیا۔ ہم نے بھی اصرار نہیں کیا۔ سوچا، وقت کے ساتھ سمجھ آجائے گی آخر کس بات کا سوگ منا رہی ہو تم جس کا کوئی سر پیر ہی نہیں۔ لوگوں کی شادیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ نکاح ٹوٹ جاتے ہیں، تمہاری منگنی ہی تو ٹوٹی تھی کون سی قیامت

امی۔ اب وہ نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ آخر کس کو سزا دے رہی ہو تم۔ کسی کو بھی نہیں۔ صرف خود کو برباد کرنے پہ تلی ہوئی ہو! زندگی میں اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ کئی آزمائشیں آن پڑتی ہیں۔ اب یہ تو نہیں کہ حوصلہ ہار کے بیٹھ جاؤ۔ ایک زخم کو سینے سے لگا کر بیٹھے رہو اور باقی ہر رشتے، ہر خوشی سے منہ موڑ لو۔ ایک در بند ہو جائے تو صرف اسی کی دہلیز کو تکتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اردگرد کئی اور دروازے کھل رہے ہوتے ہیں۔ چند سالوں بعد لوگ بھی طعنے دیں گے کہ لڑکی کو بوڑھی کر دیا۔ دیکھو بیٹا ہم تمہارے ماں باپ، بھائی کیا ہماری کوئی حیثیت نہیں۔ کیا ہم تمہارا برا چاہ سکتے ہیں۔ صرف اس ایک شخص کے لیے زندگی کی باقی رعنائیوں اور خوشیوں سے منہ موڑ لینا بھی زندگی کی سخت ناقدری ہے۔"

یوں تو کلثوم بیگم اکثر اوقات ہی اسے سمجھاتی رہتی تھیں۔ مگر اس بار کچھ زیادہ ہی تلخ ہو رہی تھیں۔ منیرہ چپ چاپ آنکھوں میں بے بسی لیے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ کلثوم بیگم کی ممتا بے چین ہو گئی۔

"دیکھو میری جان! تمہاری یہ اداسی زندگی میں چھائی قنوطیت اور ویرانی اب دیکھی نہیں جاتی۔ ابھی تک میں نجانے کیسے تمہارے باپ کو ہینڈل کرتی آئی ہوں ورنہ وہ تو کب کا تمہیں بیاہ چکے ہوتے۔ مگر میں چاہتی ہوں تم اپنی خوشی سے نئی زندگی کا آغاز کرو۔ اگر تم سب کو ایک جیسا گردانتی ہو تو یہ حماقت ہے اور میں نہیں چاہتی یہ حماقت تمہارے لیے پچھتاوا بنے۔ اور کسی پہ نہیں تو اللہ پر یقین رکھو۔ کیونکہ اللہ ناانصافی نہیں کرتا۔"

بات مکمل کر کے کلثوم بیگم نے لمبی سانس کھینچی۔ ان کی ان سب باتوں کے دوران منیرہ موم کی طرح پگھل رہی تھی۔ مایوسی اور اٹل ہٹ کی دیوار اس نے اپنے اردگرد تعمیر کرنی شروع کر دی تھی وہ لرزنے لگی تھی۔ اس کے اندر دراڑیں پڑ رہی تھیں۔

"امی جان! پہلے بھی میں نے آپ لوگوں کی رضا پہ سر جھکایا تھا۔ مگر سوائے رسوائی اور نارسائی کے میرے پاس کچھ نہیں آیا۔ اب بھی میں آپ لوگوں کے فیصلے کو قبول کرتی ہوں۔ کیونکہ میں۔۔۔۔ میں اللہ سے مایوس نہیں ہوں۔"

شکستہ لہجے میں بولتے ہوئے وہ کلثوم بیگم سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کلثوم بیگم کے آنسو بھی چھلک پڑے۔ اپنی بیٹی کا دکھ وہی تو جانتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"مس ماہم! مسٹر شمشاد رضوی والی فائل لے کر میرے کمرے میں آئیں۔" انٹر کام پر اس نے مصروف سے انداز میں سیکریٹری سے کہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ فائل لیے کمرے میں تھی۔

"بیٹھ جائیں آپ۔ فائل ادھر دیں۔" اس نے سابقہ انداز میں کہتے ہوئے ماہم کے ہاتھ سے فائل لی۔ وہ سامنے رکھی چیئر پر بیٹھ گئی۔

"مس ماہم! یہ آپ نے کراس نہیں کیا ان میٹنگز کو جو ہو چکی ہیں اور ان کے ساتھ جو ڈیلنگز ہو چکی ہیں۔ وہ کاغذات کدھر ہیں؟" فائل کے صفحے الٹتے ہوئے اس نے کچھ ناگواری سے کہا۔

"اوہ سوری سر۔۔۔۔ مجھے یہ کاغذات پن اپ کرنے یاد ہی نہیں رہے۔ فائل کے اندر ہی ہیں سر۔۔۔۔"

جلدی سے اٹھ کر باس کی چیئر کے پاس آتے ہوئے اس نے کہا۔ فائل میں سے کاغذات نکالتے ہوئے اس کا ہاتھ حذیفہ کے ہاتھ سے ٹچ ہوا تھا۔ وہ فائل پر اس طرح سے جھکی ہوئی تھی کہ کندھا حذیفہ کے کندھے کے برابر میں تھا اور بال اس کے چہرے کو بس چھو نہیں رہے تھے۔

"سر! یہ میں نے کراس کر دیا۔۔۔۔ یہ بھی۔۔۔۔ اور یہ جو کل میٹنگ ہوئی اور یہ میں پن اپ بھی کر دیتی ہوں کاغذات کو۔۔۔۔" بال پوائنٹ میز پر رکھ کر اسٹیپلر اٹھاتے ہوئے وہ بہت مدھم انداز میں بول رہی تھی۔ اس کے ریشمی بھورے بال، جسم سے اٹھتی قیمتی پرفیوم کی مہک اور اتنی نزدیکی حذیفہ کے حواس متاثر ہونے لگے۔

"پلیز مس ماہم! آپ جائیں۔ میں اس فائل کو دیکھ لیتا ہوں۔" وہ کچھ کنفیوز سا ہو کر بولا۔

ماہم کے گلابی ہونٹوں پہ مسکراہٹ ابھری جسے اس نے نچلا لب دبا کر چھپایا اور ایک ادائے دلربائی سے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ سیدھی ہوئی۔ اس کے بال حذیفہ کے چہرے سے ٹکرائے تھے۔ حذیفہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اوکے سر۔۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔" مترنم سے لہجے میں کہہ کر وہ آفس سے نکل گئی۔ لمحہ بھر کے لیے حذیفہ بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر فائل کی طرف متوجہ ہوا۔

اس رات جونہی وہ لیٹنے کے لیے سیدھا ہوا، موبائل پر میسج کی ٹون بجی۔ اس نے موبائل لیا۔ اس کی سیکریٹری ماہم کے نمبر سے میسج تھا۔ گڈ نائٹ کا میسج دیکھ کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

نجانے کیوں اسے محسوس ہوتا تھا ماہم اسے غیر ضروری اہمیت دیتی ہے۔ ہر روز صبح وہ اس کے آفس میں تازہ پھول گلدان میں سجاتی تھی پھول اپنے گھر سے لے کر آتی تھی۔ اکثر آفس میں معمولی معمولی باتوں کے لیے اس کے کمرے کے چکر لگا رہی ہوتی اور بعض اوقات ذاتی معاملات کو بھی ڈسکس کرنا شروع کر دیتی۔ بغیر دریافت کیے ہی۔

حذیفہ کو معلوم تھا کہ وہ لوگ دو بہنیں اور ایک بڑا بھائی ہے، جو بیرون ملک چھوٹا موٹا کام کرتا ہے۔ باپ نے میڈیکل اسٹور کھول رکھا ہے۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ مڈل کلاس گھرانے کی پروردہ ہے مگر اس کا لباس چال ڈھال، انداز و اطوار خاصے ماڈرن اور امیرانہ لگتے تھے۔ یہ تضاد حذیفہ کے لیے ناقابل فہم تھا۔ اس وقت وہ غیر ارادی طور پر اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن اتوار کو وہ تقریباً" ساڑھے گیارہ بجے اٹھا۔ فریش ہونے کے بعد وہ کمرے سے نکلا اور ڈائننگ ٹیبل کی طرف آیا۔ میمونہ بیگم اس کا ناشتہ لگا چکی تھیں۔

"اوہو۔۔۔۔ تو آج بھائی جان منگیتر کے ساتھ چھٹی گزاریں گے۔ مگر بھائی جان! منیرہ تو بہت شرمیلی سی ہے۔ آپ نے ایک بھی رومینٹک جملہ بولا تو وہ بے ہوش ہو جائے گی۔" لاؤنج میں بیٹھی سنڈے میگزین دیکھتی نازیہ نے فوراً" انٹری دی۔

"فکر نہیں کرو، نہیں ہونے دوں گا بے ہوش تمہاری کزن کو۔۔۔۔" چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے حذیفہ نے کہا۔

تقریباً" پونے ایک بجے وہ پھوپھو کے گھر پہنچا تھا۔ دروازہ سہیل نے کھولا۔ سامنے برآمدے میں تخت پر دادی بیٹھی ہوئی تھیں۔ مؤدبانہ انداز میں انہیں سلام کرنے کے بعد وہ وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ دائیں سائیڈ والا کمرہ جو کہ انہوں نے لاؤنج کے طور پر سیٹ کیا ہوا تھا وہاں سے منیرہ اور معیز کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کلثوم بیگم بھی کچن سے نکل آئیں۔ بہت پیار سے بھتیجے کو ملیں۔ اسی وقت منیرہ معیز کا منہ چڑاتی کمرے سے نکل رہی تھی۔ سامنے حذیفہ کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو ساکت سی ہو گئی۔ پھر اچانک سلام کرنے کا خیال آیا۔ سلام کا جواب ملتے ہی وہ جھپاک سے کمرے میں چلی گئی۔ کلثوم بیگم فوراً" اس کے پیچھے آئیں۔

"منیرہ! یہ کیا بچپنا ہے؟ تمہیں معلوم تھا کہ حذیفہ نے آنا ہے تمہیں لینے۔۔۔۔ پھر ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئیں۔" وہ تیوری چڑھا کر آواز دبا کر بولیں۔

"امی جان۔۔۔۔ وہ مم۔۔۔۔ میرے ایگزام ان کی تیاری نہیں کرنی۔" وہ زیر لب منمنائی۔

"کچھ نہیں ہوتا ایگزام کو۔۔۔۔ دن رات کتابوں میں گم ہوتی ہو، ابھی بھی تیاری نہیں ہے۔ دیکھو وہ آج پہلی بار تمہیں لینے آیا ہے۔ یوں مت کرو۔ ایسے ہی اس کا دل برا ہو گا۔ جاؤ جا کے جلدی سے تیار ہو!"

کلثوم بیگم نے کچھ حکمیہ انداز میں سمجھایا تو وہ سر جھکا کر تیار ہونے چل دی۔

ابھی تیار ہوئے ہی ہے تم تب تک بیٹھو میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

سی گرین کلر کے کڑھائی والے سوٹ میں ملبوس میچنگ جوتا پہنے لمبے بالوں کو فولڈ کر کے پونی میں جکڑے وہ تیار ہو کر باہر نکلی۔ اس نے صرف کپڑے ہی بدلے تھے۔ میک اپ برائے نام بھی نہیں کیا تھا۔ صرف آنکھوں میں کاجل کی دھار ڈالی تھی اور اتنے سے ہی وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ منیرہ کو دیکھ کر وہ بھی چونک سا گیا۔ صرف کپڑے تبدیل کرنے سے اس پر نیا نکھار اور روپ آگیا تھا۔ کلثوم اور معیز انہیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔ دوپٹہ اچھی طرح سر پر جماتے ہوئے منیرہ ڈرائیونگ سیٹ کے پہلو میں بیٹھی۔ حذیفہ اسے سی ویو کی طرف لے آیا.....

سمندر کی بل کھاتی لہراتی موجوں کی وہ دیوانی تھی۔ سو بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

"آئیں..... آجائیں نا آپ بھی!" پانی کی لہروں کے پیچھے بھاگتی وہ حذیفہ کا بازو کھینچتے ہوئے بولی۔ حذیفہ بھی کھنچتا چلا گیا۔

آج وہ منیرہ کو منگیتروں والے انداز میں دیکھ رہا تھا مگر نجانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا منیرہ اس کے اور اپنے درمیان قائم ہونے والے اس نئے رشتے کو فراموش کیے ہوئے ہے یا پھر اس کی عمر ہی ایسی تھی جس میں بے نیازی' بے ساختگی اور معصومیت تھی۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ کوئی شوخ دھڑکتا ہوا جملہ اس کے لیے بولے مگر زبان پر آتے آتے رہ گیا۔

آج ایک دم اسے احساس ہوا تھا کہ عمر کا تفاوت اور جو ناتا پہلے تھا ان کے درمیان اس کا اثر اتنی جلدی ختم ہونے والا نہیں تھا۔ اسے بھی اس وقت وہ والی منیرہ یاد آ رہی تھی جو اسے شازی اور نازی کی طرح لگتی تھی۔ جسے وہ ٹافیاں اور چاکلیٹ دیا کرتا تھا۔ جو بھائی بھائی کہتے اس کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ آج وہ گریزپا تھی کبھی جھجکتی تھی' کبھی الجھتی تھی۔ بات کرتے ہوئے سوچتی تھی۔ حذیفہ کی آنکھوں میں نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ مگر خوش اور مطمئن ضرور لگ رہی تھی۔

حذیفہ کو یہ دیکھ کر خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے ہنسی خوشی اس نئے بندھن کو قبول کیا تھا۔

چند گھنٹے سی ویو پر گزارنے کے بعد وہ اسے ساحل پر بنے ہوٹل میں لے آیا۔ اس نے کھڑکی کے پاس والی ٹیبل منتخب کی تھی۔ ویٹر کو مینیو کارڈ سے کھانا سرو کرنے کا کہہ کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ خاصی کنفیوز سی ہو رہی تھی۔ چند لمحے وہ گہری نظروں سے اسے تکتا رہا۔ منیرہ کی جھکی پلکیں لرزنے لگی تھیں۔ ہونٹ بھی کپکپانے لگے۔ گالوں پہ حیا کی لالی جھلکنے لگی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو!" حذیفہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ بس دیکھ کر رہ گئی۔

کچھ دیر بعد ویٹر کھانا سرو کرنے لگا۔ حذیفہ تو پھر بھی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا مگر منیرہ کا دھیان کھانے میں تھا۔ وہ ہوں ہاں میں ہی جواب دے رہی تھی۔ اندر سے کافی گھبرا بھی رہی تھی۔ اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ لنچ کرنا خوشگوار تو تھا ہی مگر وہ اتنی بولڈ نہیں تھی کہ پُراعتماد ہو کر اس موقع کو انجوائے کرتی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"اب گھر چلیں!"

"کیا اتنی جلدی؟ تم نے تو کھانا بھی برائے نام کھایا ہے۔" حذیفہ نے اس کی بات پر حیران سا ہو کر کہا۔

اس کا فی الحال گھر جانے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ اگرچہ دونوں ایک دوسرے کی کمپنی میں کچھ کنفیوز تھے تاہم وہ اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہ رہا تھا۔

"میں نے پیپر کی تیاری بھی کرنی ہے۔ وہ معیز تو نجانے کتنا پڑھ چکا ہو گا۔ پلیز مجھے گھر چھوڑ دیں۔" اس کے اصرار کرنے کے انداز سے حذیفہ کو محسوس ہوا تھا کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں ہے بس "مجبوراً" ہی ساتھ ہے۔

"ہاں ٹھیک ہے..... یہ کھانا تو ختم کرو' چلتے ہیں۔" حذیفہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں نے بس کھا لیا آپ کھا لیں پھر چلتے ہیں۔" منیرہ کو ایک دم احساس ہوا کہ اس نے تو اس کے کھانا

کھانے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ واپسی پہ حذیفہ بھی چپ چپ ہی رہا۔



آج وہ نئی فیکٹری کی کنسٹرکشن کا کام دیکھنے گیا تھا۔ واپسی میں وہ شمشاد رضوی کے آفس رک گیا۔ جہاں ایک گھنٹے کی میٹنگ تھی۔ اس کی سیکرٹری ماہم بھی اس کے آنے تک وہاں پہنچ چکی تھی۔ جب میٹنگ ختم ہوئی تو وہ دونوں ایک ساتھ وہاں سے نکلے۔ ماہم کو آفس کی گاڑی چھوڑ کر گئی تھی۔ لہٰذا اس وقت حذیفہ نے اسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی آفر کی جسے اس نے بلا جھجک قبول کیا۔

"سر! یہ تو لنچ ٹائم شروع ہو چکا ہے۔ آج میں گھر سے لنچ بھی نہیں لائی۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ہم یہاں کسی ہوٹل میں لنچ کر کے آفس چلتے ہیں۔" کلائی پہ بندھی گولڈن رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے اس نے ایسے انداز میں کہا کہ حذیفہ کو انکار کرنا مشکل ہی لگا۔

تھوڑا آگے جا کر ایک اچھے ہوٹل کے سامنے اس نے گاڑی روکی۔ ماہم چمکتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ گاڑی سے اتر کر آگے کو بڑھی اور بڑے پُراعتماد انداز میں حذیفہ کے سامنے والی چیئر پر بیٹھی تھی ویٹر مینیو کارڈ لے کر آیا۔

"بریانی مصالحہ' تکہ' نان اور سر آپ کیا لیں گے؟" اپنے لیے بتا کر اس نے کارڈ حذیفہ کی جانب بڑھایا۔ حذیفہ نے اپنی پسندیدہ ڈشز بتائیں۔

"سر! کوئی بات کریں نا۔" چند ثانیے بعد وہ بولی۔ حذیفہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

رائل بلیو لانگ شرٹ سفید دوپٹے کو گلے میں ڈالے' ہلکی پھلکی میچنگ جیولری اور میک اپ میں وہ ہمیشہ کی طرح بولڈ اور پُراعتماد لگ رہی تھی۔ مگر آج اس کی سبز آنکھوں میں سرور سا تھا۔ حذیفہ اس کی آنکھوں سے نظر چرا گیا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں جو پیغام دیتی تھیں حذیفہ وہ کافی دن پہلے پڑھ چکا تھا مگر توجہ دینا نہیں چاہتا تھا۔

"مس ماہم! ابھی لنچ ٹائم ہے۔ ابھی آفیشلی کوئی بھی ضروری بات نہیں جو کی جائے۔" اس نے بے تاثر انداز میں کہا۔ ماہم بے ساختہ ہنس پڑی۔ کھنکتی مترنم سی ہنسی.....

"سر! کیا ضروری ہے' ہم ہر وقت آفیشلی گفتگو ہی کریں۔ کیا کوئی اور باتیں نہیں کی جا سکتیں؟" اس کا سوال ناز بھرا اور لہجہ کھنکتا ہوا تھا۔

"ایک باس اور سیکرٹری کے درمیان جو آفیشلی رشتہ ہوتا ہے' اسی کی حدود میں رہ کر بات کی جاتی ہے۔" حذیفہ نے سابقہ انداز میں کہا۔

"سر! حدود بڑھائی بھی جا سکتی ہیں اور کم بھی کی جا سکتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" اس کی بات پر وہ چونک کر بولا۔

"کچھ نہیں سر۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

کھانا سرو ہو چکا تھا۔ دونوں کھانے کی طرف متوجہ ہوئے۔

حذیفہ کے ذہن میں کل کا لنچ آگیا۔ جو منیرہ کے ساتھ کیا تھا۔ وہ کس قدر کنفیوز اور گھبرائی ہوئی تھی۔ نظر تک نہیں ملا رہی تھی۔ کھانا بھی حذیفہ نے ہی انتخاب کیا تھا۔ اس نے کچھ بھی خود سے نہیں بولا تھا۔ اس کے چہرے پر بھول پن تھا۔ گھبراہٹ کی وجہ سے کچھ ہونق سی لگ رہی تھی۔ حذیفہ نے ارادتاً کوئی ایسی بات نہیں کی تھی کہ وہ اور نروس ہوتی۔ کھانا بھی اس نے برائے نام ہی کھایا تھا۔ آج کا دن اس کے بالکل برعکس تھا۔

آج بھی اس کے سامنے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ جو کل کی لڑکی سے بالکل مختلف تھی پراعتماد' بولڈ' کچھ شوخ' کچھ بے باک اس نے بلا جھجک ویٹر سے مینیو کارڈ لیا تھا اور اپنے باس کے سامنے بیٹھی وہ ذرا بھی نروس نہیں تھی بلکہ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ ان لمحات سے خوشی محسوس کر رہی ہے۔ وہ حذیفہ کی خاموشی کے باوجود خود ہی بولتی جا رہی تھی۔

کل والی لڑکی حذیفہ سے شرما رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ پا رہی تھی مگر آج والی لڑکی سے

وہ خود آنکھیں چرا رہا تھا۔ وہ اپنی سبز چمکتی آنکھیں بڑے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں ڈالے باتیں کررہی تھی۔ وہ خود ہی ہنس رہی تھی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔ یہ بات حذیفہ نے محسوس کی۔۔۔۔ حذیفہ اس سے پہلے کھانے سے فارغ ہوگیا۔ مگر اس کی باتیں اور کھانا جاری تھا۔

لنچ ختم کرنے کے بعد جب حذیفہ اٹھا تو اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آج کا لنچ کل کے لنچ سے زیادہ اچھا گزرا۔۔۔ اگرچہ کل کا لنچ ارادتاً تھا جبکہ آج کا لنچ غیر ارادی اور غیر متوقع تھا۔ اگرچہ آج وہ خاموش اور بے نیاز رہا پھر بھی اسے محسوس ہوا، آج کے پارٹنر نے بور نہیں ہونے دیا۔

اگلے دن جب وہ اپنے آفس آیا تو ہمیشہ کی طرح ہر چیز صاف ستھری اپنی جگہ پر ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ آج بھی چھوٹی سائیڈ ٹیبل پر گلدان میں پھول رکھے ہوئے تھے۔ مگر آج پھول مختلف رنگوں کے بجائے صرف ایک ہی رنگ میں تھے۔ سرخ گلاب۔۔۔ تر و تازہ مہکتے گلابوں کا گچھا بہت دلفریب لگ رہا تھا۔ حذیفہ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری۔ وہ اپنی کرسی پر آن کر بیٹھا اور لیپ ٹاپ کھول لیا۔

یونہی ادھر ادھر نظر گھماتے اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑی جہاں گلدان کے سامنے ایک اسٹائلش سا کارڈ رکھا تھا۔ اس نے کچھ متجسس ہو کر کارڈ اٹھایا۔ کارڈ کی بیک سائیڈ پر بڑے اسٹائلش انداز میں اس کا نام لکھا گیا تھا۔ درمیان میں بڑا سا۔

"آئی لو یو۔" لکھا ہوا تھا اور نیچے ماہم کے سائن تھے۔

چند ثانیے کو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اور پھر انٹرکام پر اس نے ماہم کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ وہ اپنے مخصوص پر اعتماد انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے لبوں پر طلسمی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شوخی۔

"مس ماہم! یہ سب کیا ہے؟" بولتے ہوئے اس کے لہجے میں کوئی غصہ، تلخی یا درشتی نہیں تھی۔

"سر! وہی جو آپ کو نظر آرہا ہے!" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

"آپ لو ان فرسٹ سائٹ پر یقین رکھتے ہیں؟" اس کا لہجہ دل میں اتر جانے کی حد تک شیریں اور معصوم تھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں، میں ایسی خرافات پر یقین نہیں رکھتا۔" وہ کچھ جھنجلا کر بولا۔

"سر! میں تو رکھتی ہوں جب میں نے پہلے دن آپ کو دیکھا تو میرے دل نے مجھے سگنل دے دیا کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جس کا مجھے انتظار تھا اور۔"

"اوشٹ اپ مس ماہم! آپ ہوش میں ہیں۔ آپ جانتی ہیں یہ ساری باتیں آپ کس سے کہہ رہی ہیں۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے چیئر پر سے کھڑا ہو گیا۔

"یس سر۔۔۔ میں پورے ہوش و حواس میں ہوں سر میں جذبوں کو چھپانے کی قائل نہیں ہوں۔ مانا آپ میرے باس ہیں۔ لیکن پہلے انسان ہیں۔۔۔ سر شاید میں یہ بات آپ سے چھپائے رکھتی مگر پھر خیال آیا کہ اگر نارسائی ہی مقدر ہے تو یہ پچھتاوا تو نہیں رہے گا کہ میں اظہار بھی نہ کرسکی۔" حذیفہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بہت رسان سے بول رہی تھی۔

"مس ماہم! بات کمتری نہیں نہ ہی میں انسانوں میں بٹوارے کا قائل ہوں۔ مگر میں انگیجڈ ہوں۔ کچھ عرصے بعد میرڈ ہو جاؤں گا۔ لہٰذا آپ اپنے جذبات کو سنبھالیے اور آفس میں صرف کام سے لگاؤ رکھا کریں۔" اس کا لہجہ نرم تھا اگرچہ الفاظ میں تناؤ تھا۔

"مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کسی اور کو لائیک کرتے ہیں یا انگیجڈ ہیں۔ میں نے تو صرف اپنے دل کی بات کی ہے۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ مجھے بے حد اچھے لگتے ہیں۔" نظریں جھکا کر اس نے جیسے اعتراف جرم کیا۔

"او کے جائیے اب۔" حذیفہ کو فی الحال یہ ہی مناسب لگا۔ اس کے جانے کے بعد کتنے لمحے وہ اسے ہی سوچتا رہا۔۔۔ حذیفہ کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی سبز آنکھوں کا جادو اس کا حصار کر رہا تھا۔ وہ اس کے بے باک اظہار محبت کو نظر انداز نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ کو ایجوکیشن اداروں میں پڑھا تھا۔ زندگی کے ہر موڑ پر ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی ملی تھی۔ مگر آج تک کسی کے ساتھ افیئر نہیں چلا تھا۔ اب تک اس کا مقصد اس کی تعلیم اور کیریئر رہا تھا۔ وہ اس قدر شریف، محتاط اور ریزرو رہا تھا کہ کبھی کسی لڑکی نے خود سے اسے دوستی کی آفر کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس نے کبھی فی میل دوست بنائی بھی نہیں تھی۔ منیرہ سے اس کی منگنی روایتی خاندانی رضامندی سے ہوئی جسے اس نے بنا کسی اعتراض کے قبول کیا۔ مگر یہ جو کچھ آج اس نے سنا تھا۔ اس کے خیالات منتشر ہونے لگے تھے۔

"محبت۔۔۔" اس کے وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ کوئی لڑکی اس سے اظہار محبت کرے گی۔ وہ اس کے انداز اور آنکھوں کی تحریر کئی دنوں سے نظر انداز کر رہا تھا یہ سوچ کر کہ یہ مغربی اطوار والی لڑکی شاید اس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ مگر آج اس نے سچائی اور کمال معصومیت سے اپنے دل کی حالت بتا کر اسے اپ سیٹ کر دیا تھا۔

شام کو آفس سے فارغ ہونے کے بعد وہ باہر نکلا پارکنگ ایریا سے گاڑی نکال کر سڑک پر آیا تو سڑک کے کنارے وہی کھڑی تھی۔

"مس ماہم آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔" اس نے گاڑی اس کے قریب لاتے ہوئے پوچھا۔

"سر! وہ ڈرائیور جو مجھے گھر چھوڑنے جاتا ہے اس کی بیوی کی طبیعت خراب تھی۔ آج وہ جلدی چلا گیا۔" اس نے وجہ بتائی۔

"آئیے۔ میں آپ کو ڈراپ کردوں۔ کہاں جانا ہے آپ کو؟" وہ فوراً فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

اور پھر اکثر ہی ایسا ہونے لگا۔۔۔ کبھی دونوں لنچ ایک ساتھ کر رہے ہوتے۔ کبھی حذیفہ اسے گھر ڈراپ کرنے جاتا۔۔۔ آفس میں اس کے چکر مزید بڑھ گئے تھے۔ اس کے باقی کولیگز میں ان دونوں کے بارے میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ مگر ماہم کو اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی اور حذیفہ تو آج کل اس کی ہر بات سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس دوران میمونہ بیگم کے احساس دلانے پر ہی وہ دو تین بار منیرہ کے ساتھ بھی آؤٹنگ پر گیا چند گھنٹوں کے لیے۔



انصر بے حد خوش تھا۔ اس نے آج تک جو چاہا پایا تھا۔ اب یہاں بھی کامیابی ملی تو وہ ہواؤں میں ہی اڑنے لگا تھا۔ جس دن سے رشتہ طے ہوا تھا اس نے اپنی تمام گرل فرینڈز سے رابطہ منقطع کر لیا تھا۔ ثنا سے اس نے منیرہ کا فون نمبر لے رکھا تھا مگر ابھی تک اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کا رشتہ بالکل سادگی سے طے ہوا تھا۔ منگنی وغیرہ کی کوئی باقاعدہ رسم نہیں ہوئی تھی۔ سادگی سے لڑکی کو انگوٹھی پہنا دی گئی تھی۔ لہٰذا اس کے دوست لاعلم تھے۔ رشتے دار بھی بے خبر تھے سوائے چند ایک کے۔ مگر وہ اس قدر خوش تھا کہ خود فون کر کے اپنے تمام دوستوں کو بتا رہا تھا۔ یونہی باری باری سب کو بتاتے ہوئے اس نے حذیفہ کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہائے بزی مین! ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" اس نے سابقہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ یہ بتاؤ انگلینڈ واپس کب جا رہے ہو؟" حذیفہ نے برائے بات پوچھا۔

"یار! بتایا تو تھا کہ اب ارادہ کینسل کر دیا۔ بھول گئے کیا۔ اب میں۔۔۔ بزنس میں انٹرسٹ لینا شروع کر رہا ہوں۔ اس وقت اپنے آفس میں ہوں اور انگلینڈ اب نہیں جاؤں گا کیونکہ میری ہونے والی وائف خاصی محب وطن ہے، وہ انگلینڈ جانا نہیں چاہتی اور میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔" انصر نے تفصیل بتائی۔

"ہونے والی وائف کیا مطلب تمہاری شادی طے ہو گئی ہے۔" حذیفہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی جناب! اب میں بھی میرڈ ہو جاؤں گا کیونکہ منیرہ مان گئی۔" انصر کے بتانے پر دوسری طرف چند ثانیے خاموشی چھائی رہی۔

"منیرہ سے تمہاری ملاقات ہوئی؟" کچھ لمحوں بعد ماؤتھ پیس پر حذیفہ کی شکستہ سی آواز ابھری۔

"نہیں یار! ابھی تک ہماری کوئی باضابطہ ملاقات نہیں ہوئی۔ بس گھر والوں نے ہی سب طے کیا ہے۔ یار! میں سوچتا ہوں میں بہت لکی ہوں، ہمیشہ بن مانگے سب کچھ ملا حتیٰ کہ وہ لڑکی بھی مل گئی جس کی میں نے آرزو کی بغیر کسی ظالم سماج کے اور بغیر کسی رقیب روسیاہ کے میرا مسئلہ حل ہو گیا۔"

"بھئی۔ ظالم سماج اور رقیب تو وہاں ہوتا ہے جہاں دو پیار کرنے والے ہوں۔ یک طرفہ معاملہ ہو۔ جیسے تم تو اسے محبت کرنے لگے ہو مگر اس کے ساتھ ممکن ہے کوئی مجبوری ہی ہو' میرا مطلب ہے اس نے صرف اپنے گھر والوں کی خوشی کے لیے ہی ہاں کی ہو۔ تو ایسے مرحلوں پہ ظالم سماج کم ہی ہوتے ہیں۔" حذیفہ کی بات پر انصر چند لمحے چپ رہا۔

"اچھا یار گڈ لک..... ابھی تھوڑی دیر بعد مجھے میٹنگ میں جانا ہے اسی سلسلے میں کچھ فائلز دیکھنی ہیں پھر بات کرتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ انصر کچھ بولتا حذیفہ نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ انصر کو ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے حذیفہ کا رویہ کچھ بدلا ہوا ہے۔ اس نے اپنے جتنے بھی دوستوں کو بتایا تھا سب ہی نے پرجوش اور بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔ جبکہ حذیفہ کے لہجے میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے سوالات کرنے کا تفتیشی انداز بھی انصر نے محسوس کیا تھا۔ حذیفہ کے پوچھنے پر ہی اسے بھی خیال آیا تھا کہ منیرہ نے کیونکر یہ رشتہ قبول کیا۔ ابھی تک وہ صرف اتنا ہی اسے جانتی تھی جتنا اسے بتایا گیا تو کیا اس نے صرف مشرقی باحیا لڑکی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ماں باپ کی بات مانی تھی۔ یہ ہی سوچتے ہوئے اس نے منیرہ کا نمبر بلا ارادہ ڈائل کیا۔

"السلام علیکم..... کون؟" بڑے مصروف سے انداز میں پوچھا گیا۔ گویا اس کے پاس انصر کا فون نمبر بھی نہیں تھا..... اس کی عدم دلچسپی کا نمایاں اظہار۔

"میں انصر پہچانا یا مزید تعارف کروانا پڑے گا۔"

"اوہ..... انصر صاحب..... نہیں تم ایسی کوئی بات نہیں..... آپ نے کوئی ضروری بات کرنی ہے؟" اس نے سابقہ انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں اس وقت کالج میں ہوں اور میرا پیریڈ شروع کر چکا ہے۔ مجھے ایک ضروری لیکچر دینا ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو بعد میں فون کر لیجیے گا۔" اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

"دٹس اوکے..... آپ کلاس اٹینڈ کر لیں میں پھر رات کو فون کروں گا۔"

"اوکے اللہ حافظ۔" فون بند ہو چکا تھا۔ رات تک وہ شدید انتظار کی کیفیت میں رہا' وہ اس سے بات کرنے کو بے چین تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنے کمرے میں آکر کپڑے تبدیل کیے۔ نائٹ سوٹ میں ملبوس ہو کر وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور پھر منیرہ کا نمبر ڈائل کیا۔ تین بار بیل جانے کے بعد فون ریسیو کر لیا گیا تھا۔ اس نے اس وقت بھی پہلے سلام ہی کیا تھا۔

"کیا کر رہی تھیں؟" انصر نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں..... ابھی نماز پڑھ کے فارغ ہوئی ہوں۔" منیرہ نے ماتھے تک دوپٹہ لپیٹ رکھا تھا۔ بیڈ کی پائنتی پر بیٹھی اپنی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے وہ بات کر رہی تھی۔ بے تاثر لہجے میں۔

"میرے فون کا انتظار کر رہی تھیں!" بڑی آس سے پوچھا گیا۔

"نہیں..... کیونکہ میرا خیال تھا' ہمارے پاس کرنے کو کوئی خاص بات نہیں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ انصر لحظہ بھر کو خاموش رہ گیا۔

"مگر میرے پاس تو تم سے کرنے کے لیے اتنی باتیں ہیں کہ وقت کم پڑ جائے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ منیرہ نے جیسے اس کی بات ان سنی کر دی۔ "ایک بات بتاؤ اس رشتے پر خوش ہو!"

"ہاں خوش ہوں۔ کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا گیا تھا!" اس کی بات کا منیرہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"جب تم نے رشتے کے لیے ہاں کی تھی تو کیا سوچ کر۔ آئی مین میرے بارے میں تو تم کچھ نہیں جانتی ہو۔"

"آپ بھی تو میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے پھر کیا سوچ کر رشتہ بھیجا!" برجستہ جواب میں سوال نے انصر کو بوکھلا دیا۔

"کچھ فیصلے دل کے ہوتے ہیں ان کی وجہ نہیں بتائی جاتی۔" چند ثانیے بعد وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ منیرہ کی طرف خاموشی تھی۔

"کیا خیال ہے کل کہیں گھومنے نہ جائیں۔" انصر نے ہی پھر بات کا آغاز کیا۔

"سوری میں ٹھیک نہیں سمجھتی منگیتر کے ساتھ گھومنا۔" اس کے بے حس لہجے نے انصر کو اچھا خاصا دھچکا لگایا۔ اس کی زندگی میں آنے والی شاید وہ پہلی لڑکی تھی جس نے اس کی آفر کو ٹھکرایا تھا۔ اس کی منگیتر ہونے کے باوجود..... ابھی نیا نیا رشتہ طے ہوا تھا۔ انصر کے اندر جذبے مچل رہے تھے مگر دوسری طرف کوئی ایسی بے قراری نہ تھی۔

"منیرہ! ہم دونوں کے مابین اب تعلق ہے۔ اگرچہ یہ تعلق قانونی اور شرعی نہیں ہے مگر ہونے والا تو ہے' کیا حرج ہے اگر ہم کبھی کبھار ساتھ گھوم پھر لیا کریں آؤٹنگ کیا کریں۔ اس طرح ساتھ وقت گزارنے سے ہم ایک دوسرے کو انڈر اسٹینڈ کر سکیں گے۔" اس نے قائل کرنا چاہا۔

"یہ شادی سے پہلے انڈر اسٹینڈنگ والی لاجک میری سمجھ سے باہر ہے۔ فرض کریں اگر ہماری انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو تو کیا آپ انگیجمنٹ توڑ دیں گے؟" منیرہ کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

"نہیں..... بالکل نہیں۔ میں نہیں ہوئے کا اب تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے تو چاہ رہا ہوں کہ ہم دونوں میں ہم آہنگی ہو جائے!" اس نے فوراً کہا۔

"یہ ہم آہنگی شادی کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"مگر میرا دل چاہتا ہے تمہارے ساتھ وقت گزارنے کو..... تم نہیں چاہتیں کہ مجھے میرے مزاج میری عادات کو جان پاؤ۔ میرے ساتھ کچھ وقت گزارو!"

"شادی کے بعد چاہ لوں گی جب ضرورت ہو گی۔" دو ٹوک جواب ملا۔ انصر کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی منگیتر ہی سے باتیں کر رہا ہے اس کی باتوں پر اسے غصہ نہیں آیا اور نہ ہی کوئی بات ناگوار لگی مگر حیران اور کچھ پریشان ضرور تھا۔

"منیرہ! ایک بات سچ سچ بتانا تم سے زبردستی تو ہاں نہیں کروائی گئی میرا مطلب ہے تم کسی اور کو تو پسند نہیں کرتی ہو!" اس کا لہجہ پہلی بار سنجیدہ اور حساس تھا۔

"نہیں! میرے گھر والے زبردستی کے قائل نہیں ہیں۔ آپ پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔ آپ ٹین ایجر نہیں ہیں اور نہ ہی میں کوئی سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی ہوں۔ بعض اوقات ہم کسی انسان کے ساتھ عرصے سے رہ رہے ہوتے ہیں ہمارا دعوا ہوتا ہے ہم اس انسان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ مگر کبھی نہ کبھی اسی شخص کا کوئی ایسا پہلو نظر میں آجاتا ہے کہ جو ہماری نظر سے ہمارے وہم و گماں سے بھی اوجھل ہوتا ہے اور ہمارا دعوا دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھتی' ساتھ وقت گزارنے سے انڈر اسٹینڈنگ ہوتی ہے۔ دل بدل جائیں سوچ بدل جائے تو ذہنی ہم آہنگی پیچھے رہ جاتی ہے۔ میرے نزدیک انڈر اسٹینڈنگ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا مخلصانہ ساتھ نبھانے کا عہد کریں اور اس عہد پر قائم رہیں۔" اس کی ایک ایک بات انصر کے دل میں اتر رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تم سے ایگری کرتا ہوں مگر کیا تمہیں یہ خدشہ نہیں کہ اگر تمہارے انکار سے خفا ہو جاؤں یا غصے میں آجاؤں تو!" وہ نجانے کیا جاننا چاہ رہا تھا۔

"نہیں مجھے ایسا کوئی خدشہ نہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں ایک فضول بات کو رد کر رہی ہوں جس کی کوئی ٹھوس لاجک نہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں اگر آپ واقعی اس تعلق میں سنجیدہ ہیں کم از کم اس بات سے انکار پر خفا نہیں ہوں گے۔" وہ یقین سے کہہ رہی تھی۔

"کیا تمہیں میرے خفا ہونے کی پرواہ ہے؟" لہجہ گمبھیر تھا۔

"ابھی تو نہیں۔" صاف گوئی سے جواب ملا۔

انفر چپ رہ گیا۔

"اوکے شب بخیر۔۔۔ مجھے لیکچر بھی تیار کرنا ہے۔" کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ آنکھیں موندتے ہوئے انفر مسکرایا۔

"منیرہ! تم واقعی منفرد اور نایاب ہو اور میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ تم میری ہونے والی ہو۔" وہ خیال میں اس سے مخاطب تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں ادھر ادھر چکراتے ہوئے وہ مختلف تراکیب پر غور کر رہا تھا کہ وہ کس طرح منیرہ سے اپنی انگیجمنٹ ختم کروائے۔ شازیہ کا رشتہ بھی طے ہو چکا تھا اور میمونہ بیگم آج کل اسی تیاری میں تھیں کہ کب دونوں کی شادی کی ڈیٹ فکس کی جائے اور جوں جوں باقی سب گھر والوں کا جوش و خروش عروج کو پہنچ رہا تھا اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

اگر اس سلسلے میں وہ میمونہ بیگم سے مدد مانگنے جاتا تو اسے منہ کی کھانی پڑتی۔

منیرہ کو وہ بے حد پسند کرتی تھیں حتیٰ کہ اپنی بیٹیوں کو اس کی مثالیں دیتیں۔ انہوں نے اپنی سگی بھانجیوں پر منیرہ کو ترجیح دی تھی۔ نند کی بیٹی کو بہو بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور ان کے ساتھ نند کا برتاؤ اتنا اچھا رہا تھا کہ وہ بلاوجہ اسے دکھ نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ باپ سے کہنا بھی بے کار۔۔۔ اب منیرہ ہی باقی تھی کہ وہ اس سے براہ راست کہہ دیتا کہ وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا لہٰذا وہ انکار کر دے مگر وہ ابھی امیچور اور نادان سی لڑکی تھی' پتا نہیں کس قسم کے رد عمل کا اظہار کرتی۔ وہ عجیب شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

ماہم جو اس کی سیکرٹری تھی اور ابتدا میں وہ اسے کچھ خاص پسند نہیں کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے حواسوں پہ چھا گئی تھی اور اس کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے اسے یوں لگنے لگا تھا کہ اس کی ماں نے اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایک نو عمر' ناسمجھ شرمیلی سی لڑکی جسے وہ بہنوں کی طرح سمجھتا تھا اس کے ساتھ اس کی منگنی کر دی۔ جو صرف شرماتی تھی یا نروس رہتی تھی اور اسے بھی نروس کر دیتی تھی۔ بولڈنیس نام کی چیز تو اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی معنی خیز نگاہیں کیا کہتی ہیں۔ وہ باتوں اور اداؤں کی دلربائی کو نہیں جانتی تھی۔ جبکہ ماہم یہ سب جانتی تھی۔

اسے بولڈ اور آزاد خیال لڑکیاں کبھی پسند نہیں رہی تھیں۔ مگر بیک وقت ماہم اور منیرہ کے ساتھ وقت گزار کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اتنا بھی کنزرویٹو نہیں ہے۔ ماہم کی شوخ مزاجی' ادائیں' پراعتماد اظہار محبت' پراعتماد انداز گفتگو' دل کو چھوتی مسکراہٹیں ان سب چیزوں نے چند ہی دنوں میں اس کے دل پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ زندگی کا سفر طے کرنے کے لیے اسے ایک پراعتماد' بولڈ زمانے کے ساتھ چلنے والی لڑکی کی ضرورت ہے۔ وہ نو عمر اور حسین تھی۔ شروع میں شاید اسی وجہ سے اسے اعتراض نہیں تھا۔ مگر اب ماہم سے ملنے کے بعد اسے منیرہ میں کئی نقص نظر آنے لگے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر فیصلے کو عملی جامہ پہنانا مشکل لگ رہا تھا۔ "جو بھی ہے مجھے منیرہ سے بات کرنی چاہیے۔ میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گا کہ ہماری جوڑی مناسب نہیں۔ لہٰذا وہ آگے بڑھنے کا

بہانہ بنا کر شادی سے انکار کر دے۔ اس طرح میں بھی بچ جاؤں گا اور فیملیز میں بھی تناؤ نہیں آئے گا۔ لیکن اس بات کی گارنٹی بھی تو نہیں کہ وہ مان جائے۔ خیر بات کر کے دیکھتا ہوں۔"

ٹہلتے ٹہلتے اس نے سوچا اور پھوپھو کی طرف جانے کی تیاری کرنے لگا۔ آج اتوار تھا اور آج وہ سارا دن گھر ہی رہا تھا۔ اس وقت تین بج رہے تھے جب وہ تیار ہو کر نیچے آیا۔

"کہاں جا رہے ہو بیٹا؟" اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی دیکھ کر میمونہ بیگم نے پوچھا۔ وہ اس وقت لائٹ براؤن کلر کی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔

"امی! میں ذرا پھوپھو کی طرف جا رہا ہوں۔ شام تک آجاؤں گا۔"

اچھا جاؤ۔۔۔ پھوپھو کو سلام کہنا!" میمونہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کاش امی ہی پھوپھو سے تھوڑی بددل ہوتیں' کوئی ان کا روایتی قسم کا تعلق ہوتا تو آج مجھے کچھ آسانی رہتی۔ یہ بھی عجیب ہی نند بھابھی ہیں۔" سوچتے ہوئے وہ گیراج کی طرف آیا۔

☼ ☼ ☼

جب وہ پھوپھو کے گھر میں داخل ہوا تو سب اسے سامنے برآمدے میں بیٹھے نظر آئے۔ عظمیٰ پھوپھو بھی ادھر ہی بیٹھی تھیں۔ وہ بھی ان کے درمیان چلا گیا۔ سب ہی نے پرجوش انداز میں اسے خوش آمدید کہا۔

"منیرہ کہاں ہے پھوپھو؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

"بیٹا! وہ چھت پر ہے۔ جاؤ صغریٰ! منیرہ کو بلا لاؤ؟" اسے بتا کر انہوں نے صغریٰ سے کہا۔

"نہیں رکو۔ میں خود چلا جاتا ہوں!" حذیفہ نے صغریٰ کو منع کیا اور خود اٹھ کر سیڑھیوں کی جانب چل دیا۔ آخری سیڑھی طے کر کے اس نے چھت پر پہلا قدم رکھا تھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔

سامنے منڈیر کے ساتھ منیرہ کے ساتھ معیز بھی ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ دونوں کسی بات پر بے ساختہ اور بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ معیز کے ہاتھ میں نمکو کا پیکٹ تھا جس میں سے منیرہ بھی لے رہی تھی۔ بچپن سے لے کر آج تک وہ دونوں اسے سینکڑوں بار نظر آئے تھے یونہی ہنستے کھیلتے' باتیں کرتے' لڑتے جھگڑتے اور اس کی وجہ ان دونوں کی دوہری رشتہ داری ہم عمری اور ایک کلاس میں ہونا تھا۔ اس لیے وہ اکثر ہی ساتھ نظر آتے تھے۔ حذیفہ کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ منیرہ کبھی یوں اس کے ساتھ بھی کھلکھلائی ہو۔ اس کے ساتھ بے تکلف ہو کر اس طرح باتیں کی ہوں یا کبھی اس کے سامنے اسی طرح پراعتماد اور بے فکر ہو کر کھڑی ہو۔ منگنی سے پہلے اگرچہ وہ اسے خود سے مخاطب کیا کرتی تھی۔ باتیں کرتی تھی تب بھی لحاظ اور مروت احترام آڑے رہتا تھا۔ مگر منگنی کے بعد تو اس کے سامنے بالکل چھوئی موئی بن جاتی تھی۔ معیز اور منیرہ کو وہ اکثر ساتھ بیٹھے پڑھتے گپیں لگاتے دیکھتا آیا تھا مگر آج جس نگاہ سے دیکھا تھا اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

وہ جہاں کھڑا تھا وہاں آگے ستون تھا۔ ستون کی آڑ میں وہ دونوں اسے نہیں دیکھ پائے تھے۔ وہ ان ہی قدموں واپس لوٹ آیا۔

"اوکے پھوپھو! میں چلتا ہوں۔" اس نے انتہائی سنجیدہ اور روکھے لہجے میں کہا۔ برآمدے میں بیٹھے سب ہی افراد کچھ حیران ہوئے اس کے اتنی جلدی جانے پر۔

"بیٹا! بیٹھو تو۔۔۔ اتنی بھی کیا جلدی۔۔۔ دیکھو منیرہ نے خود اپنے ہاتھوں سے رس گلے بنائے ہیں۔ کھا کر۔۔۔" کلثوم بیگم کی بات درمیان میں ہی لٹکی رہ گئی تھی اور وہ برآمدہ کراس کر کے جا چکا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کے باہر سے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز آئی۔ معاملہ کچھ گڑبڑ تھا۔ سب ہی نے محسوس کیا۔ گھر آ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا بغیر کسی سے بات کیے' موڈ آف کیے۔ میمونہ بیگم اس کے اتنی جلدی اور آف موڈ کے ساتھ واپس آنے پر حیران ہوتی اس کے پیچھے اس کے

کمرے میں آئیں۔



"بیٹا! کیا کہہ رہے ہو تم!" حذیفہ کی بات سن کر میمونہ بیگم کے یکدم حواس ہی معطل ہو گئے۔ ششدر آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولیں۔

"جو آپ نے سنا' وہی کہہ رہا ہوں۔" چبا چبا کے بولتے ہوئے اس کا لہجہ بھی غضب ناک تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخ تیر رہی تھی۔ گال تمتما رہے تھے۔ نتھنے پھولے ہوئے تھے اور ہونٹ بھنچے ہوئے۔ میمونہ بیگم نے کبھی اپنے بیٹے کو اتنے غصے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا مگر اس کی بات پر یقین کرنا ہی محال ہو رہا تھا۔

"میں نہیں مانتی کہ معیز اور منیرہ ۔۔۔ وہ دونوں تو۔"

"ہاں یہی کہنا چاہ رہی ہیں نا آپ کہ وہ دونوں بچپن سے ساتھ رہے ہیں۔ ہم عمر ہیں۔ کلاس فیلوز ہیں' اس لیے ان کی آپس میں زیادہ بنتی ہے۔ مگر میں بھی یہ فرینک نیس اسی لیے اگنور کرتا آیا ہوں کہ میں یہی سمجھتا رہا۔ وہ جس طرح معیز کے ساتھ فرینکلی باتیں کرتی ہے' ہنستی ہے' کھلکھلاتی ہے۔ اس طرح میرے ساتھ تو کبھی بھی فرینک نہیں ہوئی۔ جبکہ میں اس کا ہونے والا شوہر ہوں مگر میرے ساتھ جب ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں برس رہی ہوتی ہیں۔ میرے سامنے آنے سے کتراتی ہے۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے گھبراتی ہے اور میں بے وقوف سمجھتا رہا مجھ سے شرماتی ہے۔ آج میں نے ان دونوں کو جو نازیبا حرکت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ سب دیکھنے کے بعد میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ منیرہ کو اپنی بیوی بنا لوں۔ آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگل سکتا میں۔"

بولتے ہوئے حذیفہ کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ میمونہ بیگم کو اپنی ٹانگیں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں اور وہ گرنے کے سے انداز میں قریب رکھے سنگل صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"مم ۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ منیرہ ایسی ہو سکتی ہے۔ بڑی باحیا لڑکی ہے۔ آج تک ہر ایک نے اس کی عادت کی تعریف ہی کی ہے۔ معیز سے اس کی بنتی تھی مگر ۔۔۔ کبھی کسی نے ان دونوں کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں اور اگر وہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارے ساتھ منسوب ہونے کے باوجود وہ معیز سے ۔۔۔ نہیں۔ میں نہیں مانتی کہ وہ ایسی کسی غلط حرکت کا ارتکاب کر سکتی ہے۔"

میمونہ بیگم روہانسی آواز میں تردید کر رہی تھیں۔ معیز نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ "ہو سکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو یا۔"

"امی جان ۔۔۔ آپ کہہ رہی ہیں' میری نظروں نے دھوکا کھایا ہے۔ میں ان دونوں پر بہتان لگا رہا ہوں۔ آپ مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہیں۔ ٹھیک ہے۔ اگر آپ مجھے ہی بے غیرت بنانا چاہتی ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں بھول جاتا ہوں کہ جب میں چھت پر گیا تھا تو وہ دونوں اکیلے تھے وہاں اور' اور۔"

"بس بیٹا! چپ کر جاؤ۔ میں اپنے بیٹے کو کیوں مجبور کروں گی کہ وہ ایسی لڑکی کو بیاہ کر لائے جو حیا' شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے مگر ۔۔۔ چوری چھپے جانے کیا کیا گل کھلا رہی ہے۔ میں ابھی جاتی ہوں کلثوم کو اور بھائی جان کو بتاتی ہوں۔"

میمونہ بیگم ایک دم غصے اور طیش کے عالم میں کھڑی ہو گئیں۔ وہ جانتی تھیں' حذیفہ نے اوروں کے ساتھ تو شاید کبھی غلط بیانی کی ہو مگر ماں سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ غیظ و غضب والے تاثرات لیے وہ دروازے کی جانب بڑھیں ان کے خوف ناک تیور دیکھ کر حذیفہ یکدم گھبرا گیا۔

"امی جان ۔۔۔ بات سنیں۔" اس نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں روکا۔ "دیکھیں' ہم بھی جلد بازی سے کام نہ لیں۔ میں نے وہ سب دیکھا اور کسی سے بھی ذکر کیے بنا خاموشی سے پلٹ آیا۔ آپ کے اور کلثوم پھوپھو کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے ہیں

گر وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ مگر وہ دونوں بالکل نوجوان ہیں' اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکے' اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان دونوں کو خاندان بھر میں رسوا کر دیا جائے۔ ٹھیک ہے آپ بات کیجیے کلثوم پھوپھو سے مگر صرف ان ہی سے اور انہیں سمجھائیے کہ وہ بھی بات اپنے تک رکھیں۔ اگر پھوپھو انکل عباس کو بتائیں گی تو کچھ بعید نہیں وہ غیرت میں آ کر دونوں کو گولی ہی مار دیں۔ لہٰذا پھوپھو کو سمجھائیے کہ وہ خود ہی کسی طرح اس رشتے کو ختم کر دیں۔ اور منیرہ کی شادی معیز سے کرنے کا سوچیں۔ ہم دونوں کی عمر میں تفاوت کا بہانہ بنا لیں یا کچھ بھی ۔۔۔ انہیں رسوا کریں گے تو بہت کچھ خراب بلکہ برباد ہو سکتا ہے۔ آپ' آپ بابا جان سے بھی یہ بات چھپائیں گی میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے مزید لوگوں کی زندگیاں خراب ہوں۔"

"بیٹا! تم کتنے اچھے ہو۔ کتنی اچھی سوچ ہے تمہاری ۔۔۔ میں کتنی کم عقل تھی ایک بدکردار لڑکی کو تمہاری زندگی میں شامل کرنے چلی تھی۔ ٹھیک کہہ رہے ہو تم ۔۔۔ ہمارا پیچھا چھوٹ جائے تو مزید کوئی ضرورت نہیں بات پھیلانے کی ۔۔۔ اپنے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔ دوسروں کے عیب چھپانے میں ہی بھلائی ہے۔ البتہ اب کلثوم کی آنکھیں اچھی طرح کھولوں گی بڑا ناز کرتی ہے بیٹی پر۔"

میمونہ بیگم نے قائل ہوتے ہوئے کہا۔ مگر لہجے میں نفرت اور بے زاری تھی منیرہ کے لیے ۔۔۔

خود جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے انہوں نے اگلے ہی دن کلثوم بیگم کو فون کر کے بلوایا۔ کچھ دیر ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے وغیرہ پلوانے کے بعد میمونہ بیگم' کلثوم بیگم کو اپنے بیڈ روم میں لے آئیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات اور انداز میں تناؤ کلثوم بیگم محسوس کر رہی تھیں۔ کمرے میں آنے کے بعد میمونہ بیگم نے آہستہ آہستہ بولتے ہوئے ساری بات کلثوم بیگم کو بتا دی۔ وہ جیسے ہزار واٹ کا کرنٹ کھا کر کھڑی ہو گئیں۔

"میمونہ کیا کہہ رہی ہو!" میری منیرہ اور معیز ایسے نہیں ہو سکتے۔ حذیفہ سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔" ان کی آواز لرز رہی تھی مگر لہجے میں یقین تھا۔

"جب حذیفہ نے مجھے یہ سب بتایا تھا تو میں نے بھی یونہی انکار کیا تھا۔ میرا دل کانپ گیا تھا۔ مگر کلثوم آپا آج کل کی اولاد ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کافی ماہر ہے۔ حذیفہ نے آج تک کسی بھی معاملے میں مجھ سے جھوٹ نہیں بولا اور اسے تم اچھی طرح جانتی ہو بچپن ہی سے بڑی برداشت والا ہے۔ آج تک کسی لڑکی سے دوستی تک نہیں کی۔ اس کا کردار' مزاج' عادات تمہارے سامنے ہی ہیں۔ یورپ میں رہ کر بھی اس کا کردار خراب نہیں ہوا ۔۔۔ تو کیا اب میں ایسی لڑکی کو اس کی بیوی بنا دوں جسے وہ خود دیکھ چکا ہے کہ وہ کتنی باکردار ہے۔

یہ سب جان کر میں بہت طیش میں آ گئی تھی اور چاہ رہی تھی' ان دونوں کے کرتوت سب کو بتاؤں مگر یہاں بھی میرے بیٹے کی اعلا ظرفی دیکھو۔ اسی نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے صرف تم سے بات کرنی چاہیے۔ مردوں تک بات پہنچی تو کوئی بھی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے۔ آپ منیرہ کی پڑھائی یا عمر کے فرق کو یا کسی بھی بات کا بہانہ بنا کر خود ہی سب کے سامنے یہ رشتہ ختم کر دیں۔ اگر ہم انکار کریں گے تو لوگ کہیں گے۔ ضرور لڑکی کی کوئی کمزوری سامنے آ گئی۔ خیر عیب تو ہم نے بہت بڑا دیکھ لیا بلکہ گناہ کہنا چاہیے مگر کیا کریں اپنوں کی عزت کا بھی سوال ہے۔"

آخر میں میمونہ بیگم کا لہجہ خاصا احسان جتلانے والا تھا۔

"عمر اور تعلیم تو پہلے بھی سب جانتے ہی ہیں۔ لیکن آپ فکر نہیں کریں۔ رشتہ ختم سمجھیں اور واقعی یہ آپ کا احسان ہے کہ میری بیٹی کا گناہ دیکھ کر بھی پردہ پوشی کر لی۔" کلثوم بیگم کی کمزور سی آواز جیسے کسی گہری کھائی سے نکلی تھی۔ میمونہ بیگم کے دل کو کچھ ہوا۔



جب پہلی بار النصر نے اس سے منیرہ کے متعلق

بات کی۔ اس کی تعریفوں کے بعد اس کا نام بتایا تھا تب ہی حذیفہ کو شبہ ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے منیرہ نام کی کئی اور بھی لڑکیاں ہوں مگر اس نے جو کچھ بتایا تھا ویسا نقشہ ہر منیرہ کا نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنے دل و دماغ کو تسلی دیتا رہا اور اس وہم کو جھٹلاتا رہا۔ کہ کاش وہ "وہی" منیرہ نہ ہو۔ جس کے لیے اب وہ پاگل ہو رہا تھا اور اسے پانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ مگر اس کا یہ وہم حقیقت میں تب سامنے آیا جب ایک دن میمونہ بیگم فون پر شازیہ سے باتیں کرتے ہوئے اسے منیرہ کی منگنی اور اس کے منگیتر کے بارے میں بتا رہی تھیں۔

حذیفہ کو لگا، کسی نے اس کے نیچے سے زمین کھینچ لی اور ریت سیمنٹ، بجری کا ملبہ اس پر گرا دیا ہے اور وہ کہیں اندھے کنویں میں گر پڑا ہے۔ دو دن وہ عجیب کم ہمتی اور شکستگی کی کیفیت میں رہا۔

کتنے دن وہ انصر سے رابطہ نہ کر سکا..... وہ انصر کو بے حد پسند کرتا تھا۔ وہ کئی بار اس کے کام آیا تھا۔ وہ اس کا بہترین دوست رہ چکا تھا۔ مگر آج کل انصر اسے اس دنیا کا بدترین شخص لگنے لگا تھا۔ نجانے کیوں آج بھی اسے لگتا تھا۔ منیرہ پر صرف اسی کا حق ہے۔ اگر نادانی میں وہ اسے کھو چکا ہے تو کیا ہوا تلافی بھی کی جا سکتی ہے یہ ہی سب سوچتے ہوئے اس نے میمونہ بیگم سے چند ماہ قبل بات بھی کی تھی۔

"بیٹا یہ کیسے ممکن ہے کہ جس لڑکی کو چند سال قبل ہم ٹھکرا چکے ہیں اسی کا رشتہ مانگنے چلے جائیں۔ خاندان والے کیا کہیں گے اب جبکہ تم شادی شدہ بھی ہو۔" وہ خاصی الجھ کر بولی تھیں۔

"امی جان! خاندان والوں کو اصل بات کا تو علم نہیں انہیں تو یہ ہی پتا ہے انکار پھوپھو کی طرف سے ہوا تھا اور منیرہ بھی تو ابھی تک کنواری ہے۔ آپ خود کہتی ہیں کہ کئی اچھے رشتے آئے مگر اس نے ٹھکرا دیے۔ اسی لیے نا کہ وہ ابھی تک میرے انتظار میں ہے۔"

"حذیفہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس وقت جو تم نے کہا تھا۔ وہ سب کیا تھا۔ عظمیٰ نے معیز پر کئی بار دباؤ ڈالا کہ وہ منیرہ سے شادی کر لے مگر وہ نہیں مانا۔ اگر ان کے درمیان ایسا کچھ ہوتا تو وہ انکار کیوں کرتا۔ یہ سارا قصہ آج تک میری سمجھ نہیں آیا۔" میمونہ بیگم سر پکڑ کر بولیں۔

"امی جان! ہو سکتا ہے اس وقت میری نظروں نے واقعی ہی دھوکا کھایا ہو!" معیز گہرے لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب؟ اس وقت تو تم کہتے تھے میں نے اپنی آنکھوں سے سب دیکھا اور آج تمہیں یاد آ رہا ہے کہ تم نے۔"

"امی جان! آج اتنے سالوں بعد مجھے محسوس ہوا ہے کہ میں نے شاید دھوکا کھایا تھا۔ اب میں اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کلثوم پھوپھو سے بات کریں گی تو وہ ہمارا احسان مانیں گی۔"

"ماہم اور حمزہ کا کیا کرو گے؟" میمونہ بیگم کے لہجے میں کچھ سختی تھی۔

"میں ماہم سے بہت تنگ آ گیا ہوں اگر منیرہ سے رشتہ پھر سے جڑ جائے تو میں فوراً اسے طلاق دے دوں گا۔ حمزہ کو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔" اس کی بات پر میمونہ بیگم حیران سی اسے دیکھنے لگیں۔ کئی کڑیاں آپس میں جڑنے لگیں۔ کئی پردے آنکھوں کے آگے سے ہٹنے لگے مگر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا بیٹا بھی کسی پر جھوٹا بہتان لگا سکتا ہے۔ انہوں نے ایک دم فیصلہ کر لیا۔

"شادی بیاہ، رشتہ توڑنا..... جوڑنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ تم نے ماہم سے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ میں اس کھیل میں تمہارا مزید ساتھ نہیں دے سکتی۔ اپنے لیے جو بھی کرنا ہے خود کرو کیونکہ اگر تمہیں ہمارے فیصلوں پر اعتماد ہوتا۔ تو آج اس حالت میں نہ ہوتے۔" بے لچک اور قطعی لہجے میں کہتے ہوئے میمونہ بیگم وہاں سے چلی گئیں۔

زندگی میں پہلی بار حذیفہ حسن نے اپنی ماں کو خود سے یوں برگشتہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ وہ خود منیرہ سے ہی بات کرے گا مگر حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ منگنی ٹوٹنے سے لے کر آج تک نہ وہ ان کی طرف آئی تھی اور نہ ہی حذیفہ کبھی ادھر ان کے گھر گیا

تھا۔ بائی لہروالے ملتے جلتے تھے۔ مگر ان کی تو کبھی بات بھی نہ ہوئی تھی۔ اب اس کے سامنے جاتے ہوئے ایک جھجک سی مانع تھی۔ اور اسی جھجک کے دوران اسے اس کی منگنی کی خبر مل گئی تھی اور جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی۔ آج کل وہ پھر ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ کس طرح منیرہ کو حاصل کرے اور اس نے پھر سوچ لیا تھا کہ اسے منیرہ سے کیا کہنا ہے۔ اب صرف مشکل مرحلہ اس سے ملاقات کا تھا۔ کیا وہ اس کا سامنا کرپائے گا۔ کیا اس کی آنکھوں میں دیکھ پائے گا۔ اسے اپنا یقین دلا پائے گا۔ اس کے ذہن میں دو آنکھیں ابھری تھیں ششدر، حیران پریشان، صاف شفاف پانی سے بھری آنکھیں!



اپنے سامنے رکھی فائل پر جھکا وہ بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب اس کے آفس کا دروازہ دھڑام سے کھلا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر یکدم اس کے اوسان خطا ہوئے تھے۔ بے ساختہ وہ اپنی کرسی پر سے کھڑا ہوا تھا۔

"منیرہ تم!" وہ حیرانی سے بولا۔ اس کی نہ صرف آمد اس کے لیے حیران کن تھی بلکہ اس کا حلیہ بھی..... گلابی اور سفید پرنٹڈ شیفون کی قمیص کے نیچے سفید کلر کی شلوار۔ سر پر دوپٹہ اچھی طرح لپیٹے ہوئے وہ بالکل گھریلو سی لگ رہی تھی۔ کپڑوں کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک دو دن قبل کے پہنے ہوئے ہیں۔

"آپ یقیناً" اپنے آفس میں مجھے دیکھ کر خاصے حیران ہوئے ہوں گے۔ لیکن اپنی ماں سے اپنے متعلق جو بات سنی ہے اس نے میرے پاؤں تلے سے زمین ہی کھینچ لی ہے۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ آپ نے کیوں..... کیوں میری ذات پر اتنا گندا اور گھناؤنا الزام لگایا؟ کیوں آخر کیوں؟"

نفرت، غصہ حقارت، دکھ، اذیت، بے چینی اس کے ان تین جملوں کے اندر نہ جانے کیا کیا کچھ تھا جس نے حذیفہ کو بھی پل بھر کے لیے ہلا دیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خون رنگ سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد پھیلی نمی اور بھیگے بھیگے گال بتا رہے تھے کہ وہ روتی ہوئی آئی ہے۔ جب سے ان دونوں کی منگنی ہوئی تھی آج وہ پہلی بار حذیفہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔ چبھتی، سوال کرتی، کچھ کھوجتی آنکھیں۔ حذیفہ کو قطعاً توقع نہ تھی کہ اگلے ہی دن وہ یوں اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو جائے گی اور اس سے سامنا ہونے کا تو اس نے سوچا تک نہ تھا۔ وہ تو اپنی طرف سے قصہ ختم کرچکا تھا۔ تاہم اب اسے اپنی پوزیشن کلیئر کرنی ہی تھی۔

"دیکھو کل میں نے تمہیں اور معیز کو چھت پر اکیلے دیکھا۔ تم لوگ مجھے نہیں دیکھ پائے تھے اور..... اور۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا بولے۔ کل جس اعتماد سے اس نے اپنی امی سے بات کی تھی وہ کہیں رفوچکر ہو گیا تھا۔

"اور..... کیا اور۔" وہ تیزی سے بولی۔ حذیفہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"ہم دونوں کئی بار آپ کو ایک ساتھ نظر آئے ہوں گے۔ اسکول کالج ہم دونوں ساتھ جاتے ہیں۔ پڑھتے ساتھ ہیں، کھاتے پیتے بھی ساتھ ہیں۔ مگر کل آپ کو ایسا کیا نظر آیا کہ میں اپنی ہی نظروں سے گر گئی ہوں؟" وہ درشتی سے پوچھ رہی تھی۔

منیرہ! جو ہونا تھا ہو چکا۔ ابھی بات صرف پھوپھو تک ہے ایسا نہ ہو تمہارے بھڑکنے سے جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے۔ کنٹرول یور سیلف۔ میں نے کوئی بہتان نہیں لگایا تم پر۔ کوئی منگیتر برداشت نہیں کرتا کہ اس کی فیانسی اس سے تو بات تک کرتے ہوئے گھبرائے اور کسی اور کے ساتھ کھلکھلاتی پھرے۔ بس میں مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تم جاؤ اب۔ یہ میرا آفس ہے، خوامخواہ کا تماشا نہیں بناؤ۔" وہ خاصی سنگدلی سے بے تاثر چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ منیرہ کی آنکھوں میں سوال اور چبھن کی جگہ حیرانی سراسیمگی اور پانی نے لے لی تھی۔

"آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے تو براہ

راست مجھ سے، میری ماں سے بات کر لیتے..... یقین کریں ہم بالکل برا نہ مانتے نہ میں کوئی ہتک فیل نہ کرتی۔ مگر یوں میری کردار کشی تو نہ کرتے..... مجھ پہ اتنا گھناؤنا الزام تو نہ لگاتے..... منگنی ٹوٹتی تو میرے کچھ ارمان ٹوٹ جاتے، کچھ خواب بکھر جاتے۔ مگر آپ نے تو بڑی سخت سزا دی ہے اس منگنی کی..... میری ہستی کو ہی برباد کر دیا۔ میری ذات کو شکوک و شبہات میں ڈال دیا۔ مجھ پر ایسی سیاہی ڈال دی کہ دھونے بیٹھوں تو عمر تمام ہو جائے۔ آپ کی بچپن سے لے کر آج تک بہت عزت کی۔ اس سب کا بدلہ آپ نے یوں دیا مجھے کہ کسی اور لڑکی کو بیوی بنانے کے لیے۔ میری پاکیزگی، حیا، کردار سب کو نشانہ بنا دیا۔ اگر میں آپ کی نظروں سے گر گئی تھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ آپ مجھے سب کی نظروں سے گرا دیں۔ بہرحال مجھے دکھ ہے تو اس بات کا کہ یہ گھناؤنا الزام آپ نے مجھ پر لگایا جس پر میں اندھا اعتماد کرتی تھی۔ ورنہ مجھے اس بات کا کوئی خوف نہیں کہ کوئی مجھے کس نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ مجھے اپنے کردار پر اعتماد ہے میری دعا ہے جس لڑکی کی خاطر آپ نے میرے کردار کو نشانہ بنایا ہے اسی سے آپ کی شادی ہو یقیناً" وہ لڑکی آپ جیسے شخص کو ڈیزرو کرتی ہے۔

میں جا رہی ہوں اور یہ بھی بتاتی چلوں کہ میں خود سے مطمئن ہوں مگر آپ کی ہستی میری نظروں میں بہت گندی جگہ پر آگئی ہے۔"

نفرت سے بولتے ہوئے اس نے آخری جملہ کہا اور آفس سے باہر نکل گئی۔ اس کے کہے الفاظ حذیفہ کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔



عظمیٰ خالہ کے گھر سے وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی تھی..... سامنے ہی برآمدے میں کلثوم بیگم کڑے تیوروں سے کھڑی تھیں۔ دادی اماں عظمیٰ کی طرف تھیں۔ وہ تیزی سے کلثوم بیگم کے قریب سے گزری اور اپنے کمرے میں آ بیٹھی۔ اپنے پیچھے اسے کلثوم بیگم کی شعلہ بار نظروں کا احساس ہوا۔ چند قدم اس کے پیچھے تھیں۔

"گھر میں کسی کو بھی بتائے بغیر کہاں گئی ہوئی تھیں تم اور وہ بھی معیز کے ساتھ۔"

"بس کریں امی جان! خدا کے لیے بس کردیں۔ کل سے آپ نے مجھے رگید کر رکھ دیا ہے۔ میری سچائی اور پاکیزگی تو نظر نہیں آرہی مگر بھتیجے کی سچائی کا کیا ثبوت ہے آپ کے پاس..... ابھی اسی کے پاس گئی تھی میں..... یہ پوچھنے کہ یہ گھناؤنا الزام مجھ پر لگاتے ہوئے اس کا ضمیر کہاں سو رہا تھا۔" کلثوم بیگم کی بات کاٹتے ہوئے وہ خاصی برہم ہو کر بولی۔

اس کی آنکھیں، چہرہ، آواز، لہجہ چیخ چیخ کر اس کے حق میں گواہی دے رہے تھے۔ کلثوم بیگم بے بس سی اسے دیکھنے لگیں۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ معیز اور عظمیٰ بیگم ساتھ ہی داخل ہوئے۔

"کیا بات ہے کلثوم آپا..... معیز بتا رہا تھا کہ یہ دونوں ابھی حذیفہ کے آفس گئے تھے۔ منیرہ جاتے ہوئے اور واپسی میں بھی بری طرح روتی آئی ہے۔ معیز پوچھتا رہا کہ کیا بات ہے مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اب اس نے مجھ سے بات کی تو میں پریشان ہو کر بھاگتی آئی ہوں۔ آپ دونوں بھی خاصی پریشان لگ رہی ہیں۔ کیا بات ہے۔" کلثوم بیگم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا بولیں۔ اچانک منیرہ کی کھنکتی آواز ابھری۔

"معیز! میں حذیفہ سے شادی نہیں کرنا چاہتی کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟" اس کے منہ سے نکلے جملے نے ان تینوں کو یکلخت ساکت کر دیا۔

"کیا کہہ رہی ہو منیرہ..... مم۔ میں تمہیں بہنوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ تم حذیفہ بھائی سے انگیجڈ ہو۔ تمہیں شرم نہیں آئی یہ سب کہتے ہوئے۔" چند لمحوں بعد معیز جیسے ہوش میں آکر بولا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے منیرہ کی یہ بات خاصی ناگوار گزری ہے۔

"حذیفہ کا خیال ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے عشق میں پاگل ہو چکے ہیں اور یہ کہ انہوں نے ہم

دونوں کو انتہائی نازیبا حرکت کرتے دیکھا ہے۔ میں سب کے سامنے ان کے اس الزام کی تصدیق کروانا چاہ رہی تھی۔" منیرہ نے اطمینان سے کہا۔ معیز اور عظمیٰ بیگم کے قدموں تلے سے جیسے زمین نکل گئی تھی۔

"یہ سب حذیفہ نے کہا ہے۔ میں، میں حذیفہ کی جان لے لوں گا اتنے گندے ذہن کے مالک ہیں وہ۔"

معیز بات سمجھ چکا تھا۔ وہ غراتے ہوئے بولا اور تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ کلثوم بیگم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑا...... "عظمیٰ ذرا دروازے کی چٹخنی لگا دو۔ میں بات چھپانے کے لیے ہلکان ہو رہی ہوں اور یہ دونوں تو پاگل ہوگئے ہیں۔ اپنا تماشا خود بنا رہے ہیں۔" کلثوم بیگم کے سامنے اب جو کچھ واضح ہوا تھا۔ اس سے ان کے اندر اور کئی نئی سوچیں وارد ہوئیں۔

"بیٹا! بیٹھو یوں جذباتی نہ ہو۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم سب ایک ہی خاندان سے جڑے ہوئے ہیں۔ میں خود سارا معاملہ دیکھ لوں گی۔ ان لوگوں کا اصل مقصد منگنی ختم کرنا تھا جو وہ ہم سے کروانا چاہتے تھے اور اس کے لیے جو ان کے ذہن میں آیا انہوں نے کیا۔ ہمیں تم دونوں پر یقین ہے۔ کوئی شک نہیں ہے۔ بس تم لوگ برداشت سے کام لو۔" کلثوم بیگم نے ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ ان لوگوں کا غصہ ختم کرنا چاہ رہی تھیں یا پھر واقعی ان کی بدگمانی دور ہوگئی تھی۔ اپنی کیفیت وہ خود نہ سمجھ پارہی تھیں۔

"منیرہ! اب میں تمہارے منہ سے اس موضوع پر کوئی بات نہ سنوں۔ عظمیٰ! تم معیز کو لے کر جاؤ اسے سمجھاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آرہی ہوں تمہاری طرف...... اماں جی ادھر آجائیں تو آتی ہوں۔"

انہوں نے چپ چاپ کھڑی بے یقینی سے سب دیکھتی اور سنتی عظمیٰ سے کہا۔ کچھ دیر بعد کمرہ مکمل خاموشی میں تھا۔ صرف منیرہ تھی کمرے میں اور اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں۔

سترہ سال کی عمر میں جب اس کے سامنے حذیفہ کا پروپوزل رکھا گیا تو حیران ہونے کے ساتھ وہ پریشان بھی ہوئی۔ وہ ہمیشہ اسے بھائیوں کی طرح سمجھتی آئی تھی۔ تاہم منگنی کے بعد مشرقی باحیا لڑکی کی طرح اس نے اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں خواب بننا شروع کر دیے۔ اس کے دل میں ارمان اور تمنائیں سر اٹھانے لگیں۔ حذیفہ کے بارے میں اس کی سوچ بدلنے لگی تھی......

اس کے نام پر وہ اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس کرتی تھی۔ اور جب وہ خود کو اس دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کررہی تھی اسی وقت وہ اس کی بدنصیبی بن گیا تھا۔ سو وہ کئی دن روتی رہی بلکتی رہی۔ تقریباً" مہینہ بھر بخار میں مبتلا رہی...... اور پھر آہستہ آہستہ اس نے سنبھلنا شروع کر دیا تھا۔



خاندان میں کسی کی فوتگی ہوگئی تھی۔ سارے گھر والے وہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ آج اتوار تھا۔ اس نے فارغ وقت کو مصرف میں لاتے ہوئے پہلے تو سارے گھر کی صفائی کی پھر ہفتے بھر کے سب کے میلے کپڑے اکٹھے کر کے دھوئے، وہ اس وقت سوکھے ہوئے کپڑے تہہ کر رہی تھی جب ڈور بیل بجی۔ وہ بیرونی گیٹ کی طرف آئی۔ سر پر دوپٹہ سیٹ کرنے کے بعد اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے کھڑے شخص کی اس کی طرف پشت تھی۔

"کون؟" اس نے بے تاثر لہجے میں دریافت کیا۔

اس کی آواز پر وہ پلٹا۔ چھ سال بعد حذیفہ کو اپنے سامنے دیکھ کر چند ثانیے کو وہ ساکت ہوئی۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے۔" اس نے بے حس لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں گھر میں کوئی نہیں ہے۔ لیکن میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"لیکن میں آپ سے ملنا نہیں چاہتی نہ بات کرنا چاہتی ہوں۔" درشتی سے کہتے ہوئے اس نے نفرت سے اسے دیکھا۔

"دو منٹ پلیز میری ایک بات سن لو۔"

"آپ کو بیٹھنے کی آفر نہیں کروں گی۔ جو بھی کہنا ہے ذرا جلدی کہیں۔" وہ اس کی طرف پشت کرتے ہوئے بولی۔

"تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ میں کوئی لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا۔ منیرہ...... مم، میں صرف اتنا چاہتا ہوں تم مجھے معاف کردو...... میں نے تم پر جو تہمت لگائی۔ اس کی کڑی سزا پائی ہے۔ مجھے ایسی بیوی ملی جسے شرم و حیا چھو کر نہیں گزری۔ جو کردار اور اس کی عظمت سے قطعاً" ناواقف ہے۔ جو شوہر کو فقط روپیہ بنانے والی مشین سمجھتی ہے۔ جو اولاد کو بوجھ اور گھر کو قید خانہ کہتی ہے۔ میں اس عورت سے نجات چاہتا ہوں۔ یقین کرو اگر تم مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہو جاؤ تو میں اسے ابھی اسی وقت طلاق دے دوں۔ پلیز تم مجھے معاف کردو۔"

وہ اچانک منیرہ کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا اور بری طرح روتے ہوئے بول رہا تھا۔ منیرہ پہلی بار کسی مرد کو کسی عورت کے قدموں میں بیٹھ کر بلک بلک کر روتے دیکھ رہی تھی اور ذرا بھی حیران نہیں تھی۔

"حذیفہ حسن! غور سے دیکھو میں وہی لڑکی ہوں جس سے چھ سال قبل آپ کی منگنی ہوئی تھی اور جس لڑکی سے جان چھڑانے کے لیے آپ نے ایک کامیاب ڈرامہ کیا تھا۔ اور شاید آپ کو علم نہیں کہ میری منگنی ہوچکی ہے۔ اور تقریباً" ڈیڑھ ماہ بعد شادی بھی ہو جائے گی۔ آپ چاہے اس وقت پوری دنیا میری خاطر چھوڑ آئیں۔ میں پھر بھی آپ کی طرف دیکھوں تک نہیں۔" اس نے بڑے سکون سے اپنا فیصلہ سنایا۔

"دیکھو منیرہ! جس شخص سے تمہاری منگنی ہوئی ہے۔ وہ بہت بڑا فلرٹ شخص ہے۔ انگلینڈ میں میرے ساتھ پڑھا ہے۔ یقین کرو کئی لڑکیوں سے اس کے تعلقات تھے۔ وہ ایک لڑکی پر رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ یقیناً" تمہارے ساتھ بھی کھیلے گا۔ تم برباد ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں اس سے بچانا چاہتا ہوں۔ میرا اعتبار کرو۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"مان لیتی ہوں وہ فلرٹ شخص ہے۔ آپ تو فلرٹ نہیں تھے۔ کبھی حذیفہ صاحب کا کوئی اسکینڈل سامنے نہیں آیا۔ پھر بھی آپ نے وہ کیا جو بڑے سے بڑا منافق بھی کرتے ہوئے کچھ جھجکتا ہے۔ وہ جو بھی ہے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ سابقہ انداز میں بولی۔

"منیرہ میں تمہیں کسی اندھے کنویں میں گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔" وہ بے بس سا ہوا۔

"مجھے آپ کے دیکھنے نہ دیکھنے کی کوئی پرواہ نہیں۔ جاسکتے ہیں آپ۔" ناگواری سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ حذیفہ بے بس سا اسے دیکھے گیا۔

ماہم کا جادو جیسے بے اختیار ہو کر سر چڑھا تھا۔ صرف کچھ عرصے بعد ہی اتر گیا۔ اسے پاکر محسوس ہوا تھا کہ وہ محبت، وہ ادائیں سب ان کچے رنگوں کی مانند تھیں جنہیں برتنے پر ہی پتا چلتا ہے کہ یہ رنگ تو صرف دیکھنے کے لیے ہی تھے۔

گھر میں شازیہ کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس کے سسرال والے ڈیٹ مانگ رہے تھے۔ میمونہ بیگم کا ارادہ تھا کہ حذیفہ کی بھی شادی کردی جائے۔ اس واقعہ کے بعد ان کا ایسا دل ٹوٹا تھا کہ وہ کسی بھی اور لڑکی کو بہو کی حیثیت سے نہیں دیکھ سکیں انہوں نے اس سلسلے میں حذیفہ سے بات کی۔

"حذیفہ بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ شازیہ کے ساتھ ہی تمہاری شادی بھی کردوں، تیاریاں تو ساری مکمل ہیں۔ اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہو تو بتا دو ورنہ پھر رشتے کروانے والی سے رابطہ کرتی ہوں۔" انہوں نے کچھ مرجھائے سے لہجے میں کہا تھا۔

"امی جان! میں اس سلسلے میں آپ سے بات کرنے ہی والا تھا۔ ماہم میری سیکریٹری ہے۔ میرے آفس میں کام کرتی ہے۔ آپ اس کے والدین سے بات کر لیں۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ میمونہ بیگم نے اس کی طرف چند ثانیے کو دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے دن وہ پھر اس سے مخاطب تھیں۔

"حذیفہ! میں نے تمہارے بابا جان سے بات کی تھی۔ وہ راضی نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے وہ لڑکی ہمارے گھرانے کے لیے بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ کافی ماڈرن قسم کی ہے اور پھر آفس میں کام کرنے والی لڑکی..... گھر کیسے سنبھال سکتی ہے۔" میمونہ بیگم سمجھا نہیں بلکہ بتا رہی تھیں۔

"امی جان منیرہ جیسی گھریلو، سادہ سی تو وہ واقعی نہیں ہے۔ مگر منیرہ کا اصل روپ دیکھ لینے کے بعد آپ کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ شادی کے بعد وہ آفس نہیں جائے گی اور اپنے انداز و اطوار بھی بدل لے گی۔ وہ "مجبوراً" جاب کر رہی ہے اور اس کا ماڈرن ہونا جاب کی ضرورت ہے۔ میں صرف اسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں قطعی پن تھا۔

میمونہ بیگم نے مزید کچھ نہ کہا۔ ان کا بھی ناز اور مان ٹوٹا تھا۔ پھر اس کی خواہش کے مطابق ماہم سے اس کی شادی ہو گئی ابتدائی دن تو دونوں نے جیسے ہواؤں میں گزارے۔

وہ ماہم کو پا کر خوش تھا بے تحاشا خوش اور اس کی خوشی کو پہلا دھچکا تب لگا تھا۔ جب وہ ہنی مون سے واپسی پہ پہلے دن آفس گیا۔ وہ کافی لیٹ آفس گیا تھا۔ لفٹ سے نکلنے کے بعد وہ کیبنز کی طرف آیا تو پہلے والے کیبن میں سے آتی آوازیں سن کر ٹھٹک کر رک گیا۔

"یار! مجھے تو لگ رہا ہے باس آج بھی چھٹی پر رہیں گے۔" یہ شاید طارق تھا۔

"ماہم کے چنگل میں پھنسے ہیں، معمولی بات تھوڑی ہے۔"

"ویسے حذیفہ صاحب کی عقل پہ بہت افسوس ہوتا ہے۔ کریم صاحب تو اتنے سمجھ دار اور مدبر قسم کے انسان ہیں آخر ان کا بیٹا اتنا احمق کیوں نکلا۔" طارق کی آواز تھی۔

"مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا باس کو ماہم میں آخر نظر کیا آیا۔ یار اس کی تو ڈریسنگ ہی اتنی بے ہودہ ہوتی ہے کہ اچھا خاصا بے شرم انسان بھی بوکھلا جائے۔ دولت، نہ خاندانی وقار، نہ دین نہ دنیا اور نہ ہی کوئی اچھا کردار۔ پتا نہیں باس نے کیا دیکھا اس میں۔" جمیل نے حیرت سے کہا تھا۔

"ویسے حذیفہ صاحب کو عورت کی پہچان نہیں ہے یا پھر انہیں ایسی ہی عورت چاہیے تھی۔ حذیفہ صاحب کے آنے سے پہلے تو وہ اپنے پرانے منیجر مرتضیٰ صاحب کو پھنسانے کے چکروں میں تھی جہاں وہ پہلے جاب کرتی تھی وہاں کے باس سے بھی تعلقات تھے۔ اس کی بیوی نے نکلوا دیا۔ اور تو اور تمہارے پیچھے بھی تو پڑی رہی تھی مگر تم ایک نمبر کے کنجوس انسان ہو، کسی کو اپنی پھٹی ہوئی شرٹ دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اسے تحائف کیسے دیتے خود ہی پیچھے ہٹ گئی۔"

طارق نے کہا تو دونوں نے قہقہہ مارا۔ حذیفہ کو ایسے لگا کسی نے اسے اٹھا کر عرش سے فرش پر گرا دیا ہو۔ اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے میں اسے خاص کمال نہیں تھا..... لہٰذا وہ انہی قدموں واپس پلٹ گیا کتنی دیر بلا مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑانے کے بعد وہ واپس آفس آیا تھا۔

ماہم کو اپنے والدین کی ناپسندیدگی کے باوجود اس نے اپنایا تھا اور اسے پانے کے لیے کسی اور کی ذات کو رگیدا تھا۔ وہ اپنی بربادی کا خود ذمہ دار تھا۔ کسی کو کیا الزام دیتا۔

ماہم گھر کے کاموں حتیٰ کہ کھانا پکانے تک میں بالکل اناڑی تھی۔ وہ اچھی خاصی خود سر تھی اور حذیفہ سے شادی نے تو اس کا مزاج آسمانوں پر پہنچا دیا..... حذیفہ نے اس کی جاب چھڑوا دی تھی۔ مگر گھر سے باہر جانے اور دلچسپیاں پالنے میں وہ شاید خاصی ماہر تھی۔ چند ہی دنوں میں اس کی سہیلیوں کی ایک کھیپ سی سامنے آ گئی۔ فلاں کی منگنی ہے تو فلاں کی برتھ ڈے۔ کسی کے بیٹے کا برتھ ڈے ہے تو کبھی کچھ۔ اسے شاپنگ کا جنون تھا۔ ایک ہی بار شاپنگ میں وہ ہزاروں روپے لٹا آتی آئے روز بیوٹی پارلر جاتی۔ اس کے اخراجات دن بدن مزید شاہانہ ہوتے جا رہے تھے۔

میمونہ بیگم ڈپریشن کا شکار ہو گئیں۔ ان کے شوہر نے آج تک جو بنایا تھا اس میں ان کی دن رات کی محنت اور لگن شامل تھی اور بہت بڑا ہاتھ میمونہ بیگم کا تھا۔ ایک امیر گھرانے سے تعلق ہونے کے باوجود شوہر کے گھر میں کفایت شعاری سے کام لیتی رہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش مشرقی اقدار کے مطابق کی تھی۔

ماہم کے لباس دیکھ دیکھ کر وہ ہولتی رہتیں۔ حذیفہ اکثر اس کے لباس پر اعتراض کرتا مگر وہ اس کے سر پر سے گزر جاتا حتیٰ کہ ایک دن کریم صاحب نے بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں میمونہ بیگم سے کہا کہ بہو کا لباس ٹھیک کروائیں۔

ماہم کی عادات نے انہیں اس قدر برگشتہ کیا کہ وہ بیٹے سے بات کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

"یہ سب کیا ہے! حذیفہ یہ بہو بیٹیوں کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے۔ اس سے کھانا پکوائی کی رسم کروائی جا چکی ہے مگر وہ کچن میں جھانکتی تک نہیں۔ کوئی حرج نہیں اگر اسے کچھ نہیں پکانا آتا..... مگر سیکھ تو سکتی ہے۔ میری ہیلپ تو کروا سکتی ہے نا مگر وہ تو کچن میں جانا اور گلاس بھی ادھر سے ادھر رکھنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ وہ گیارہ بارہ بجے سو کر اٹھتی ہے۔ پھر ڈرائیور کو ساتھ لے کر کبھی کسی سہیلی کے ہاں تو کبھی کسی کے ہاں..... شاپنگ کو نکلتی ہے تو شام کو لوٹتی ہے۔ گھر میں ہو تو سارا دن ٹی وی لگا کر بیڈ روم میں بند رہتی ہے۔ کپڑے وہ ایسے پہنتی ہے کہ مجھے اور نازیہ تک کو پسینے آ جاتے ہیں۔ تمہارے پاپا تک اعتراض کر رہے تھے اس کے کپڑوں پر۔

ابھی تم نے اتنا کمایا نہیں جتنا وہ اپنی شاپنگز اور فضول کی تفریحات میں لٹا رہی ہے۔ تمہارے بابا نے کئی سال لگائے ہیں اس بزنس میں اور تمہیں ابھی چند مہینے ہوئے ہیں شامل ہوئے..... مانا کہ سب کچھ تم لوگوں کا ہی ہے مگر یہ مطلب نہیں آنکھیں بند کر کے لٹاتے رہو اس پر.....

تمہارے بابا کہہ رہے تھے کہ اس کا الگ سے اکاؤنٹ کھلوانے کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کسی حساب سے پیسے دیا کرو۔ ویسے تو حق مہر لکھواتے ہوئے ہی ان لوگوں کا لالچ سامنے آ گیا تھا۔ مزید بدھو نہ بنو۔"

میمونہ بیگم کافی تند لہجے میں بولی تھیں ___ اس نے سر جھکاتے ہوئے ہر بات سنی تھی اور کسی بھی بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ماہم کی حرکتوں نے اسے بھی بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی دولت اور آسائشات کی بھوکی تھی۔ ملتے ہی بے دھڑک ہو گئی تھی۔

"امی جان! آپ اسے کہنے کا حق رکھتی ہیں۔ آپ کو اس کی جس بات پر بھی اعتراض ہو، برملا کہیں۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں اسے سمجھانے کی۔"

حذیفہ کی اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ روزانہ گھر میں جنگ کا سا سماں رہتا۔ وہ گھر میں قدم رکھتا اور ماہم کی شکایتوں، ساس کی برائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ وہ عاجز آ گیا۔ زندگی میں اسے کبھی اس طرح کی صورت حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے بھی ماہم پر پابندیاں لگانی شروع کر دیں۔ وقت بے وقت پیسے دینے کم کر دیے جس کا یہ رزلٹ نکلا کہ وہ دکھاوے کو ہی سہی تاہم گھریلو امور میں دلچسپی دکھانے لگی۔ حذیفہ سمجھا اب کچھ مشکل نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا مگر کچھ ہی عرصے بعد اس خبر نے گھر میں بھونچال کھڑا کر دیا کہ ماہم نے پہلے تو اپنی پریگننسی چھپائی اور پھر بغیر کسی کو بتائے اسے ختم بھی کروا دیا۔ اس بار تو کریم حسن بھی بہت چراغ پا ہوئے۔

"ٹھیک کیا اس نے، ہمیں اس سے اپنی آئندہ نسل چاہیے بھی نہیں۔ ہم حذیفہ کی دوسری شادی کریں گے اسی سے بچے ہوں گے۔" کریم حسن کی اس بات نے ماہم کے قدموں سے زمین ہی کھینچ لی۔

"حذیفہ! ابھی تو ہم نے میرڈ لائف کو ٹھیک طرح انجوائے بھی نہیں کیا۔ میں اتنی جلدی اپنا فگر خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے ایسا کیا۔" اس نے صفائی میں کہا۔

"اونہہ میرڈ لائف ۔۔۔ مطلب جانتی ہو میرڈ لائف کا۔ تمہارے نزدیک گھومنا پھرنا ۔۔۔ ہوٹلنگ کرنا ۔۔۔ ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کرنا۔ زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر رہنا' میرڈ لائف کو انجوائے کرنا ہے۔ تف ہے تمہاری سوچ پر جن عورتوں نے گھر بسانے ہوتے ہیں وہ یوں بے مہار نہیں ہوتیں۔ تمہیں میری کسی بات کی کوئی پرواہ تک نہیں ۔یہ ہی تھی تمہاری محبت کہ میرے ذریعے تمہیں دولت چاہیے تھی۔ بڑا گھر اور گاڑی چاہیے تھی تو بھول جاؤ میں تمہیں عیاشیاں کرواؤں گا۔ اس گھر پہ میری ماں کا کنٹرول ہے اور تمہیں ان کے تابع رہنا ہے اگر یہاں رہنا ہے ورنہ تمہاری اس حرکت کے بعد تم میرے دل سے اتر گئی ہو۔"

حذیفہ کے نفرت سے کہے گئے الفاظ نے اس کے اندر بھی الاؤ بھڑکا دیا۔ وہ فوراً" میکے سدھار گئی۔ پندرہ دن بعد ماں کے ساتھ لوٹی تو کافی ٹرینڈ تھی۔ پتا نہیں ماں بہنوں نے کیا کیا سمجھایا کہ اسے اپنے وجود پر پھر پردے ڈالنے پڑے۔ اس نے باہر جانا' وقت بے وقت شاپنگ کرنا خاصا کم کر دیا تھا۔ کچن میں ساس کے ساتھ ساتھ رہتی۔ نازیہ سے بھی اب اچھی خاصی گفتگو کرتی۔ اس کی اس تبدیلی پر سب ہی نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

ماہم کی کوشش تھی وہ جلد از جلد دوبارہ پریگننٹ ہو مگر پچھلے ابارشن سے کچھ ایسی پیچیدگی ہو گئی تھی کہ اس کی خواہش پوری نہیں ہو پا رہی تھی۔ ان ہی دنوں حذیفہ کو بزنس ٹور کے لیے فرانس جانا پڑا تو وہ ماہم کو بھی ساتھ لے گیا۔ تاکہ ان کے تعلقات میں کشیدگی ختم ہو جو بھی تھا اسے ماہم ہنستی مسکراتی ادائیں دکھاتی ہی اچھی لگتی تھی۔ آج کل تو وہ ویسے بھی گھریلو بیویوں کی طرح تھی بلکہ تھوڑی چڑچڑی رہتی تھی اس کے سامنے۔

تقریباً" ڈیڑھ سال بعد وہ پھر سے پریگننٹ ہوئی۔ اور اس خبر کے پھیلتے ہی گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ ان سب کو اپنے گھر میں بچوں کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔

اس کے ہاں بیٹا ہوا تھا ۔۔۔ گھر میں خوشی اور اطمینان کا عالم تھا ۔۔۔ بیٹے ہونے کی خوشی میں حذیفہ نے ماہم کو سونے کا جڑاؤ کنگن بنوا کر دیا تھا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد سب کا خیال تھا' ماہم اب مکمل طور پر گھریلو ہو جائے گی ماں بننے کے بعد اس کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ مگر یہ سب کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ بیٹے کو ماہم نے اپنے لیے ڈھال بنا لیا تھا۔ پھر وہ اپنے اصلی رنگ پر آ گئی۔ اب تو پہلے سے بھی زیادہ نڈر تھی۔ سب بوکھلا کر رہ گئے۔

حمزہ کو سارا دن میمونہ بیگم سنبھالتیں یا نازیہ اسے کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ پھر سے اس کے اور حذیفہ کے درمیان چخ چخ ہونے لگی۔ اکثر حذیفہ شام کو اس سے پہلے گھر آ جاتا اور پھر اس کی آمد کا انتظار کرتا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ ماہم کی دوستیاں صرف لڑکیوں سے نہیں' مردوں سے بھی تھیں۔ ان کے درمیان تحائف کا لین دین بھی رہتا تھا۔ ماہم کئی بار نائٹ کلب بھی جا چکی تھی۔ ماہم کی یہ ساری حرکتیں ابھی تک جاری تھیں۔

میمونہ بیگم اور کریم حسن تو جیسے اس سے بے زار ہو چکے تھے۔ انہوں نے کچھ بھی کہنا ترک کر دیا تھا اور اب تو حذیفہ بھی اس قدر تنگ آ چکا تھا کہ اسے کچھ کہنے کے بجائے اب اسے طلاق دینے کا سوچتا رہتا۔ ان گزرتے سالوں میں اسے کئی بار منیرہ یاد آئی تھی۔ اس کی معصومیت سادگی' حیا کو یاد کر کے اس کا دل چاہتا وہ اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالے جو ماہم کی اداؤں کی اسیر ہو کر ایک انمول ہیرے کو نہ پہچان سکیں ۔۔۔ وہ پھر سے اسے اپنانا چاہتا تھا۔ اور اسی لیے وہ اپنے عزیز دوست انصر سے متنفر ہو گیا تھا جو انجانے میں اس کی راہ میں آ گیا تھا۔ مگر وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا کہ منیرہ اس کے علاوہ کسی اور کی زندگی میں شامل ہو۔

"منیرہ تم میری ہو۔ میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا چاہے اس کے لیے ایک بار پھر تمہیں بدنام کرنا پڑے۔ مگر معاف کر دینا۔ شادی کے بعد اپنے ہر جرم کی تلافی کر دوں گا۔" بینچ سے کھڑے ہوتے ہوئے

وہ خود سے مخاطب ہوا ۔۔۔ پچھلی چھ سالہ زندگی کو ذہن میں دوڑاتے ہوئے وہ پھر اسی مقام پر چلا گیا تھا جہاں سے ان چھ سالوں کا آغاز ہوا تھا۔

✡ ✡ ✡

"سر! کوئی حذیفہ صاحب آئے ہیں" وہ لیپ ٹاپ پر بزی تھا جب انٹر کام پر سیکریٹری نے اطلاع دی۔ وہ چونک کر متوجہ ہوا۔

"بھیج دو ۔۔۔" اس نے کہا۔ کچھ ہی لمحوں بعد حذیفہ اس کے سامنے تھا۔

"کیسے ہو یار! آج کیسے راہ دیکھ لی ادھر کی۔ آؤ بیٹھو۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"بس کئی دنوں سے خیال آ رہا تھا۔ ملاقات کروں ۔۔۔ مگر ٹائم ہی نہیں ملتا ۔۔۔"

"کیا لو گے چائے یا کولڈ ڈرنک؟"

"نتھنگ میں ابھی چائے پی کر آیا ہوں ۔۔۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنا تھی۔ گو کہ یہ وقت اور یہ جگہ ان باتوں کے لیے مناسب نہیں مگر بعض اوقات جگہ اور وقت کے بجائے بات اہم ہوتی ہے۔ میں تمہارا زیادہ ٹائم نہیں لینا چاہتا اس لیے کوئی فضول تمہید میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسی سنجیدگی تھی جس نے انصر کو چونکا دیا۔

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔" اس نے بشاش لہجے میں کہا۔

"انصر! تمہیں ذرا حوصلہ سے بات سننا ہو گی ۔۔۔ کیونکہ میں تمہاری زندگی کے ایک حساس معاملے کو چھیڑ رہا ہوں۔" کرسی پر سے کھڑے ہو کر کھڑکی کی طرف رخ موڑتے ہوئے حذیفہ نے کہا۔

"میں ہر معاملے کے بارے میں کچھ بھی سننے کو تیار ہوں۔" انصر نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے چیئر پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"انصر میں شاید تم سے اس معاملے میں پردہ ہی رکھتا۔ مگر تم میرے دوست ہو اور اپنی لائف پارٹنر کے لیے جو تمہارے خیالات یا خواہشات ہیں ان کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔ جب تم نے پہلی بار مجھ سے منیرہ کے متعلق بات کی تھی تو میں نے کوئی خاص قسم کا ری ایکٹ نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد بھی تمہیں اس معاملے میں میری عدم دلچسپی کا احساس ہوا ہو گا۔ پہلے مجھے شبہ تھا بعد میں یقین ہوا کہ یہ وہی منیرہ ہے۔"

"حذیفہ! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" انصر ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔

"انصر! منیرہ میری سگی پھوپھو کی بیٹی ہے۔ میں انگلینڈ سے لوٹا تو گھر والوں نے بہت چاہت سے اس سے میری منگنی کر دی۔ میں خوش تھا منیرہ سے منگنی پر ۔۔۔ مگر جن دنوں ہم شادی کی تیاریاں کر رہے تھے ان ہی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ منیرہ میرے دوسرے کزن معیز کو پسند کرتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں بہت خوش رہتے ہیں۔ تم چاہتے تھے ناں کہ تمہیں ایک ایسی لڑکی ملے جس کا دل کورے کاغذ جیسا ہو ۔۔۔ صاف ستھرے کردار والی۔ ایسی ہی خواہش میری بھی تھی۔ مگر منیرہ اور معیز کو میں نے خود نازیبا حالت میں دیکھا۔ جس کی وجہ سے میری منگنی ٹوٹ گئی بلکہ میں نے خود ہی ختم کر دی۔ میں یہ سب تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کیونکہ تم میرے دوست ہو ۔۔۔ چاہو تو تحقیق کروا سکتے ہو کہ منیرہ میری کزن ہے اور مجھ سے ہی انگیجڈ تھی۔

معیز انجینئرنگ کی اعلا تعلیم کے لیے ملائیشیا چلا گیا۔ ابھی چند ماہ قبل اس کی تعلیم مکمل ہوئی ہے۔ اور وہ آنے والا ہے۔ ان دونوں کا اب بھی رابطہ رہتا ہے۔ مجھے نہیں پتا تمہارے لیے منیرہ نے کیونکر ہاں کی' جبکہ آج تک وہ ہر رشتے کو ٹھکراتی آئی ہے۔ شاید پھوپھو اور انکل نے تمہاری امارت دیکھ کر اسے مجبور کیا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے آگاہ کیا کیونکہ اگر بعد میں یہ سب تمہیں پتا چلتا تو مجھ سے ہی شکوہ ہو گا۔ اب تم بھی دوستی کا خیال رکھنا کیونکہ ہماری فیملیز کے تعلقات آپس میں کافی اچھے ہیں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ مجھ پر ہی برسیں ہم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ منیرہ تمہیں کتنی اہمیت دیتی ہے۔ شاید آج تک اس نے تم سے

ٹھیک سے بات بھی نہیں کی ہوگی۔ بس یہ ہی کہنا تھا مجھے۔"

خاموش ہونے کے بعد اس نے انصر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

☼ ☼ ☼

محبت تو بارش ہے
جسے چھونے کی خواہش میں
ہتھیلیاں گیلی ہو جاتی ہیں
مگر ہاتھ ہمیشہ خالی ہی رہتے ہیں

وہ کھڑکی کا پٹ کھولے باہر برستی بارش کو دیکھ رہی تھی۔ بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ بجلی بھی ایک دوبار گرجی مگر وہ نہ ڈری نہ سہمی..... بارش کا رخ کھڑکی کی طرف تھا۔ اس کا چہرہ بازو تقریباً" بھیگ چکے تھے مگر وہ بے حس انداز میں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی ایک جھڑی سی چھڑی ہوئی تھی۔ وہ اندازہ نہیں کر پا رہی تھی اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے یا بارش کے پانی سے..... وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بے تحاشا رو رہی تھی۔

حذیفہ کے حوالے سے اس نے خواب دیکھے تھے۔ ارمان اور آرزوئیں سجائی تھیں۔ وہ اس سے ملتی بھی رہی تھی۔ کچھ عہد و پیماں بھی ہوئے تھے اور پھر سب ملیا میٹ ہو گیا تھا۔ حذیفہ نے کمال ہوشیاری سے اس کے وجود کو ارزاں کر دیا تھا۔ انصر کے حوالے سے اس نے ابھی کوئی خواب نہیں دیکھے تھے۔ اس کے ارمانوں اور آرزوؤں پر برف سی جمی تھی۔ مگر اسے نجانے کیوں یہ توقع تھی کہ انصر اس برف کو پگھلا دے گا۔ اس کی پلکوں پہ خواب سجا دے گا۔ اس کی زندگی میں چھائی اداسی اور ویرانی کو ختم کر کے بہار کا پیغام بن جائے گا۔ وہ جانتی تھی انصر سے اس کی منگنی انصر کی خواہش کی وجہ سے ہوئی ہے۔ وہ شاہانہ زندگی گزارنے والا رئیس۔ امیر خاندان کا چشم و چراغ جو کسی بھی امیر ترین حسین ترین لڑکی سے باآسانی شادی کر سکتا تھا۔ وہ اس کا طلبگار بن کر آیا تھا۔ اپنی لائف پارٹنر کے لیے اس نے منیرہ کو چنا تھا۔ کیوں؟ وہ کسی طرح بھی خاندانی امارت کے لحاظ سے اس کے برابر کی نہ تھی۔ بلکہ کافی کم درجے پر تھی۔ کیا وہ اس کی خوب صورتی سے متاثر ہوا ہوگا۔ نہیں وہ حسین ترین لڑکیوں سے بھی ملا تھا۔ پھر کیا تھا..... کہ اس کا دل اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

شاید یہ کوئی جذبہ تھا..... جذبہ محبت' منیرہ عباس احمد سمجھنے لگی تھی کہ انصر ہی وہ شخص ہے جو اس کی زندگی میں محبت بن کر آئے گا۔ مگر وہ بھی اسے بیچ راہ میں چھوڑ گیا تھا۔ ایک نئے اور انجانے راستے پہ لا کے خود ہی غائب ہو گیا تھا۔

آج صبح دس بجے ممتاز بیگم کا فون آیا تھا وہ کہہ رہی تھیں۔

"انصر یہ منگنی ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ واپس یورپ جا رہا ہے۔" سب حیران تھے اور وہ دنگ رہ گئی تھی ایک بار پھر وہ خود کو کھلونے کی طرح استعمال کیے جانے پر ساکت رہ گئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر فرق پڑ رہا تھا۔

اس کے دل میں درد اٹھ رہا تھا۔ آنکھیں بے اختیار ہو کر برس رہی تھیں۔ اس کا دل رو رہا تھا اور وہ دل کی پکار پر خود بھی سراسیمہ تھی۔ اس کا دل محبت محبت طلب کر رہا تھا۔ دل محبت کرتا ہے تو تب ہی محبت مانگتا ہے نا..... کیا اسے انصر سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے مہینہ بھر ہو چکا تھا انگلینڈ آئے ہوئے..... مگر سکون کا ایک پل نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس وقت بھی رات کے دو بجے وہ سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا مگر نیند تھی کہ جیسے کوسوں دور چلی گئی تھی۔ ایک مہینہ قبل اسے اپنے بارے میں ایسا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کسی کی یاد اور محبت میں رات رات بھر جاگ سکتا ہے۔ منیرہ کیا تھی۔ اس کی آئیڈیل..... وہ ان خوش نصیبوں میں تھا جنہیں مل جاتا ہے وہ بھی اسے مل گئی بغیر کسی دقت اور پریشانی کے..... پھر کیا ہوا کہ اس نے خود ہی اسے ٹھکرا دیا۔

وہ اس کے دوست کی سابقہ منگیتر تھی..... اس کا دوست بھی اسے ٹھکرا چکا تھا۔ کیونکہ وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی اور جس کو پسند کرتی تھی اس سے اس کو کوئی اجتناب نہیں تھا۔ مگر انصر سے اس نے اجتناب برتا تھا اسے فون تک پہ اس سے باتیں کرنا گوارا نہیں تھا۔

منگنی ختم کرتے وقت وہ بے چینی' اضطراب اور یاسیت کا شکار تھا مگر اس کا خیال تھا' انگلینڈ جا کر وہ سب بھول جائے گا۔ لہٰذا فوراً" ہی وہ انگلینڈ چلا گیا۔ مگر وہاں جا کر اسے احساس ہوا۔ بے سکونی' بے چینی' بے قراری کہتے کس کو ہیں۔ گرل فرینڈز' پارٹیز' سیر و تفریح' ہلا گلہ اسے کہیں کوئی چارم نظر نہیں آتا تھا۔

دل کا درد اتنا بڑھ چکا تھا۔ منیرہ کا چہرہ اس کی باتیں' اس کی آنکھیں جیسے اس کے حواس سلب کرنے لگی تھیں اور بالآخر وہ جان گیا تھا' محبت اسی کو کہتے ہیں۔ مگر اسے منیرہ سے محبت کیوں ہوئی تھی اس میں ایسی کون سی بات تھی جس نے انصر جیسے دل پھینک اور ہرجائی شخص کے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ ان آنکھوں میں ایسی کیا بات تھی جو اسے تڑپا رہی تھیں..... وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

☼ ☼ ☼

معیز کو پاکستان آتے ہی ان سب حالات کا علم ہو گیا تھا اور وہ منیرہ سے خوب لڑا تھا۔

"آخر کب تک تم حذیفہ کے ہاتھوں خود کو برباد کرتی رہو گی..... انصر کو ساری صورت حال کیوں نہیں بتائی۔ گھر والوں کو کیوں نہیں بتایا کہ حذیفہ تمہارے پاس آیا تھا اپنے جرم کی معافی مانگنے نہیں بلکہ تمہیں مانگنے جسے اس نے بے دردی سے ٹھکرایا تھا۔ جب اس نے تمہیں بتایا کہ انصر اس کا دوست رہ چکا ہے اور اس کے کردار کے بارے میں تمہیں ورغلانا چاہا تو کیا یہ

ممکن نہیں کہ وہ انصر کو جا کے تمہارے خلاف بھڑکا دے اور ایسا ہوا بھی تب جب وہ دو دن قبل تم سے مل کر گیا تھا جب تمہاری طرف سے اسے رسپانس نہیں ملا تو اس نے انصر کو آلہ کار بنا لیا اور وہ مکاری کر کے ایک بار پھر جیت گیا۔"

معیز کی بات پر منیرہ ہکا بکا سی اسے دیکھنے لگی۔

"منیرہ! بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے تمہاری عقل پر۔ پتا ہے تم سمجھ داری اور ذہانت میں مجھ سے کئی قدم آگے تھیں بلکہ اوروں سے بھی..... مگر اپنی زندگی کے اتنے اہم معاملے میں تم نے بہت بے وقوفی کا ثبوت دیا ہے۔ تم انتہائی کم ہمت نکلی ہو..... مگر میں یہ سب نہیں ہونے دوں گا خود بات کروں گا انصر بھائی سے۔ بہت ہو گیا۔" وہ اٹل انداز میں کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ منیرہ اسے روک نہ پائی۔ حذیفہ حسن کی اس نئی چال پر وہ سکتہ میں آگئی تھی۔

معیز نے نجانے کیسے انصر کا نمبر حاصل کیا اور پھر اسے کال کی تھی۔ ابتدائی باتوں کے بعد انصر نے اس سے اس کا نام پوچھا تھا۔

"سوری۔ میں اپنا نام نہیں بتاؤں گا' آپ کو' جب تک آپ پر اپنے دوست حذیفہ کی اصلیت نہ ظاہر ہو جائے۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"حذیفہ میرا دوست ہے مگر مجھے اس کی اصلیت میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔" اس نے بھی اسی انداز میں کہا۔

"منیرہ میں تو ہے۔" انصر جواب میں چپ رہ گیا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" اس نے بے ساختہ پوچھا اور پھر معیز نے اسے منیرہ کی حذیفہ سے منگنی سے لے کر آج تک کی ساری حقیقت بتا دی۔

"مسٹر انصر آپ کا دوست ایک نمبر کا مکار انسان ہے۔ وہ منیرہ کو پھر سے حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ اپنی بیوی سے تنگ آچکا ہے۔ اس کے لیے اس نے وہی پرانا کھیل کھیلا جو اس نے ماہم کو حاصل کرنے کے لیے کھیلا تھا۔"

انصر سکتے کے عالم میں اس کی باتیں سنتا رہا۔

"اور اب میں آپ کو اپنے بارے میں بھی بتا دیتا ہوں۔ میں معیز..... ل..... جو منیرہ کا ہم عمر' کلاس فیلو اور کزن ہونے کے ناتے شروع سے اس کے قریب رہا مگر قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں میں سگی بہن سے بھی زیادہ اس کی عزت کرتا ہوں۔ اور اس کا ثبوت اس بات سے دیتا ہوں کہ میٹرک میں اپنی کلاس فیلو آصفہ سے میری دوستی ہو گئی تھی جو منیرہ کی بیسٹ فرینڈ بھی ہے اور منیرہ شروع سے آگاہ ہے۔ یہ دوستی جو بعد میں محبت میں بدل گئی' آج تک قائم ہے اور اس میں بڑا ہاتھ منیرہ کا ہے۔ جب میں تعلیم کے لیے ملائشیا میں تھا تو منیرہ نے ہی اسے میرے لیے روکے رکھا ورنہ اس کے والدین اس کی جلد شادی کرنا چاہتے تھے۔ منیرہ نے ہی میرے گھر والوں کو آصفہ کے لیے راضی کیا اور اب میں بہت جلد اس سے شادی کرنے والا ہوں لہٰذا آپ۔"

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی کیونکہ فون بند ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بڑے منہمک انداز میں فائل میں گم تھا جب اسے اپنے آفس کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے سنا تھا انصر واپس انگلینڈ جا چکا ہے مگر وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"انصر تم!" وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں میں..... بے وقت اور بے موقع آنے کی معافی چاہتا ہوں مگر میں بھی آج بس کھڑے کھڑے ہی چند باتیں کرنا چاہوں گا کیونکہ تمہارا وقت اور کام اہم ہیں۔" اس کے لہجے میں چبھن' طنز اور نفرت تھی۔ حذیفہ چونک گیا۔

"حذیفہ! جب میں انگلینڈ میں تھا تو تم پر بہت رشک کرتا تھا اور تم سے بہت متاثر تھا۔ کیونکہ تم میں ایسی بہت سی خوبیاں تھیں جو ایک اچھے مسلمان میں ہونی چاہئیں..... جبکہ میں ہر قسم کی برائی میں ملوث تھا۔ اس میں بڑا ہاتھ روپے پیسے کی فراوانی کے علاوہ میرے

ماحول اور اسٹیٹس کا تھا۔ میرے والدین ماڈرن سوسائٹی کی نمائندگی کرنے والے مجھے بھلا کیونکر سمجھاتے..... انہوں نے مجھے پوری آزادی دی اور اس آزادی کو میں نے خوب استعمال کیا مگر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا تھا۔ اک احساس زیاں ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ میں جب موت قبر اور حشر کے بارے میں سوچتا تو خود سے نفرت محسوس ہونے لگتی۔ اور پھر ایسی ہی صورت حال میں میں نے ارادہ کر لیا کہ ماڈرن سوسائٹی کی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ بلکہ ایسی عورت کو اپنی زندگی میں شامل کرنا ہے جو مجھے برائی سے کھینچنے کے علاوہ میری آئندہ نسل کو سنوار دے۔ میں جانتا ہوں ایک اچھی بیوی شوہر پر کتنا اثر انداز ہوتی ہے خاص کر ماں کے روپ میں اس کا رول کتنا اہم ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میں پاکیزہ زندگی گزاروں اور مرنے کے بعد میری نیک اولاد میرے لیے صدقہ جاریہ بن جائے۔ منیرہ مجھے اپنے اسی آئیڈیل کے روپ میں ملی اور تم حذیفہ! جس پر میں رشک کرتا تھا کہ اس شخص کو کبھی کوئی احساس زیاں نہیں ستائے گا۔ کیونکہ اس کا کردار بہت صاف ہے۔ اس کی زندگی میں اس کے اعمال میں کوئی گناہ شامل نہیں مگر آج مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے تم نے اپنے ہاتھوں اپنے لیے احساس زیاں پالا۔

خود غرضی کے ہاتھوں مجبور ہو کر تم نے ہر رشتے کو دھوکا دیا۔ ماں باپ' منگیتر اور پھر دوست کو بھی دھوکا دیا..... تم نے میرا بہت بڑا نقصان کر دیا تھا مگر معیز نے بچا لیا میں ساری عمر اس کا ممنون رہوں گا۔ آج مجھے اس بات پر مکمل یقین آگیا کہ اللہ نیتوں کو دیکھ کر دیتا ہے میری اور تمہاری دوستی مزید قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے میں کم از کم تمہیں کسی فریب میں نہیں رکھنا چاہ رہا۔ اوکے بائے۔" وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ وہ جا چکا تھا حذیفہ کو جیسے منجمد کر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

حجلہ عروسی میں وہ تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر بیٹھی تھی۔ اس کا حسن شعلے کی طرح دہک رہا تھا۔ اس کا ہم سفر اسے چاہنے والا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے رونمائی میں نایاب پتھر اور ہیرے جڑا کنگن دیا تھا۔ جسے وہ بڑے ناز سے چھو رہی تھی۔

"بیوی ہونے کی حیثیت سے مجھے آپ سے صرف ایک وعدہ چاہیے۔" اس نے خوب صورت لہجے میں پوچھا۔

"میں ہزار وعدے کرنے کو تیار ہوں۔ کہو کیا کہتی ہو۔" وہ والہانہ انداز میں بولا۔

میں صرف یہ چاہتی ہوں آپ کبھی کسی معاملے میں مجھ سے جھوٹ نہیں بولیں بلکہ مجھ پر اعتبار کر کے صاف صاف بات کریں۔"

"تمہیں ان معاملات میں کبھی مجھ سے شکایت نہیں ہو گی..... اور ہاں مجھے تم پر اتنا اعتبار ہے کہ اگر تم دن کو رات کہو گی تو میں مان لوں گا!" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پریقین لہجے میں کہا۔

"یہ حکم تو بیوی کے لیے ہے۔" وہ برجستہ بولی۔

"اگر بیوی کردار اور تقویٰ کے لحاظ سے شوہر سے بلند مقام پر کھڑی ہو تو شوہر کے لیے ایسا کرنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔"

منیرہ کے ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ منیرہ کو قدرت نے آزمائش کے بعد انصر کی شکل میں انعام سے نوازا تھا۔ ☆

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

اجلال رازی اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نامناسب گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچا لیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اسپتال میں اریبہ کے پاس ساجدہ بیگم ٹھہری ہوئی ہیں۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہے۔ شمشیر علی، توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد نے اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہا۔ بعد میں انہیں پتا چلا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اریبہ ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے۔ وہ اسے شہباز درانی کے ساتھ دیکھ چکی ہے۔

رازی، اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔

تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ دل گرفتہ سا ہسپتال جا کر تاجور کا معلوم کرتا ہے مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔



وہاں سے وہ گاؤں جاتا ہے مگر ابا کو نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہو جاتی ہے۔ سارہ' سمیر سے الجھی ہوئی گفتگو کرتی ہے۔
یاسمین' اریبہ کی جلد شادی کی فکر میں پڑ گئی مگر اریبہ سختی سے منع کر دیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو ڈنر پر مدعو کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ بھی الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ جا رہا ہے۔ اریبہ اور اجلال اسے سی آف کر کے واپسی میں سی ویو جاتے ہیں۔ وہاں اسے سارہ کا خیال آ جاتا ہے۔ وہ گھبرا کر واپس آ جاتا ہے۔

11
گیارہویں قسط

زندگی اس کے لیے ایسا امتحان بن جائے گی کہ دو گام چلنا مشکل ہو جائے گا۔ ایسا شمشیر علی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی محنت سے زینہ بہ زینہ ترقی کی منازل طے کر رہا تھا اور بہت مطمئن تھا۔ کبھی کبھی سیدھی شفاف سڑک پر جیسے اچانک ڈھلوان آ جاتی ہے کہ چلنے والے کو پتا ہی نہیں چلتا اور وہ منہ کے بل جا گرتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہ ہوا تھا۔ تیز روشنی کے بعد اچانک گھپ اندھیرا تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاباں کے ساتھ شام بھی کب کی رخصت ہو چکی تھی اور وہ ابھی بھی وہیں بیٹھا تھا۔ نہر والے باغ کے اسی مخصوص گوشے میں جو دن کے اجالے میں جتنا خوب صورت دکھائی دیتا تھا' اب اسی قدر خوفناک لگ رہا تھا۔ لیکن وہ یہ سب کہاں سوچ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو بس ایک ہی منظر ٹھہر گیا تھا۔
تاباں جا رہی تھی۔ اس کی زندگی جا رہی تھی۔ اب اس کے پاس کیا تھا۔ جینے کو بھی بہانہ چاہیے اور یہاں سارے بہانے ختم ہو گئے تھے۔ لیکن نہیں۔ ابھی کچھ باقی تھا۔ نہر کے اس طرف خانہ بدوشوں کے خیموں میں شمعیں روشن ہو رہی تھیں۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا پھر بھاگنے لگا تھا۔ اور جب گھر پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔
”کہاں چلا گیا تھا؟“ ابا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا وہ ان کے سامنے بچھی چارپائی پر ڈھے گیا۔
”دیکھ شمشیر علی!“ ابا اس کی کیفیت سے بے خبر اپنا بولنا شروع ہو گئے۔
”تو یہاں اس گاؤں کا جم پل ہے۔ تجھے شہر راس نہیں آئے گا۔ بندہ اڑان اتنی بھرے جتنی پروں میں طاقت ہو۔ نہیں تو پھر پھڑانے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔“
اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں شاید کان بند کرنا چاہتا تھا۔
”تو نے اپنا پڑھنے کا شوق پورا کر لیا۔ نوکری کر کے بھی دیکھ لی اب ادھر ہی آ جا۔ میرے ساتھ کھیتی باڑی کر' کم از کم اپنی زمین دغا تو نہیں دے گی نوکری کی طرح۔ سن رہا ہے ناں۔“
”ہوں......!“ اس نے پورا زور لگا کر ہوں کی آواز نکالی تھی۔ یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس وقت اختلاف کی پوزیشن میں نہیں تھا۔
”تاجور کو بھی لے آ۔ اکیلی لڑکی کو ادھر چھوڑ آیا ہے۔ کچھ غیرت ہے تجھ میں کہ نہیں۔“ ابا نے جانے انجانے میں اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ بلبلا کر اٹھا تھا۔
ابا! بولنے سے پہلے کچھ سوچ بھی لیا کریں۔“
”کیا سوچ لوں۔ بول۔ سچ بات کڑوی لگتی ہے تجھے۔ حیا مر گئی ہے تیری۔ کان کھول کے سن لے شمشیر میری بیٹی کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوئی تو میں تجھے نہیں بخشوں گا۔“ ابا ہتے سے اکھڑ گئے تھے اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی غصہ

ان کی ناک پہ دھرا رہتا تھا۔ لیکن جو کچھ وہ کہہ رہے تھے' اسی خوف سے تو اس کی جان پہ بنی ہوئی تھی۔ وہ بار بار مر رہا تھا اور ہر بار تاجور کی پکار اسے جیسے قبر میں سے کھینچ لاتی تھی۔
”سویرے جا کر تاجور کو لے آ۔“ ابا حکم صادر کر کے لیٹ گئے۔ اس کا دل چاہا۔ ابا کے پیروں سے لپٹ کر بہت روئے اور انہیں بتائے کہ وہ تاجور کو کھو چکا ہے لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی اور ہمت تو اس کی دو قدم چلنے کی بھی نہیں تھی پھر بھی اس نے اسی وقت جانے کی ٹھان لی تھی۔
”سویرا دور ہے ابا! میں ابھی جا رہا ہوں۔“ وہ بمشکل بول پایا پھر ابا کے پیر چھو کر گھر سے نکل آیا تھا۔
رات بھر کی مسافت کے بعد وہ کراچی پہنچا تو اس وقت فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ اس کے پاس اپنا ٹھکانا تو تھا نہیں۔ بس سے اترا تو رکشہ پکڑ کر سیدھا فضل کریم کے گھر جا پہنچا۔
”لے باؤ! تجھے آنا تھا تو فون کر دیتا۔ میں تیرے۔ لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیتا۔ ایویں اتنی دیر باہر کھڑا رہا۔“ اس کے مسلسل دروازہ پیٹنے کے باوجود فضل کریم کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔ مزید اسے الزام دیتے ہوئے فضل کریم واپس اپنی جگہ پر گر کر سو گیا۔ اور وہ بھی اب صرف سونا چاہتا تھا کیونکہ بس کے سفر نے بری طرح تھکا دیا تھا پھر بھی وہ لیٹتے ہی سو نہیں گیا تھا۔ کتنی کروٹیں بدلیں۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ گیا یہاں تک کہ اجالا پھیلنے لگا تھا تب کہیں جا کر نیند مہربان ہوئی تو پھر وہ بہت لمبا سویا تھا۔
دوپہر ڈھل رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی تو پہلے اس نے اپنے طے شدہ پروگرام کو نئے سرے سے سوچا جس میں سرفہرست روزگار حاصل کرنا تھا گو کہ اس کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم موجود تھی کہ اس کے چھ آٹھ مہینے آرام سے گزر سکتے تھے' لیکن وہ اتنی رقم پر تکیہ کر کے فارغ نہیں بیٹھ سکتا تھا اور فی الحال اسے فل ٹائم جاب بھی نہیں کرنا تھی کیونکہ اس طرح پابند ہو کر وہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا جبکہ اسے تاجور کو تلاش کرنا تھا۔ اس لیے اس نے پارٹ ٹائم جاب کا سوچا تھا اور ابھی اسی سلسلے میں ایک دو جاننے والوں سے ملنے کا سوچ کر وہ اٹھ گیا تھا۔



تاجور نے قرآن پاک پڑھنے کے ساتھ بی بی سے نماز بھی سیکھ لی تھی اور اب وہ باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگی تھی جس سے اس کے اندر مستقل جو ایک بے چینی اور بے صبری کی کیفیت تھی' اس میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ یعنی وہ جو بیٹھے بیٹھے تڑپ اٹھتی تھی۔ دل چاہتا بس فوراً اپنے بھائی کے پاس پہنچ جائے یا اس کا بھائی آ جائے تو اب ایسا نہیں تھا۔ رب سے رجوع کر کے اس کے اندر ٹھہراؤ آ گیا تھا اور وہ ہر نماز میں اپنے بھائی کی سلامتی اور عافیت کی دعا کرتی۔ اس وقت مغرب کی نماز کے بعد وہ ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی۔
”میرے اللہ' میرا بھائی جہاں کہیں بھی ہے' اسے اپنی امان میں رکھنا۔ میرے بھائی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ وہ ہر امتحان میں پاس ہو۔ میرے اللہ میرے بھائی کو گھر دے دے' پھر وہ آ کر مجھے لے جائے۔ میرے اللہ میرے بھائی کی مدد کر۔ آمین۔“
منہ پر ہاتھ پھیر کر وہ اٹھی اور جانماز لپیٹ کر پلٹی تو سارہ کو کھڑے دیکھ کر کچھ کنفیوز ہو گئی تھی۔
”بھئی واہ! بہن ہو تو تمہارے جیسی۔“ سارہ اسے سراہ کر کہنے لگی۔ ”بہت خوش قسمت ہے تمہارا بھائی۔ مجھے یقین ہے وہ جہاں کہیں بھی ہو گا' تمہاری دعاؤں کے حصار میں ہو گا۔“ تاجور نا سمجھی کے عالم میں سارہ کو دیکھے جا رہی تھی۔
”ایسے کیا دیکھ رہی ہو' میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم بہت خالص لڑکی ہو۔ تم پر دنیا کا رنگ نہیں چڑھا۔ چڑھنے بھی

مت دینا۔ دنیا بہت بری ہے۔ ہر رنگ میں بری ہے۔"

"مجھے آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہیں باجی۔" تاجور کے لہجے میں نہ سمجھنے کا ملال تھا۔

"اچھا ہے' کچھ مت سمجھو' ساری خرابی ہی سمجھنے میں ہوتی ہے۔" سارہ نے کہہ کر یوں سر جھٹکا جیسے کسی تکلیف دہ کیفیت سے نکلنا چاہتی ہو۔

"باجی! ایک بات پوچھوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گی؟" تاجور سے سادگی سے کہا۔

"پوچھو......" سارہ نے پہلے بے دھیانی میں کہا پھر ایک دم اسے دیکھنے لگی تھی۔

"آپ کے ابا آپ کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟" تاجور پوچھتے ہوئے خائف ہو گئی تھی۔ سارہ کو ہنسی آگئی۔

"میرے ابا ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے' اس لیے کہ انہوں نے دوسری شادی کی ہوئی ہے۔ وہاں رہتے ہیں دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ۔"

"ہیں......!" تاجور کی حیرت میں ڈوبی "ہیں" پر سارہ خاصی محظوظ ہوئی پھر کہنے لگی۔

"ہاں۔ اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ تمہارے ابا نے بھی تو دوسری شادی کی ہے۔"

"ہاں پر میری اماں تو۔" تاجور نے خود ہی بات ادھوری چھوڑ دی لیکن سارہ سمجھ گئی تھی جب ہی بے ساختہ بولی تھی۔

"میری اماں زندہ ہیں اور بہت پیاری بھی ہیں۔ یہی سوچ رہی ہو ناں تم۔"

"جی......!" تاجور نے فوراً" اثبات میں گردن ہلائی تھی۔ سارہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر نفی میں سر ہلا کر بولی تھی۔

"تم نہیں سمجھ سکو گی یا شاید میں تمہیں نہیں سمجھا سکوں گی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں باجی مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ تاجور نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا تھا۔

"لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو تاجور! کبھی کسی پر بھروسا مت کرنا۔" سارہ اچانک بہت سنجیدگی سے کہہ کر پھر ایک دم اس کے کمرے سے نکل گئی تھی اور یہ نہیں تھا کہ سیدھی سادی بات تاجور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ سمجھ میں نہ آنے والا سارہ کا پل پل بدلتا رویہ تھا۔ وہ اچانک ہنستی تھی اور اچانک یوں ہو جاتی جیسے وہ ہنسنا جانتی ہی نہیں۔ اس طرح تاجور جتنا اس کے قریب ہوتی اسی قدر دور ہو جاتی تھی۔

"کیا ہو جاتا ہے سارہ باجی کو۔" وہ سوچنے لگی تھی کہ اچانک روٹی پکانے کا خیال آنے پر اس کا دھیان بٹ گیا۔ فوراً" کمرے سے نکل کر کچن میں آئی تو بی بی چولہے پر توا رکھ رہی تھیں۔

"میں آگئی ہوں بی بی! آپ ہٹ جائیں۔" وہ بی بی کو ہٹا کر جلدی جلدی پیڑے بنانے لگی۔

"تم نکما کر دو گی مجھے۔ چلی جاؤ گی تو مجھے کتنی پریشانی ہوگی۔"

بی بی سنک پر ہاتھ دھوتے ہوئے بول رہی تھیں اور اسے یہ سننا بہت اچھا لگتا تھا۔ دل چاہتا بی بی سے لاڈ کرتے ہوئے کہے "میں کہیں نہیں جاؤں گی بی بی" لیکن اپنے دل کی اس معصوم خواہش کو وہ ہمیشہ دبا دیتی تھی کیونکہ اسے خود پتا نہیں تھا کہ وہ کب تک یہاں رہے گی۔ بہرحال اس گھر کے مکینوں سے وہ نہ صرف مانوس ہو گئی تھی بلکہ محبت بھی کرنے لگی تھی۔ بس ایک یاسمین تھی جس سے وہ خائف رہتی تھی گو کہ یاسمین اس سے بات کرنا تو دور کی بات' کبھی غلطی سے اسے مخاطب بھی نہیں کرتی تھی مزید دیکھ کر بھی انجان بن جاتی تھی۔ شاید اس کی طرف سے حد سے زیادہ نظر انداز ہونے پر ہی وہ خائف تھی اور کوشش کرتی تھی کہ یاسمین سے سامنا نہ ہونے پائے۔ اس لیے وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں یا پھر بی بی کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

"کھانا ابھی لگا دوں بی بی!" اس نے روٹی پکانے سے فارغ ہو کر پوچھا۔

"نہیں بیٹا! اتنی جلدی تو کوئی نہیں کھاتا۔ پھر ابھی حماد اور اریبہ بھی نہیں آئے۔" بی بی نے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

"اریبہ باجی کہاں گئی ہیں۔"

"اپنی تائی کے ہاں جانے کا کہہ رہی تھی اور ہاں' تمہیں بھوک لگی ہو تو تم کھالو۔" بی بی نے جواب کے ساتھ کہا۔

"ابھی نہیں بی بی! نماز کے بعد۔" وہ کہہ کر کچن سے نکلی تو پھر اپنے کمرے میں جا بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

اریبہ شام سے ساجدہ بیگم کے ہاں آئی ہوئی تھی اور اس نے گھر سے نکلتے وقت ہی اجلال رازی کو فون کیا تھا کہ وہ اس کے گھر جا رہی ہے' اس کے باوجود اجلال رازی نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی مزید معذرت کے بجائے انجان بن کر پوچھ رہا تھا۔

"ارے! تم کب آئیں؟"

"بس آگئی۔" اریبہ کو ساجدہ بیگم کی موجودگی کے باعث ضبط کرنا پڑا تھا۔

"چلو بیٹا جلدی سے کپڑے بدل کر آجاؤ میں کھانا لگواتی ہوں۔" ساجدہ بیگم نے اٹھتے ہوئے اجلال رازی سے کہا تو اریبہ بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ انتظار کے بعد رازی کے رویے نے اسے بددل ہی نہیں' ٹھیس بھی پہنچائی تھی۔

"تائی امی! میں اب چلوں گی۔"

"ہائیں! ایسے کیسے جاؤ گی' کھانا کھا کر جانا۔" ساجدہ بیگم نے ٹوک کر کہا۔

"نہیں تائی امی! مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ شام میں آپ نے اتنا کچھ کھلا دیا تھا۔ اب کھانا تو میں کھاؤں گی ہی نہیں۔" اس نے بھوک نہ ہونے کی وجہ بھی بتا دی پھر بھی ساجدہ بیگم اصرار کرنے لگیں۔

"بیٹا! تھوڑا سا کھالو۔ اچھا نہیں لگتا عین کھانے کے وقت تم چلی جاؤ۔"

"کوئی ایسی بات نہیں ہے تائی امی! آپ محسوس نہ کریں میں پھر آجاؤں گی۔" وہ کہتے ہوئے ساجدہ بیگم کے گلے لگ گئی اور انہیں مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا' خدا حافظ کہہ کر تیز قدموں سے باہر نکل آئی اور ابھی گاڑی کا لاک کھول رہی تھی کہ عقب سے اجلال رازی نے اس کے کندھے تھام لیے۔

"ناراض ہو کر جا رہی ہو؟"

"کیوں میں کیوں ناراض ہوں گی۔ مجھے کیا حق ہے تم سے ناراض ہونے کا۔" وہ اچانک بکھر گئی تھی۔ "اب تو سارے حق تمہارے ہیں۔ چاہو پیار سے بلاؤ' چاہو دھتکار دو۔ میری برا ماننے کی اوقات ہی نہیں رہی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو اریبہ! پاگل تو نہیں ہو گئیں۔" اجلال رازی پریشان ہو گیا تھا۔

"نہیں۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ سب سمجھتی ہوں۔ مجھے بتاؤ تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو۔ محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک نفرت سے منہ موڑ کر کیوں چل دیتے ہو۔ بتاؤ رازی بتاؤ۔" وہ اس کے دونوں بازو تھام کر جھنجھوڑنے لگی تھی۔

"تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی تو صاف کہہ دو۔ خود پر جبر مت کرو رازی! اور نہ مجھے اذیت دو۔ میں ایک ہی بار تمہاری بے وفائی کا ماتم کر لوں گی۔ یوں مر مر کے جینا مجھے سچ مچ مار ڈالے گا۔ میں مر جاؤں گی رازی۔"

"اریبہ، اریبہ!" اجلال رازی اس کا چہرہ ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا لیکن وہ مچل رہی تھی۔ آنسو بے تحاشا بہہ رہے تھے۔

"میری بات سنو اریبہ! مجھے غلط مت سمجھو میں نے صرف تم سے محبت کی ہے، صرف تم سے۔ میرے دل میں صرف تم بستی ہو صرف تم۔"
"مت بہلاؤ مجھے تمہارا بار بار اجنبی بن جانا میرے دل میں ترازو ہو گیا ہے۔" وہ اسے دھکیل کر پھر گاڑی کا لاک کھولنے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔
"دیکھو! ایسے مت جاؤ۔ تم ابھی ڈرائیو نہیں کر سکو گی۔" اجلال رازی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔
"تم!" وہ انتہائی تنفر سے جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ اجلال رازی نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔
"بس۔ تم نے جو کہنا تھا کہہ دیا اور میں ابھی کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ تم اس وقت غصے میں ہو، میری بات نہیں سمجھو گی۔ الٹا اور ناراض ہو گی..... چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔"
"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔" وہ روٹھے لہجے میں بولی تھی۔
"ضد نہیں کرتے اریبہ۔" وہ بہت پیار سے اس کے آنسو صاف کر رہا تھا۔
"میں ضد نہیں کر رہی۔" اریبہ نے آہستگی سے اس کے ہاتھ ہٹائے پھر اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

اب اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئی تھی۔ اسے انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اجلال رازی خود آ کر اپنے رویے پر نادم ہوتا اور وضاحت بھی کرتا کہ وہ کسی بھی پر اچانک ناراض کیوں ہو گیا تھا۔
"اسے وضاحت تو کرنی پڑے گی۔ میں کیوں خود کو اتنا گرا رہی ہوں۔" اسے سارہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔
"مت خود کو اتنا گراؤ کہ دوسرا ساتویں آسمان پر پہنچ جائے۔ دھڑلے سے سر اٹھا کر جیو۔ یہ تمہارا حق ہے۔ کوئی تمہارے سامنے کھڑا نہیں رہ سکتا۔"

بے وقوف ہے سارہ اور انجان بھی اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ہم کس ماں کی بیٹیاں ہیں تو وہ بھی شرم سے سر نہیں اٹھا سکے گی۔" وہ اپنی بے وقعتی پر کڑھتے ہوئے گھر آئی تو اپنے کمرے میں بند ہو جانا چاہتی تھی لیکن وہاں پہلے ہی سارہ موجود تھی۔
"اتنی دیر کر دی۔" سارہ نے فوراً ٹوکا لیکن پھر اس کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ "کیا بات ہے اریبہ! سب ٹھیک تو ہے ناں؟"
"ہاں سب ٹھیک ہیں، بس ایک میں ہی غلط ہوں۔" وہ کہہ کر واش روم میں بند ہو گئی تھی۔



اجلال رازی کے اندر مستقل ایک جنگ جاری تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اریبہ اس کی زندگی تھی۔ اس کے دل میں ساری آرزوئیں صرف اسی کے لیے مچلتی تھیں۔ لیکن اس کا ذہن قدم قدم پر اسے احساس دلاتا تھا کہ وہ کچھ بھول رہا ہے۔ کوئی ہے، جس کے خاموش آنسو اسے کبھی چین نہیں لینے دیں گے اور وہ اریبہ کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکے گا۔
اور یہ اس عورت کی گود اور تربیت کا اثر تھا جو وہ کسی طرح بھی خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے پا رہا تھا۔ حالانکہ دل مسلسل اکساتا تھا کہ حادثہ ہی تو تھا۔ بھول جاؤ۔ اور واقعی کتنے دنوں تک اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا لیکن پھر

اچانک کوئی بات اسے آسمان سے زمین پر لا پٹختی تھی۔ وہ بلبلا اٹھتا اور اب تو اریبہ نے بھی نہ صرف محسوس کر لیا تھا بلکہ اس سے سوال بھی کر رہی تھی کہ وہ اچانک اس سے دور کیوں ہو جاتا ہے۔
"مجھے بتاؤ رازی! محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک نفرت سے منہ موڑ کر کیوں چل دیتے ہو۔"
"میں کیسے بتاؤں اریبہ کو اور کیا بتاؤں۔" کتنے دنوں سے وہ اپنے آپ میں الجھ رہا تھا۔ کبھی سوچتا، اریبہ کو اعتماد میں لے کر سب بتا دے لیکن فوراً" ہی خیال آتا کہ اگر وہ نفرت سے منہ موڑ کر چلی گئی تو پھر وہ کبھی اسے نہیں منا سکے گا۔
"پھر میں کیا کروں؟" وہ روزانہ خود سے سوال کر کے سوچتا تھا اور بالآخر اسے ایک راستہ سجھائی دے گیا تو پھر اس نے دیر نہیں کی۔ اسی وقت توصیف ولا کے نمبر ڈائل کیے تھے۔
"ہیلو.....!" سارہ کی آواز سن کر وہ ایک لحظہ کو ڈگمگایا تھا پھر فوراً" سنبھل کر بولا۔
"سارہ..... میں رازی بات کر رہا ہوں۔"
"جی رازی بھائی! میں اریبہ کو بلاتی ہوں۔" سارہ نے کہا تو اس نے فوراً" ٹوک دیا۔
"نہیں سارہ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"
"کیا بات؟" سارہ مختصر تھی۔
"بہت ساری باتیں ہیں۔ فون پر نہیں ہو سکتیں اور نہ گھر پر۔ میں تمہیں کالج سے پک کر لوں گا۔ دیکھو! انکار مت کرنا۔ میں جس اذیت میں مبتلا ہوں اس سے تم ہی مجھے نکال سکتی ہو۔ بتاؤ کب آؤں؟" اس کے ملتجی لہجے پر سارہ جز بز ہو کر رہ گئی، بولی کچھ نہیں تھی۔
"سارہ پلیز۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ بہت ضروری ہے اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو کتنی زندگیاں داؤ پر لگ سکتی ہیں۔"
"خدا کے لیے رازی بھائی! چپ ہو جائیں۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔" سارہ تڑپ کر بولی تھی۔
"کر سکتی ہو۔" وہ زور دے کر بولا تھا۔ "تم نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ ہمیشہ مجھے سہارا دیا ہے۔ جب اریبہ مجھ سے ناراض تھی تب بولو کون مجھے۔"
"کیا اریبہ پھر آپ سے ناراض ہو گئی ہے؟" سارہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بے اختیار بول پڑی تھی۔
"نہیں۔ لیکن ہو بھی سکتی ہے۔" وہ جیسے ڈھے گیا تھا۔
"کیوں اب کیا ہو گیا ہے؟" سارہ نے جیسے بادل نخواستہ پوچھا تھا۔
"یہی بتانے کے لیے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ ملو گی ناں؟"
"اچھا۔ ٹھیک ہے۔" سارہ نے سوچ کر ہامی بھرتے ہی سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ وہ ریسیور رکھ کر اسی نہج پر سوچنے لگا کہ وہ سارہ سے کیا بات کرے گا۔



شمشیر علی کو پارٹ ٹائم جاب کے لیے بہت زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑی تھی۔ تعلیم اور تجربے کی بنا پر جلد ہی اسے اپنے مطلب کی جاب مل گئی تھی۔ اس کے بعد وہ رہائش ڈھونڈنے میں لگ گیا گو کہ فضل کریم کے ہاں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ خود فضل کریم اس سے یہی کہتا تھا کہ جب تک وہ چھڑا چھانٹ ہے، آرام سے اس کے ساتھ رہے اور وہ رہ بھی سکتا تھا لیکن توصیف احمد سے انتقام لینے کا جو پلان اس نے سوچ رکھا تھا۔ اس کے لیے اسے شہر سے دور رہائش اختیار کرنا تھی اور یہ کام وہ بہت رازداری سے کر رہا تھا۔ فضل کریم کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا

کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے فضل کریم کسی مشکل میں پھنسے جبکہ خود وہ ہر مشکل کا سامنا کرنے کو تیار تھا۔ شاید اس لیے کہ اب اس کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہیں تھا۔

بہرحال جاب ملتے ہی اس نے اپنی جمع پونجی سے سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید لی تھی جس سے اسے کافی سہولت ہو گئی تھی۔ صبح فضل کریم کے ساتھ ہی وہ گھر سے نکلتا تو پہلے اسے ہاسپٹل چھوڑتا پھر رہائش کی تگ ودو کرتا اور دو بجے اپنی جاب پر پہنچ جاتا۔ جہاں سے رات آٹھ بجے اس کی واپسی ہوتی تھی۔ یونیورسٹی کو فی الحال اس نے خیرباد کہہ دیا تھا۔ جس کا اسے ملال بھی تھا کیونکہ صرف دو سمسٹر باقی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کہلاتا جو کہ اس کا خواب تھا۔

اس وقت وہ فضل کریم کو لے کر گھر سے نکلا تو راستے میں اسے بتانے لگا۔

"میں نے گھر دیکھ لیا ہے فضل کریم! دعا کرو' آج سارے معاملات طے ہو جائیں۔ پھر میں ایک دو دن میں وہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔"

"تو بڑا ضدی ہے باؤ۔ جو اپنے دل میں ٹھان لیتا ہے' وہی کرتا ہے۔" فضل کریم نے کہا تو وہ رسان سے بولا تھا۔

"ضد کی بات نہیں ہے یار! یہ میری ضرورت ہے۔"

"اچھا۔ ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانے گا۔" فضل کریم کہہ کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

"نہیں! کہو تم گالیاں بھی دو گے تو برا نہیں مانوں گا۔" وہ ہنس کر بولا تھا۔

"گالیاں کیوں دوں گا۔ تیرے بھلے کی بات ہے۔" فضل کریم نے قدرے توقف کیا پھر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔ "دیکھ تو شریف آدمی ہے۔ پڑھا لکھا بھی ہے۔ تیرے ساتھ جو کچھ ہوا۔ بھول جا۔ وہ سب۔ اسی میں بہتری ہے۔ بدلے کی آگ بجھا دے۔ نہیں تو تیرا اپنا ہی نقصان ہو گا۔"

"میرا جو نقصان ہونا تھا ہو گیا فضل کریم! مزید کیا ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ جان چلی جائے گی تو جان تو ایسے ہی عذاب میں ہے۔ اچھا ہے چھٹکارا مل جائے گا۔" وہ بظاہر سرسری انداز میں بولا تھا۔

"لے تو نے تو بات ہی ختم کر دی۔" فضل کریم ناراض ہو گیا۔

"بات ختم نہیں ہوئی یار! ابھی تو شروع ہوئی ہے۔" اس نے فضل کریم کو چھیڑا تھا۔

"بس رہنے دے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ باقی باتیں ہم رات میں کریں گے۔" اس نے اسپتال کے سامنے گاڑی روک دی اور فضل کریم کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"ناراض مت ہو یار! میں ایسا کوئی کام نہیں کرنے جا رہا ہوں جس میں میری جان کو خطرہ ہو۔"

"سچ کہہ رہا ہے تو۔۔۔" فضل کریم بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے شام میں ملتے ہیں۔" فضل کریم اس سے ہاتھ ملا کر گاڑی سے اتر گیا تو اس نے پہلے سگریٹ سلگائی پھر گاڑی ریورس کرنے لگا تھا کہ اسپتال کے گیٹ سے چند قدم اندر کھڑی لڑکی کو دیکھ کر اس کے اعصاب تن گئے تھے۔ ایک بازو پر سفید گاؤن ڈالے دوسرے ہاتھ میں ڈاکٹری آلہ پکڑے وہ اپنی ساتھی لڑکی سے جانے کیا ڈسکس کر رہی تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی اسے پہچان گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اسے اٹھا کر اسی اسپتال لایا تھا پھر اس کے بارے میں اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ کتنی خوش قسمت ہے یہ لڑکی جس کا باپ اس کی خاطر دنیا چھوڑے بیٹھا ہے۔ اور اسی باپ کی بدولت ہی وہ اس کے ذہن پر نقش ہو گئی تھی۔ وہ انتہائی تنفر سے اسے دیکھ رہا تھا جو اب اندر جا رہی تھی۔

وہ ہمیشہ سے اپنی پڑھائی کے معاملے میں بہت سنجیدہ رہی تھی اور کبھی کسی بات کو اس نے خود پر یوں طاری نہیں ہونے دیا تھا۔ جس سے اس کی پڑھائی متاثر ہوتی۔

جب اس نے اجلال رازی سے ناتا توڑا تھا تب بھی نہیں۔

اور جب اس پر یاسمین کی حقیقت واضح ہوئی تھی تب تو وہ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی پھر بھی پڑھنے سے اس کا دھیان نہیں ہٹا تھا۔

لیکن اب اجلال رازی کے بدلتے رویے اور نہ سمجھ میں آنے والی باتوں نے اسے اس بری طرح الجھا دیا تھا کہ صرف پڑھنے سے ہی نہیں' ہر شے سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھتی تو سامنے کھلی کتاب کو بس دیکھتی رہتی یہاں تک کہ آنکھوں کے سامنے گول گول دائرے بننے لگتے کنپٹیوں میں درد شروع ہو جاتا تو وہ ٹیبل لیمپ آف کر کے وہیں ٹیبل پر سر رکھ لیتی۔ اپنی اس کیفیت سے وہ خود پریشان تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ اس روز کے بعد سے اس نے اجلال رازی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتی تھی اجلال رازی خود آئے اور جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ "ابھی تم میری بات نہیں سمجھو گی کیونکہ اس وقت تم غصے میں ہو۔" تو اس کا یہی مطلب تھا کہ کوئی ایسی بات ہے جس سے وہ اچانک اس سے دور ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"کیا بات ہو سکتی ہے؟" اس کا ذہن مسلسل اسی بات میں الجھا رہتا جب ہی اور کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ دوستوں کی باتوں پر بس ہوں ہاں کر کے رہ جاتی۔

اس وقت ڈاکٹر سبط حسن نے اسے ایک مریض کے لیے دوائیں تجویز کرنے کو کہا تھا۔ اس سے پہلے وہ مریض کی پوری کنڈیشن بتا چکے تھے۔ پھر بھی وہ پرچا ہاتھ میں لیے ہونقوں کی طرح کبھی ڈاکٹر سبط حسن کو دیکھتی' کبھی مریض کو۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی ایسا کام کہہ دیا ہو جس کی الف ب سے بھی وہ واقف نہ ہو۔ خود اسے یہی لگ رہا تھا۔ آخر انتہائی بے بسی سے اس نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

"اریبہ! آر یو آل رائٹ۔" ڈاکٹر سبط حسن نے فوراً اس کی کلائی تھامی انہیں لگا تھا جیسے وہ ابھی گر پڑے گی۔

"سوری ڈاکٹر! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ اتنی کمزور تو وہ کبھی نہیں تھی۔

"آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ چلیں ادھر۔"

"نو سر! میں گھر جاؤں گی۔" وہ مزید تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر سبط حسن سے اجازت لے کر اسی وقت باہر نکل آئی تھی۔

اس کا دل چاہا' وہ سیدھی اجلال رازی کے پاس جائے اور اس سے کہے کہ اس کی برداشت کی حد ختم ہو چکی ہے وہ بھی اپنا کھیل ختم کرے۔ نہیں تو وہ کچھ کر بیٹھے گی۔

"نہیں۔ میں رازی کے پاس نہیں جاؤں گی۔" اس نے سختی سے اپنے دل کو باور کرایا پھر سگنل پر گاڑی کو بریک لگاتے ہی اس کی سوچوں کو بھی بریک لگ گئی تھی۔ چند لمحے اسے ماحول سے مانوس ہونے میں لگ گئے۔ وہ حیران ہوئی جیسے اس سے پہلے وہ کہیں اور تھی۔

"مائی گاڈ! پتا نہیں میں صحیح سلامت گھر پہنچ پاؤں گی کہ نہیں۔" اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو دو تین جھٹکے دیے پھر گردن کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے اسے اچانک جھٹکا لگا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں اجلال رازی کے ساتھ سارہ تھی۔

"رازی' سارہ۔" وہ کچھ سمجھ نہیں پائی نہ ہی کچھ سوچنا چاہتی تھی لیکن کوئی بات تھی جو اسے کھٹک رہی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ الجھنے لگی اور گھر آ کر تو اسے کوئی کام ہی نہیں تھا۔ سارہ کے انتظار میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کتنی باتیں قیاس کر ڈالی تھیں۔ کبھی خود کو سرزنش بھی کی لیکن پھر ذہن بھٹک جاتا۔ اگر اس پر یاسمین کی

حقیقت نہ کھلتی تو شاید رازی اور سارہ کا ایک ساتھ ہونا اس کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا۔ اب تو ہر ایک پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ جب ماں اس کی آڑ لے کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی تھی تو بہن کیوں نہیں۔ اسے مسلسل ایسے ہی خیال آرہے تھے اور اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل بند ہو جائے گا' سارہ نے بھی تو آنے میں بہت دیر کردی تھی۔ پورے دو گھنٹے بعد آئی تھی اور وہ جو سوچے بیٹھی تھی کہ سارہ کے آتے ہی اسے جھنجھوڑ ڈالے گی تو اس کے برعکس بے حد خاموش نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"تم آج جلدی آگئیں؟" سارہ نے اس سے پوچھا تو وہ جو اس کی آنکھوں کی سرخی پر غور کر رہی تھی چونک کر بولی۔

"ہاں! کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"طبیعت تو تمہاری کافی دنوں سے خراب لگ رہی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔" سارہ نے ٹوکا۔ وہ خاموش رہی تو قدرے توقف سے سارہ خود ہی کہنے لگی۔

"میں رازی بھائی کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ بھی تمہاری طرف سے بہت پریشان تھے۔"

"کیوں؟" وہ پوری جان سے متوجہ ہوئی تھی۔

"ظاہر ہے۔ تم اپنا خیال نہیں کرو گی تو وہ پریشان نہیں ہوں گے؟ پورے دو گھنٹے وہ بس یہی کہتے رہے۔ اریبہ کا خیال رکھو۔ وہ بہت اپ سیٹ ہے۔ کچھ کھاتی پیتی نہیں۔ اتنی کمزور ہو گئی ہے۔ بائی داوے تم اپ سیٹ کیوں ہو'" سارہ آخر میں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"تم سب کی وجہ سے' عجیب معمہ بنے ہوئے ہو تم سب۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"ہم معمہ بنے ہوئے ہیں۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی' کیا کہنا چاہتی ہو تم۔" سارہ نے حیرت کے اظہار کے ساتھ پوچھا تو وہ یکدم ڈھے گئی۔ سارہ کے ہاتھ تھام کر عاجزی سے گویا ہوئی۔

"تم تو میری بہن ہو ناں سارہ! تم جانتی ہو' میں رازی سے کتنی محبت کرتی ہوں اور یہ کوئی دو چار دن کی بات نہیں ہے۔ برسوں سے میرا دل صرف اسی کے نام پر دھڑک رہا ہے۔ درمیان میں' میں لاکھ اس سے متنفر ہوئی لیکن اس سے ہٹ کر نہیں سوچا تھا۔ میں سچ کہہ رہی ہوں سارہ!"

"میں جانتی ہوں اریبہ! بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ تمہیں بھی اور رازی بھائی کو بھی۔ وہ بھی تم سے ہٹ کر نہیں سوچتے۔ پھر تمہیں کس بات کا خدشہ ہے؟" سارہ کا دل اس کی عاجزی پر ڈوبنے لگا تھا۔

"پتا نہیں۔ پتا نہیں سارہ! مجھے لگتا ہے جیسے رازی مجھ سے دور ہو رہا ہے۔ کوئی اسے مجھ سے چھین رہا ہے یا وہ جان بوجھ کر مجھ سے دامن چھڑا رہا ہے۔" اس کے ٹوٹے لہجے پر سارہ تڑپ کر بولی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے اریبہ! وہمی ہو گئی ہو تم۔"

"وہم بھی یونہی تو نہیں ہو جاتا۔ کوئی بات ہوتی ہے تب ناں۔"

"نہیں' یہ خود کو زیادہ تھکانے کا نتیجہ ہے۔ اپنے دماغ کو آرام دو۔ بلکہ میں مما سے کہتی ہوں فوراً" تمہاری شادی کردیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے تمہارے وہم کا یہی علاج ہو سکتا ہے۔"

سارہ اب اسے چھیڑنے لگی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی کیونکہ اس کے اندر کوئی ہلچل نہیں مچی تھی۔ ہولا دینے والا سناٹا دور تک پھیل گیا تھا اور وہ وحشت بھری نظروں سے سارہ کو دیکھے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کتنے دنوں تک سارہ اجلال رازی کی باتوں سے پریشان رہی تھی اور پہلے پہل تو اس کے اندر غصہ بھی تھا لیکن

پھر آہستہ آہستہ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی۔ کیونکہ اجلال رازی نے جس حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سے وہ زیادہ دن انکار نہیں کر سکی تھی۔ پھر یہ بڑی بات تھی کہ اجلال رازی صرف اپنا نہیں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں تھا۔ وہ اگر خود غرضی کا لبادہ اوڑھ لیتا تو بھی آرام سے اپنی زندگی جی سکتا تھا۔ لیکن وہ خود غرض نہیں تھا۔ اس نے اپنی باتوں سے ثابت کردیا تھا اور کسی حتمی فیصلے سے پہلے سارہ پر ہر بات واضح کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اس کے بعد وہ تو شاید ـــــ مطمئن ہو گیا تھا لیکن سارہ کی جان پر بنی تھی۔ وہ خود کو بے انتہا مشکل میں محسوس کر رہی تھی۔ ایسے میں اسے سمیر کا خیال آیا تو اس روز وہ یاسمین کو بتا کر کالج سے امینہ پھوپھو کے گھر آگئی تھی۔

"ارے! یہ آج تم کیسے راستہ بھول گئیں۔" سمیر اسے دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

"جیسے تم بھولتے ہو۔" وہ کہہ کر فوراً" امینہ پھوپھو سے مخاطب ہو گئی۔ "پھوپھو بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے۔ آپ نے کھانا کھا لیا۔"

"نہیں طیبہ کھانا لگا رہی ہے' چلو ادھر ہی چلو۔ تم بھی آؤ سمیر!" امینہ نے کہا تو سمیر اچھل پڑا۔

"میں بھی آؤں۔ یعنی بھتیجی کے صدقے میں مجھے بھی بلایا جا رہا ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" امینہ نے سمیر کو ٹوکا۔

"یہ فضول باتیں ہی کرتا ہے پھوپھو! آیئے ہم چلیں۔" وہ امینہ کا ہاتھ تھام کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔

سمیر کی طرح طیبہ بھی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

"مجھے لگ رہا تھا آج تم آؤ گی۔" طیبہ نے اس کے گلے لگتے ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

"الہام ہوا تھا کیا؟"

"ہاں صبح سے تمہارا چہرہ میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔ اس سے مجھے یہی لگا کہ تم آؤ گی اور دیکھو' میں نے تمہاری فیورٹ ڈش بنائی ہے۔"

"چکن پلاؤ۔" اس کی بھوک مزید چمک اٹھی۔ "چلیں پھوپھو! شروع کریں مجھ میں اب برداشت نہیں ہے۔"

"ہاں لو۔" امینہ نے پہلے اس کی پلیٹ میں چاول نکالے جس پر سمیر پھر احتجاج کرنے لگا تو وہ اسے چڑا کر فوراً" کھانے میں لگ گئی۔

"جانے کب سے بھوکی ہے۔ طیبہ! کچھ اور کھانے کو ہو تو وہ بھی لے آؤ۔ خالی پلاؤ سے اس کا پیٹ نہیں بھرے گا۔" امینہ کے ٹوکنے کے باوجود سمیر اسے چھیڑنے سے باز نہیں آرہا تھا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔

"ارے ہاں سارہ! پھر اریبہ کی شادی کا کیا طے ہوا؟" امینہ نے اچانک یاد آنے پر پوچھا تھا۔

"جی!" وہ چونک کر امینہ کو دیکھنے لگی۔

"اریبہ کی شادی کا پوچھ رہی ہوں۔ اس دن یاسمین کہہ رہی تھی کہ وہ جلدی اریبہ کی شادی کردے گی۔"

یہ امینہ پھوپھو کیا کہہ رہی تھیں۔ اس نے تو گھر میں ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی لیکن لاعلمی کا اظہار کرنے سے اس کی اپنی سبکی ہوتی اس لیے سنبھل کر بولی تھی۔

"ابھی کچھ طے نہیں ہوا پھوپھو!"

"اچھا۔" امینہ کو تعجب ہوا تھا۔ وہ اس موضوع سے بچنے کی خاطر فوراً" طیبہ سے مخاطب ہو گئی۔

"بھئی طیبہ! تم نے پلاؤ بہت اچھا بنایا ہے۔ میں کچھ زیادہ ہی کھا گئی ہوں۔ اب تمہیں چائے بھی پلانی پڑے گی۔"

"وہ تو میں پلاؤں گی تم اور لو ناں۔"

"نہیں بھئی اب گنجائش نہیں ہے۔" وہ کہہ کر اٹھی تو سمیر بھی فوراً" اٹھ گیا۔
"چلو بھئی! تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"
"ہائیں! دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ ابھی تو آئی ہے' ابھی چھوڑنے کی بات کر رہے ہو۔" امینہ کو سچ مچ غصہ آگیا تھا۔
"اس لیے کہ میں شام میں فارغ نہیں ہوں مجھے ' کسی اور کام سے جانا ہے۔ اس وقت آپ مجھ سے مت کہیے گا اور تم بھی سن لو۔" سمیر امینہ سے کہتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تو وہ تڑخ کر بولی۔
"سن لیا ہے اور میں تمہارے ساتھ جاؤں گی بھی نہیں۔"
"بڑی مہربانی!" وہ کمرے سے نکل گیا تو امینہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔
"تم اس کی باتوں کا برا مت ماننا۔ چلو! تم میرے کمرے میں چل کر سو جاؤ' لمبی دوپہر ہے۔ شام میں میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گی۔"
"ارے پھوپھو! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں خود بھی جا سکتی ہوں۔ آخر آئی بھی تو ہوں۔" اس نے قصداً" خوش دلی کا مظاہرہ کیا' پھر امینہ کو ان کے کمرے میں چھوڑ کر "بس ابھی آئی" کہتے ہوئے سمیر کے کمرے میں آگئی اور دانت پیس کر اس سے بولی۔
"تم کچھ زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہیں کر رہے؟"
"مجھ پر کمنٹس بعد میں دینا۔ پہلے بتاؤ! کیسے آئی ہو۔" سمیر بجائے اپنی بداخلاقی پر نادم ہونے کے مزید رعب جما رہا تھا۔
"کیسے آئی ہو مطلب؟" وہ اندر ہی اندر تلملائی تھی۔
"مطلب' اب کس کا دکھ' کس کی پریشانی میری جھولی میں ڈالنے آئی ہو؟" سمیر نے بظاہر سنجیدگی سے پوچھا تھا۔
"تم سچ مچ بہت برے ہو۔ بس اب بھی تم سے بات نہیں کروں گی۔" وہ روٹھ کر بھی وہیں بیٹھ گئی تھی۔
"اچھی بات ہے۔ قائم رہنا اپنی بات پر۔" وہ کہہ کر آرام سے بیڈ پر نیم دراز ہو گیا تو وہ دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگی۔
سمیر کچھ دیر اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"اچھا! اپنی اس سہیلی کا احوال سناؤ' جس کے ساتھ کچھ برا ہو گیا تھا' اب کیسی ہے وہ؟"
"بہت اچھی بہت خوش۔" وہ بے اختیار بولی تھی۔
"ہائیں!" سمیر اچھلا۔ "اتنی جلدی اسے منگیتر سے اچھال گیا؟"
"نہیں! اسے اس کے منگیتر نے ہی اپنا لیا ہے' جب ہی وہ خوش ہے۔" وہ یوں خوش ہو کر بولی تھی۔ جیسے خود اسے اس کی منزل مل گئی ہو۔
"حیرت ہے۔" سمیر نے برملا حیرت کا اظہار کیا تو وہ اندر سے خائف ہو گئی۔
"کیوں' حیرت کی کیا بات ہے؟ اگر محبت سچی ہو تو خامیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔"
"خامیاں..... لغزشیں نظر انداز نہیں ہوتیں۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔
"اچھا! اگر اس کی جگہ تم ہوتے تو؟" وہ بے ساختہ پوچھ کر سٹپٹائی تھی۔
"تو میں کبھی پلٹ کر اس لڑکی کی طرف نہ دیکھتا۔" سمیر نے فوراً" جواب دیا۔
"اس کا مطلب ہے کہ وہ لڑکا بڑے ظرف کا مالک ہے۔" وہ اپنے ناخن دیکھتے ہوئے بولی۔
"نہیں یہ وقتی ابال ہے۔ چند دن بعد تم خود دیکھنا' وہ لڑکی پھر روتی ہوئی نظر آئے گی۔" سمیر نے کہا تو وہ گھبرا کر

کھڑی ہو گئی۔
"کیا فضول باتیں لے بیٹھے ہو تم۔"
"چلو تو تم کوئی کام کی بات کر لو۔ بلکہ وہ بات کہو جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔" سمیر کو یقین تھا کہ وہ یونہی ملنے یا اس کی محبت میں نہیں آئی۔
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے واقعی ایک بات پریشان کر رہی ہے' لیکن اب میں تمہارے ساتھ شیئر نہیں کروں گی۔" وہ کہہ کر تیزی سے اس کے کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی لیکن سمیر اس سے زیادہ تیز تھا۔ ایک ہی جست میں اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔
"تم بہت جلدی ناراض ہو جاتی ہو۔"
"نہیں! میں ناراض نہیں ہوں۔" وہ بہت ضبط سے بولی۔ "مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں خواہ مخواہ تمہیں پریشان کرتی ہوں۔ آئی ایم سوری۔"
"نو... نو سوری۔ میں تمہاری باتوں سے پریشان نہیں ہوتا۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ ہاں! کبھی کبھی دل چاہتا ہے' جیسے تم اوروں کے لیے پریشان ہوتی ہو' کبھی میرے لیے بھی تمہارے دل میں درد ہو۔"
"نہیں' نہیں سمیر! ایسی خواہش مت کرو۔ میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتی۔" وہ اسے دھکیل کر کمرے سے نکل گئی۔

✲ ✲ ✲

یاسمین تیار ہو کر کمرے سے نکلی تو لاؤنج میں اریبہ کو بیٹھے دیکھ کر ایک لحظہ کو ٹھٹکی تھی' لیکن پھر سر جھٹک کر پوچھنے لگی۔
"سارہ آگئی؟"
"نہیں..... " اریبہ نے مختصر جواب دیا۔
"امینہ نے روک لیا ہو گا۔ خیر! میں کلب جا رہی ہوں۔" یاسمین کہہ کر آگے بڑھی' لیکن پھر کچھ یاد آنے پر پلٹ کر کہنے لگی۔
"ہاں اریبہ! میں یہ پوچھ رہی تھی کہ وہ لڑکی کیا نام ہے اس کا..... تاجور کب تک یہاں رہے گی؟"
"کیوں؟ آپ کو اس سے کوئی پرابلم ہے؟" اریبہ نے سیدھے سادے انداز میں پوچھا تھا۔
"نہیں۔" یاسمین نے کچھ ناسمجھی کے انداز میں سر بھی ہلایا تھا۔
"پھر اسے یہیں رہنے دیں۔" اریبہ اس وقت جانے کس موڈ میں تھی کہ اس نے یاسمین پر زبردستی اپنی بات مسلط نہیں کی تھی کہ وہ یہیں رہے گی۔
"لیکن بیٹا! اس کے گھر والے..... "
"اس کا کوئی گھر نہیں ہے۔" اریبہ فوراً" بولی تھی۔
"کیا مطلب؟ کیا تم اسے یتیم خانے سے لائی ہو؟" یاسمین نے کوشش سے خود کو چلانے سے باز رکھا تھا۔
"نہیں! میں اسے اسپتال سے لائی تھی۔ یتیم خانے والے ہی اسے اسپتال میں ڈال گئے تھے۔ بہرحال آپ پریشان نہ ہوں۔ اب یہ لڑکی میری ذمہ داری ہے اور میں اسے لاوارثوں کی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔" اریبہ بہت سکون سے بول رہی تھی۔
"وہ تو ٹھیک ہے' لیکن اس کی وجہ سے کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔" یاسمین نے اسے احساس دلانے کی

کوشش کی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا' اور اگر کوئی مسئلہ کھڑا ہوا بھی تو میں خود فیس کرلوں گی۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" اب اریبہ کا انداز بدلنے لگا تھا۔ جب ہی یاسمین مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کرکے باہر نکل آئی۔

اس نے اریبہ سے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اس وقت واقعی کلب جانے کے لیے نکلی تھی' جہاں بیگم ابراہیم کی کتاب کی رونمائی کی تقریب تھی اور بیگم ابراہیم نے یاسمین کو خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ یعنی یاسمین کو کتاب پر تبصرہ بھی کرنا تھا۔ ایسی تقریبات یاسمین خود بھی مس نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس وقت اچانک اس کا موڈ بدل گیا تھا اور وہ شہباز درانی کے پاس چلی آئی۔

"بہت انتظار کروانے لگی ہو۔" شہباز درانی نے چھوٹتے ہی شکوہ کیا تو یاسمین تنگ ہو کر کہنے لگی۔

"جانتے تو ہو شبی! میں کس مشکل میں ہوں' بلکہ اب تو تنگ آگئی ہوں۔"

"کس سے؟ مجھ سے تنگ آگئی ہو؟" شہباز درانی نے فوراً" پوچھا۔

"نہیں! اس گھر کی گھٹن سے دل چاہتا ہے' کہیں بھاگ جاؤں۔" یاسمین کہہ کر اس امید پر شہباز درانی کو دیکھنے لگی جیسے وہ فوراً" کہیں گے "ہاں! چلو بھاگ چلتے ہیں۔" لیکن اس کے برعکس انہوں نے ٹوک دیا تھا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" یاسمین کو دھچکا لگا تھا' لیکن اسے چونکہ پینترا بدلنے میں کمال حاصل تھا تو زور زور سے ہنسنے لگی' پھر شہباز درانی کو دیکھ کر اس انداز میں جیسے انہیں چڑا رہی ہو' کہنے لگی۔

"بھاگوں گی تو میں ضرور۔ یہ میں نے سوچ لیا ہے۔ پھر تم دیکھنا کیسی کھلبلی مچ جائے گی۔ میں سوچتی ہوں میری گمشدگی پر سب سے زیادہ کون پریشان ہوگا۔"

"توصیف احمد۔" شہباز درانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"ہاہاہا۔" یاسمین نے قہقہہ لگایا پھر ایکدم سنجیدہ ہوگئی۔ "ہاں تم ٹھیک کہتے ہو شبی! سب سے زیادہ توصیف ہی پریشان ہوگا اور میرا مقصد بھی یہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے باقاعدہ بھاگنے کا پلان بنالیا ہے۔ اب یہ بھی بتادو' بھاگو گی کس کے ساتھ؟" شہباز درانی نے دلچسپی سے پوچھا تو یاسمین تڑخ کر بولی تھی۔

"مجھے کسی کے ساتھ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تنہا رہنا چاہتی ہوں۔ بالکل تنہا۔" پھر گھڑی دیکھ کر خود کو بہت عجلت میں ظاہر کرنے لگی۔

"ارے! مجھے تو ایک تقریب میں جانا تھا۔ اف بہت لیٹ ہوگئی ہوں۔"

"تو اب جانے دو ناں۔" شہباز درانی نے اسے روکنا چاہا تھا۔

"نہیں شبی! میں اسپیشلی انوائٹ ہوں' اوکے۔" وہ اسی عجلت میں باہر نکلی تھی۔ درحقیقت وہ پریشان ہوگئی تھی اور دلبرداشتہ بھی اور ایسی حالت میں وہ کسی تقریب میں نہیں جاسکتی تھی اس لیے واپس گھر آگئی۔

لاؤنج میں اریبہ اور سارہ کے ساتھ توصیف احمد بھی موجود تھے اور جانے ان تینوں باپ بیٹیوں کے درمیان کیا باتیں ہو رہی تھیں کہ ان کے چہروں پر مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ یاسمین نہ چاہتے ہوئے بھی ان میں بیٹھ تو گئی' لیکن فوراً" ہی احساس ہوگیا کہ وہ کتنی غیر اہم ہے۔ کسی نے اس کے آنے اور بیٹھنے کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ تب وہ فوراً" اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب موبائل کی مسلسل بجتی ٹون سے اجلال رازی کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے

موبائل اٹھا کر آف کردینا چاہا لیکن اسکرین پر توصیف ولا کا نمبر دیکھ کر یکدم اس کی نیند اچاٹ ہوگئی۔

"ہیلو!" اس نے پہلے سیل فون کان سے لگایا' پھر اپنے پیچھے تکیہ اونچا کیا تھا۔

"سوری رازی بھائی! میں...." دوسری طرف سارہ تھی۔

"سب خیریت ہے نا سارہ؟" اس نے فوراً" پوچھا تھا۔

"جی! سب خیریت ہے۔ اریبہ آپ سے بدگمان ہو رہی ہے اور یہ بات مجھے اچھی نہیں لگ رہی۔ وہ آپ سے محبت کرتی ہے رازی بھائی! بہت محبت کرتی ہے۔" سارہ کے لہجے میں اسی طرح عاجزی در آئی تھی جیسے اریبہ نے اس کے سامنے رازی سے محبت کا اعتراف کیا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ بہت ضبط سے بولا۔

"پھر آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں اریبہ اور آپ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے' پھر کیوں خود کو اور اسے بھی مشکل میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ پلیز رازی بھائی! بھول جائیں سب۔" سارہ منت سے بولی تھی۔

"فار گاڈ سیک سارہ! میں نے سب کچھ تو تم پر واضح کردیا ہے پھر تم کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو۔" اس نے ٹوکا تو ادھر سارہ خاموش ہوگئی تھی۔

"ہیلو سارہ!" قدرے رک کر وہ اسے پکار کر پوچھنے لگا۔ "تم سمیر سے ملی تھیں؟"

"جی۔ میں آج ہی امینہ پھوپھو کے گھر گئی تھی۔ سمیر سے بھی بات ہوئی لیکن...." سارہ خاموش ہوگئی تو اجلال نے ٹوکا نہیں بلکہ از خود سمجھ کر کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے اب تم خاموش رہو گی اور میں جو کرنے جا رہا ہوں' وہی ٹھیک ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے سارہ! آہستہ آہستہ سب نارمل ہوجائے گا۔ تم اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ سمجھ رہی ہو ناں۔" اجلال گویا خود سے لڑتے ہوئے بول رہا تھا۔

ادھر شاید سارہ رونے لگی تھی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز آئی تھی۔

"جتنا رونا ہے ابھی رولو۔ میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔"

اجلال نے کہہ کر فون بند کردیا اور چاہا کہ دوبارہ سوجائے لیکن ہزار کوشش کے باوجود نیند آکے نہیں دی تب اس نے بستر چھوڑ دیا اور سگریٹ سلگا کر بالکونی میں نکل آیا۔

خاموش رات بین کرتی ہوئی لگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شمشیر علی اپنے گھر شفٹ ہوگیا۔ اب اس نے اپنی سرگرمیاں تیز کردی تھیں۔ اتنے بڑے شہر میں تاجور کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا اور اس کے پاس تاجور کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی' جو وہ اخبار میں اشتہار لگواتا۔ اچھے دنوں میں اس کے پاس جو موبائل سیٹ تھا' اس میں تاجور کی تصویریں تھیں لیکن وہ موبائل سیٹ جب وہ گرفتار ہوا تھا شاید حوالدار نے لے لیا تھا۔ اسے موبائل سیٹ سے غرض نہیں تھی بس ہلکی سی امید کہ شاید اس میں تاجور کی تصویر مل جائے' سو وہ اس وقت حوالدار کے پاس آیا تھا۔

"مجھے موبائل نہیں چاہیے۔ اس میں میرے دوستوں کے نمبر اور کچھ تصویریں تھیں' مجھے وہ لینی ہیں۔ آپ پلیز میری مدد کریں۔ مجھے بتائیں وہ موبائل کس کے پاس ہے۔"

وہ حوالدار کو اپنی بات سمجھاتے سمجھاتے عاجز آگیا تھا اور یہ نہیں تھا کہ حوالدار کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ سب سمجھ کر بھی انکاری تھا۔ پورا ایک گھنٹہ اس کے ساتھ مغزماری کے بعد آخر مایوس ہو کر وہ فضل کریم کے پاس

چلا گیا۔

اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔ وہ روزانہ اس وقت آفس جانے سے پہلے فضل کریم کے پاس ضرور آتا تھا۔ یہاں بھی وہ تاجور کی خاطر ہی آتا تھا۔ کیونکہ تاجور اسی اسپتال میں زیر علاج تھی تو اسے خیال آتا کہ ہو سکتا ہے، دوبارہ چیک اپ کے لیے اسے یہاں لایا جائے۔ اس لیے فضل کریم کے پاس بیٹھ کر وہ ہر آنے جانے والے کو دیکھتا تھا، خصوصاً" خواتین اور لڑکیاں جہاں نظر آئیں' اس کی نظریں دور تک ان کا تعاقب کرتی تھیں اور یہیں اسے وہ لڑکی بھی نظر آئی تھی' جس کے باپ نے اس کا مستقبل تاریک کر دیا تھا۔ وہ بھولا نہیں تھا اپنے مستقبل کے قاتل کو اس نے ضرور سبق سکھانا تھا لیکن اس کے نزدیک زیادہ اہم تاجور تھی۔ کہیں سے اس کا سراغ مل جاتا۔ حوالدار کی طرف سے مایوس ہو کر اب اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ انتہائی دل گرفتہ بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے باؤ! آج دفتر نہیں جانا؟" فضل کریم نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا تو اس نے چونک کر پہلے ٹائم دیکھا پھر سستی سے اٹھتے ہوئے بولا تھا۔

"ہاں جا رہا ہوں۔"

"طبیعت نہیں ٹھیک تو چھٹی کر لے چل تجھے چائے شائے پلاؤں۔"

"ارے نہیں فضل کریم میں ٹھیک ہوں اور چائے کا خیال تمہیں پہلے کیوں نہیں آیا' اتنی دیر سے میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔" اس نے کہا تو فضل کریم ہنس کر بولا تھا۔

"اچھا' مجھے تو نہیں لگا تو یہاں تھا۔" وہ حیران ہوا' بظاہر سیدھا سادہ فضل کریم کیسی گہری بات کر گیا تھا کہ وہ لاجواب ہو کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور ابھی گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا کہ پندرہ سولہ سالہ ایک لڑکا اس کا بازو چھو کر پوچھنے لگا۔

"صاب! تصویر بنوانی ہے؟"

"تصویر......؟" اس نے دیکھا لڑکے کے ہاتھ میں پنسل سے بنی ہوئی تصویر تھی۔

"یہ تصویر......" وہ بے اختیار لڑکے کے ہاتھ سے تصویر جھپٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "یہ تم نے بنائی ہے؟"

"جی صاب! آپ کی تصویر بھی بنا سکتا ہوں۔ بنوا لیں صاب! زیادہ پیسے نہیں لوں گا۔" غالباً" لڑکے کا یہی ذریعہ معاش تھا۔ خوشامدی انداز میں اسے اکسا رہا تھا۔ لیکن اس کا ذہن کچھ اور سوچنے لگا تھا۔ لڑکے کی آواز اس کی سماعتوں سے ضرور ٹکرا رہی تھی لیکن وہ سن نہیں رہا تھا۔ جب لڑکے نے اس کا بازو ہلایا۔ تب وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"ابھی بنا دوں صاب!" لڑکے نے پوچھا۔

"نہیں ابھی میں کام سے جا رہا ہوں۔ تم بتاؤ کہاں رہتے ہو' میں شام میں تمہارے پاس آجاؤں گا۔" وہ کچھ سوچ کر ہی بولا تھا۔ لڑکا جلدی سے اپنا نام پتا بتا کر پوچھنے لگا۔

"آئیں گے ناں صاب!"

"ہاں ضرور آؤں گا۔" وہ لڑکے کا گال تھپک کر بدقت مسکرایا تھا۔

☼ ☼ ☼

معمول کے مطابق فجر کی نماز کے بعد اریبہ لان میں آئی۔ کچھ دیر چہل قدمی کی پھر وہیں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد بی بی چائے لے کر آئیں تو ان کے پیچھے یاسمین کو آتے دیکھ کر وہ ٹھٹکنے کے ساتھ یاسمین کے اتنی جلدی اٹھنے پر حیران ہی ہو رہی تھی' پھر بھی جیسے یاسمین قریب آئی۔ اس نے سلام کر ڈالا۔

"خوش رہو۔" یاسمین نے مسکرا کر دعا دی' پھر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیسی ہو؟"

"جی۔" وہ ٹرے اپنی طرف کھینچ کر چائے بنانے لگی۔

"سارہ نہیں اٹھی؟"

"نہیں البتہ تاج فجر پہ ہی اٹھ جاتی ہے۔" اس نے تاجور کا نام لے کر گویا باور کرایا تھا کہ وہ بھی اسی گھر کی فرد ہے۔

"ہاں اچھی لڑکی ہے۔" یاسمین جانے اس کا دل رکھ رہی تھی یا اس کی بات تسلیم کر رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکی اور چائے کا کپ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"تمہارے ایگزام ہونے والے ہیں۔" یاسمین نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ تب وہ ساری بات سمجھ گئی۔ یاسمین کا جلدی اٹھنا اور اس کے پاس آبیٹھنا یونہی نہیں تھا۔

"جی ایگزام کے بعد بھی میں فارغ نہیں ہوں گی۔" اس نے اسے بالواسطہ سمجھا دیا کہ اس کی شادی کا نہ سوچا جائے۔ یاسمین فوراً" کچھ نہیں بولی۔ سکون سے چائے کے دو تین گھونٹ لیے پھر کہنے لگی۔

"دیکھو بیٹا! میں جو بھی ہوں' جیسی بھی ہوں' تمہاری ماں ہوں۔ بے شک مجھ سے سوچنے سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے لیکن ادھر کچھ دنوں سے جو میں محسوس کر رہی ہوں وہ میں یقین سے کہوں گی کہ غلط نہیں ہے۔ تم بھی محض میری ضد میں جھٹلانا مت۔"

"آپ بلاوجہ تمہید باندھ رہی ہیں۔ اصل بات کہیں۔" اسے واقعی یاسمین کی باتوں سے الجھن ہونے لگی تھی۔

"اصل بات تم بتاؤ۔ کیوں پریشان ہو؟" یاسمین چائے کا کپ ٹرے میں رکھ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"میں......" وہ اپنی طرف اشارہ کر کے رہ گئی۔ اصل میں تو وہ حیران تھی کہ یاسمین نے کیسے اس کی پریشانی محسوس کر لی۔

"میں نے کہا ناں میں جیسی بھی ہوں تمہاری ماں ہوں اور ماؤں سے اولاد کی پریشانی چھپی نہیں رہتی۔ بتاؤ کیا بات ہے؟"

یاسمین نے اتنی محبت سے پوچھا کہ وہ بکھرنے لگی۔ دل چاہا اس کے سینے میں منہ چھپا کر سارے آنسو بہا ڈالے۔ قریب تھا کہ وہ ایسا ہی کرتی کہ اچانک اسے جھٹکا لگا۔

"نہیں' اسی عورت کی بدولت تو میں رسوا ہو رہی ہوں۔ سارے زخم اسی کے لگائے ہوئے ہیں۔ اب یہ سچائی کی آڑ میں اور کتنے زخم لگائے گی۔"

"سوری مما! میں آپ کے ساتھ اپنے دکھ شیئر نہیں کر سکتی۔" وہ کہہ کر اٹھی اور تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آگئی۔ پھر وہ کالج جانے کے لیے ہی نکلی تھی۔

اس کا ذہن منتشر ہو گیا تھا۔ پہلے ہی اجلال کی طرف سے بدگمان تھی۔ مزید یاسمین کی لگاوٹ کے پیچھے چھپی اس کی غرض کو سوچتے ہوئے اس کا ذہن چیخنے لگا تھا۔ کالج کے بعد اسپتال جانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ سیدھے گھر جانے کا سوچ کر ہی وہ گاڑی میں بیٹھی تھی کہ اچانک کسی نے اس کے منہ پر رومال رکھ دیا بس چند سیکنڈ ہی اس نے ہاتھ پاؤں مارے تھے' پھر تاریکیوں میں ڈوب گئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تمام سبز سایہ دار پیڑوں نے
ترے بغیر وحشتوں میں اپنے پیرہن کو تار تار
کر دیا ہے
اب کسی شجر کے جسم پر قبا نہیں
سوکھے زرد پتے
کو بہ کو تری تلاش میں بھٹک رہے ہیں
اُداسیاں ۔۔ اُداسیاں
مرے دریچوں میں گلابی دھوپ روز جھانکتی ہے
مگر اب اس کی آنکھوں میں
وہ جگمگاہٹیں نہیں
جو تیرے وقت میں زمین کے صبح ماتھے پر
سورجوں کی کہکشاں سجانے آتی تھیں
زمین بھی مری طرح ہے
ترے بغیر اس کی کوکھ سے بھی اب
کوئی گلاب اُگ نہ پائے گا
زمین بانجھ ہو گئی ہے
اور میری روح کی بہار آفریں کوکھ بھی
میری سوچ کے صدف میں

پروین شاکر

ہر طرف رونقیں ہیں، میلے ہیں
اور ہم شہر میں اکیلے ہیں

من کا مرہم کہیں نہیں بکتا
سو دُکانیں، ہزار ٹھیلے ہیں

زہر کھانے کی بھی نہیں فرصت
وہ بکھیڑے ہیں، وہ جھمیلے ہیں!

بعد میں ہو گئے بڑے دونوں
صرف بچپن میں ساتھ کھیلے ہیں

یہ نہیں دیکھتا وہ نکتہ نواز
کس نے پاپڑ زیادہ بیلے ہیں

دُشمنوں کے علاوہ ہم نے شعور
دوستوں کے ستم بھی جھیلے ہیں

انور شعور

شگفتہ جاہ

رنگارنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب تم میں سے کوئی شخص روزہ کھولے تو اسے چاہیے کہ وہ کھجور سے روزہ کھولے۔ اس لیے کہ اس میں برکت ہے۔ اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے (کھولے) کیونکہ یہ پاک ہے اور پاک کرنے والا ہے۔"

اور فرمایا۔
"مسکین پر (کیا گیا) صدقہ (صرف) صدقہ ہے اور رشتے دار پر (کیے گئے) صدقے کی دو حیثیتیں ہیں۔ وہ صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔"

فوائد و مسائل:۔

1۔ روزہ کھجور یا پانی سے کھولنا زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ ان کے علاوہ جس چیز سے بھی افطار کیا جائے، تمام چیزوں کا ثواب برابر ہے۔ بعض لوگوں کا نمک سے روزہ افطار کرنے کو باعثِ اجر قرار دینا بلا دلیل ہے۔

2۔ غریب رشتے دار پر صدقہ کرنے کا دُہرا اجر ہے۔ عموماً لوگ اپنے عزیز و اقارب کو بھلا دیتے ہیں مگر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ دوسروں کی بہ نسبت ان کا زیادہ خیال کرنا چاہیے۔

(ریاض الصالحین)

قرآن کریم اور لفظ اللہ کے متعلق ایک غیر مسلم کا اعترافِ حقیقت

ہالینڈ کے ایک ماہر نفسیات پروفیسر ڈاکٹر وینڈیلون نے اپنی تین سالہ تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ لفظ "اللہ" کا مسلسل ورد کرنے سے انسان بہت سی بیماریوں بالخصوص امراضِ قلب، سانس، ذہنی پریشانی اور دباؤ سے بچ سکتا ہے۔ ڈچ پروفیسر ڈاکٹر وینڈ۔ لیون کا کہنا ہے کہ

اس نے تین سال لفظ "اللہ" پر مسلسل تحقیق کی اور اسے بہت سے مسلم غیر مسلم مریضوں اور دیگر افراد پر آزمایا۔ اس نے اپنے غیر مسلم مریضوں کو سب سے پہلے عربی پڑھنا سکھایا انہوں نے کہا کہ جو مسلمان باقاعدگی سے قرآن پاک پڑھتے ہیں، وہ نفسیاتی بیماریوں سے بچ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ لفظ اللہ کے تمام حروف کو الگ الگ پڑھنے سے سانس کے نظام کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

مہوش ڈوگر۔ گوجرانوالہ

سچی باتیں،

- عمر بھی ضمیر اور جوتے کی مانند ہے ان کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ تکلیف نہ دینے لگیں۔
- محبت اعتبار کے بغیر کچھ بھی نہیں جبکہ اعتبار بغیر محبت کے بھی بہت قیمتی ہوتا ہے۔
- بات ہمیشہ الفاظ کی نہیں لہجے کی ہوتی ہے۔
- انسان جس کیفیت میں اور عقیدے میں جان دے گا، اسی میں اٹھایا جائے گا۔ دعا کریں وقتِ رخصت کلمہ نصیب ہو۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران۔ گجرات

ایمان داری،

ایک کاروباری آدمی تجارت میں ایمان داری کی اہمیت کے موضوع پر اپنے دوست سے گفتگو کر رہا تھا۔

"کل ہی کی بات ہے، مجھے ایک گاہک نے ادائیگی کے لیے ایک ہزار روپے کا نوٹ دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا تو وہ چپکے ہوئے دو نوٹ تھے۔ بس وہیں ایمان داری کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔"
"تم نے کیا کیا پھر؟" دوست نے اشتیاق سے پوچھا۔
"میں سوچ رہا تھا کہ اپنے پارٹنر کو یہ بات بتاؤں یا سارے پیسے خود ہی رکھ لوں..." کاروباری آدمی نے جواب دیا۔

شگفتہ فیاض۔ امریکہ

سُنتے جاؤ،

خواہشیں پوری ہو جائیں تو انتظار ختم ہو جاتا ہے لیکن انتشار پھر بھی قائم رہتا ہے۔ پھر یہ انتشار اگلی خواہش کو تخلیق کرتا ہے اور اگلی خواہش، اگلے انتشار کو تخلیق کرتی ہے۔ سو منتشر ہونے سے بہتر ہے کہ خواہش ہی نہ کی جائے۔

تنزیل زہرہ۔ شہداد پور

کچھ لفظ چُنے ہیں،

- سمندری جہازوں کے لیے سب سے محفوظ جگہ ساحل ہوتی ہے مگر سمندری جہاز ساحلوں کے لیے نہیں بنائے جاتے۔ وہ سمندر میں سفر کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔
- دو ٹوک رویے بہت سی الجھنوں سے بچاتے ہیں۔
- آپ کی کہی ہوئی کوئی بات کسی کو بدل دے، کسی کے ساتھ ساری زندگی کسی اچھے سنگی ساتھی کی طرح لپٹی رہے تو وہ بھی صدقہ جاریہ ہوتا ہے وہ بات آگے تک جاتی ہے، پھیلتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ ہماری راہ کے کانٹے ہٹاتی جاتی ہے۔

صبا سلیم۔ ٹنڈو جان محمد

امکان،

ایک شخص گدھے پر سوار کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک شخص نے اس کو دیکھا جو ایک شاندار گھوڑے پر سوار تھا۔ گھڑ سوار کے سامنے اس آدمی نے جھک کر درخواست کی۔
"جناب والا! کیا آپ میری سواری سے اپنی سواری تبدیل کرنا پسند کریں گے؟"
"نہیں، کیا تم احمق ہو؟" گھڑ سوار نے غصے سے جواب دیا۔
"نہیں،" گدھے کے مالک نے جواب دیا۔ "لیکن ممکن ہے کہ آپ ہوں۔"

نمرہ، اقراء۔ کراچی

اعتماد،

شاخ پر بیٹھا پرندہ شاخ کی کمزوری یا اس کے جھولنے سے نہیں ڈرتا کیونکہ اس کو شاخ پر نہیں اپنے پروں پر اعتماد ہوتا ہے۔

مدیحہ شہزاد۔ چک 190 ایم۔ ایل

بے چارگی،

امریکہ میں ایک خوش پوش نوجوان بار میں گیا اور آرڈر دینے کے بعد بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔ بار میں بیٹھے ہوئے تمام افراد کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر قہقہے لگانے لگا۔ کافی دیر تک اس کی یہی حالت رہی۔ کبھی وہ قہقہے لگاتا اور کبھی پھوٹ پھوٹ کر روتا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اس کیفیت سے نکلا تو سوالیہ چہرے لیے بار میں بیٹھے تمام افراد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"معاف کرنا دوستو! مجھے ایک چیز کے جانے کی بے حد خوشی ہے اور ایک چیز کے جانے کا بے حد رنج ہے۔ مجھ پر بیک وقت دو احساسات طاری ہیں۔ نہ میں اپنی خوشی دبا سکتا ہوں اور نہ اپنے شدید غم کو ضبط کر سکتا ہوں۔"

لوگوں کے چہروں پر اب بھی سوالیہ نشان بنے رہے تو اس نے مزید وضاحت دی۔
"دراصل میری زیرِ تربیت ساس میری نئی کار ڈرائیو کرتے ہوئے کھودی چٹان والے راستے پر چلی

گئی ہیں۔ اور اب کسی بھی وقت دونوں کے خاتمے کی خبر آنے والی ہے . . .''

الماس تنویر ۔ ہری پور ہزارہ

چوتھی جنگِ عظیم،

البرٹ آئن اسٹائن سے کسی نے پوچھا۔''تیسری عالمی جنگ میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے؟''

اس نے جواب دیا۔''زمانہ اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ یہ بتانا مشکل ہے۔ البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ چوتھی جنگِ عظیم میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے۔''

''کون سے ہوں گے؟'' سائل نے اشتیاق سے پوچھا۔

''پتھر۔'' آئن اسٹائن نے جواب دیا۔

ملیحہ صدیقی ۔ کراچی

خلیل جبران نے کہا،

- بدبختی یہ ہے کہ میں اپنا خالی ہاتھ لوگوں کی طرف بڑھاؤں اور کوئی اس میں کچھ نہ رکھے۔ اور مایوسی یہ ہے کہ میں اپنا بھرا ہوا ہاتھ لوگوں کی جانب بڑھاؤں اور کوئی اس میں سے کچھ نہ لے۔
- میں زمانے کا قیاس اپنے اس قول سے کروں گا ''کل تھا اور کل ہوگا۔''
- جو آدمی زیادہ بولتا ہے، اتنا ہی کم سمجھ ہوتا ہے۔ اور ایک خطیب اور دلال کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔
- کچھوے راستوں کو خرگوش سے زیادہ سمجھتے ہیں۔
- ایمان دل کے صحرا میں ایک سرسبز و شاداب قطعہ ہے جہاں فکر کے قافلے نہیں پہنچ سکتے۔

نوال افضل گھمن ۔ گجرات

لفظ باتیں کریں،

- بارش کا قطرہ سانپ اور سیپ دونوں کے منہ میں جاتا ہے لیکن سانپ اسے زہر اور سیپ اسے موتی بنا دیتا ہے۔ یہ ہر ایک کی اپنی تخلیق ہے۔
- اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کبھی کسی سے توقع مت رکھو۔ کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔
- انسان کے کردار کی دو ہی منزلیں ہیں .... دل میں اُتر جانا یا دل سے اُتر جانا۔
- کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس کم ہوتا ہے لیکن وہ سب دے دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی کی سخاوت پر سوان کا صندوق خالی نہیں ہوتا۔

نوشین اقبال نوشی ۔ گاؤں بدسر جلین

رشتے،

جب ناخن بڑے ہو جاتے ہیں تو ناخن ہی کاٹے جاتے ہیں، انگلیاں نہیں۔ بالکل اسی طرح جب آپس میں رشتے داروں میں غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو غلط فہمیاں ختم کرنی چاہئیں نہ کہ رشتے۔

اُمِ کلثوم نوتاری ۔ کدو

عدل و احسان،

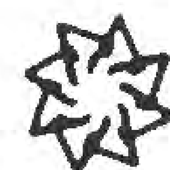
خلیفہ منصور عباسی کے سامنے دو مجرم پیش کیے گئے۔ دونوں کا ایک ہی جرم تھا۔

ایک کو موت کی سزا ملی تو دوسرا بول اُٹھا۔

''اے امیر المومنین! اللہ نے عدل و احسان دونوں کا حکم دیا ہے۔ آپ نے میرے ساتھی کے ساتھ عدل کیا، اب میرے ساتھ احسان فرما دیجیے۔''

خلیفہ اس بات پر جھوم اُٹھا اور دونوں کو معاف کر دیا۔

سعدیہ سلیم ۔ کراچی



امت الصبور

خواتین کی ڈائری

اقرا نوید کی ڈائری سے

امجد اسلام امجد کی یہ نظم گزرتے وقت کا استعارہ ہے جو اپنے اثرات ہر شے پر ثبت کرتا ہے۔ اہلِ چمن کے دل و نظر سے گلہ ہے جو بکھرے خوابوں کو نہ سنبھال سکے۔

گلہ ہوا سے نہیں ہے ہوا تو اندھی تھی
مگر وہ برگ کہ ٹوٹے تو پھر ہرے نہ ہوئے
مگر وہ سر کہ جھکے اور پھر کھڑے نہ ہوئے
مگر وہ خواب کہ بکھرے تو بے نشاں ٹھہرے
مگر وہ ہاتھ کہ بچھڑے تو استخواں ٹھہرے
گلہ ہوا سے نہیں، تندیٔ ہوا سے نہیں
ہنسی کے تیر چلاتی ہوئی فضا سے نہیں
عدو کے سنگ سے اغیار کی جفا سے نہیں
گلہ تو گرتے مکانوں کے بام و در سے ہے
گلہ تو اپنے بکھرتے ہوئے سفر سے ہے
ہوا کا کام تو چلنا ہے، اس کو چلنا تھا
کوئی درخت گرے یا رہے، اسے کیا ہے
گلہ تو اہلِ چمن کے دل و نظر سے ہے
خزاں کی دھول میں لپٹے ہوئے شجر سے ہے
گلہ سحر سے نہیں رونقِ سحر سے ہے

صبا سلیم کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ظہیر اقبال کی یہ غزل آپ سب بہنوں کی نذر۔

سب خواب ریزہ ریزہ ہوئے، بے اماں ہوئے
ہم خود غرض نہیں تھے، مگر رائیگاں ہوئے

کن راستوں میں کھو گئی زندگی مری
کس رہگزر کی گرد مرے کارواں ہوئے

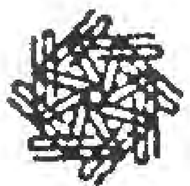
لمحوں کی گرد روح میں رچ بس کے رہ گئی
سب چہرے بجھ کے رہ گئے، یکسر دھواں ہوئے

زندہ حقیقتوں کی طرح تھے جو کل تلک
وہ دیکھتے ہی دیکھتے اک داستاں ہوئے

دنیا تو گام گام پہ نفرت بدوش تھی
تم بھی قدم قدم پہ مرا امتحاں ہوئے

اُس شہرِ بے خزاں کی بہاریں تمہیں سے تھیں
کیوں اپنا شہر چھوڑ دیا، بے نشاں ہوئے

جن راستوں پہ ساتھ چلے تھے کبھی ظہیر
اب وہ ہمارے واسطے اک آستاں ہوئے





خبریں وغیرہ

تبصرہ نشاط

کھیل

بزرگوں سے سنا تھا کہ "شادی بیاہ کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں۔" لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ کچھ لوگ اسے کھیل ہی سمجھتے ہیں۔ جیسے اپنے عدنان سمیع...... یا پھر عدنان جیلانی...... (ان دونوں کا صرف نام ہی مماثل نہیں، شوق بھی ایک جیسا ہی ہے۔) دونوں شادیوں پر شادیاں کیے چلے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں عدنان کی اپنی اہلیہ صباح گلداری سے علیحدگی ہوئی ہے۔ عدنان نے صباح سے دو مرتبہ شادی کی۔ یہ مغرب کا خاصا پسندیدہ چلن ہے، جو عدنان نے بھی اپنا لیا۔ (شکر ہے! عدنان یہاں نہیں رہتے، ورنہ ان کی تقلید میں یہاں بھی اسے رواج دے دیا جاتا۔) پہلی مرتبہ ان کی شادی 2001ء میں ہوئی، تاہم یہ شادی زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور دونوں طرف سے مختلف الزامات کی بوچھاڑ کے بعد 2004ء میں ختم ہوگئی۔ صباح نے عدنان پر شراب نوشی کے بعد مار پیٹ کرنے کا مقدمہ بھی دائر کر دیا۔ کچھ وقت گزرا۔ دونوں کے دل میں دلی محبت نے جوش مارا۔ یوں 2007ء میں دونوں نے پھر شادی کر لی۔ تاہم اس مرتبہ بھی دونوں میں نباہ نہ ہو سکی۔ صباح نے علیحدگی کے لیے 2011ء میں عدالت سے رجوع کیا۔ گزشتہ دنوں عدالت نے اس مقدمے کا فیصلہ سنا دیا۔ یوں دونوں پھر علیحدہ ہوگئے۔

اس مرتبہ عدنان نے صباح پر زیادہ الزامات لگائے ہیں۔ کبھی عدنان نے کہا کہ صباح نے ان کی زندگی کو جہنم بنا رکھا تھا۔ وہ عدنان سے اپنے خاندان کے ساتھ رقص کرنے اور گانا گانے کی اجازت چاہتی تھی۔

(لوجی! خود تو دنیا بھر کے سامنے یہی کچھ کرتے ہیں)

کچھ چینلز پر عدنان کا ایک اور بیان چلا کہ صباح کا تعلق طالبان سے ہے۔ (طالبان اور رقص و سرور کی فرمائش......؟ لگتا ہے عدنان کے بیانات بھی اسی شخص نے لکھے ہیں، جس نے 2 مئی 2011ء کا ایبٹ آباد والا اسکرپٹ لکھا تھا۔ ویسے عدنان جی! آپ ہمارے اچھے وزیر داخلہ بن سکتے ہیں۔)

کام

نرگس کو شوبز میں آئے ایک عرصہ بیت چلا ہے۔ مگر گزرتے وقت نے ان پر کوئی خاص اثرات مرتب نہیں کیے ہیں۔ وہ فلموں سے اسٹیج کی دنیا میں آئیں اور ایسی چھائیں کہ پھر کوئی ان کا مدمقابل نہ رہا۔ (یہ اور بات ہے کہ اداکاری سے زیادہ ان کے "رقص" مقبول ہیں۔) تاہم نرگس اسٹیج کی وہ اداکارہ ہیں، جو متعلقہ حکام کی جانب سے آئے دن پابندیوں کی زد میں رہتی ہیں۔ حال ہی میں فیصل آباد کے ڈی سی او نے نرگس کے لاچا پہن کر کام کرنے پر پابندی عائد کردی ہے۔ اس پر نرگس کی طرف سے بیانات کی ایک سیریز کھیلی جارہی ہے۔

نرگس نے الزام عاید کیا ہے کہ ڈی سی او ان سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ نرگس نہ مانیں تو وہ دشمنی پر آمادہ ہوگئے۔ ("د" سے دوستی کے بجائے "د" سے دشمنی۔)

بلکہ نرگس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ لوگ تو انہیں چالیس فٹ کے فاصلے سے دیکھتے ہیں، لیکن وہ انہیں چالیس انچ کے فاصلے سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ (فاصلہ تو رکھا ہے ناں...... ویسے ان کی دور کی نظر کمزور ہوگی۔)

نرگس کا کہنا ہے کہ وہ لاچا نہیں پہنیں گی تو کیا...... وہ شلوار قمیص میں بھی نرگس ہی رہیں گی۔ (انہیں آپ اسی لباس میں اچھی لگتی ہوں گی ناں!) نرگس نے دعوا کیا ہے کہ "لوگ مجھے نمبرون کہتے ہیں۔ آج تو ایسی اداکارائیں، جن کو اداکاری کی الف ب بھی نہیں آتی، خود کو نمبرون کہتی ہیں۔ میری ان کے لیے عقل کی دعا ہے۔" (وہ بھی آپ کے لیے یہی دعا کرتی ہیں۔)

نرگس نے مزید دعوا کیا کہ وہ کام کے پیچھے نہیں، بلکہ کام ان کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ (تو آپ کام سے کیوں بھاگ رہی ہیں...... ویسے کہیں آپ کے آگے "پیسہ" تو نہیں بھاگ رہا؟)

بھوک ہڑتال

مغربی اقوام عالم پاکستان کو ایک دہشت گرد ملک قرار دیتی ہیں جبکہ ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم لوگ (چند گندی مچھلیوں کو چھوڑ کر) دہشت گردی سے اتنی دور بھاگتے ہیں کہ ہمارے ملک میں تو ایسے کھیل بھی مقبول عام نہیں کہ جن میں مار پیٹ کا عنصر نمایاں ہو۔ مثلاً "باکسنگ"۔ یہ ایسا کھیل ہے جو ہمارے ملک میں کوئی خاص مقام نہ پا سکا، حالانکہ اس شعبے میں ہمارے پاس کئی گوہر نایاب موجود ہیں۔



حسین شاہ ایک ایسے عظیم باکسر ہیں، جنہوں نے ہمارے لیے باکسنگ میں اولمپک گولڈ میڈل حاصل کیا۔ (غالباً" باکسنگ کا ہمارا اکلوتا اولمپک میڈل) یہی نہیں، حسین شاہ نے اپنے کیریر میں ایشین گیمز میں پانچ گولڈ میڈل اور ساؤتھ ایشین گیمز میں بھی گولڈ میڈل حاصل کیے۔ 80 کی دہائی میں پورے ایشیا میں باکسنگ کی دنیا میں حکمرانی کی اور بہترین باکسر کے اعزاز پر قابض رہے۔ ہم نے حسب عادت اس عظیم باکسر کی قدر نہ کی اور آج حسین شاہ جاپان میں پاکستانی سفارت خانے کے سامنے بھوک ہڑتال کرنے پر مجبور ہیں۔

یہ 1988ء کی بات ہے، جب حسین شاہ نے اولمپک میں پاکستان کا پہلا باکسنگ گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ اس وقت کی حکومت نے حسین شاہ کو کراچی میں صرف ایک سو بیس گز کا ایک پلاٹ دینے کا اعلان کیا۔ حسین شاہ کرکٹر تو تھے نہیں، جو نخرے کرتے۔ وہ لیاری جیسے پسماندہ علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک منکسر المزاج باکسر تھے۔ سو پلاٹ کے کاغذات ان کے حوالے کردیے گئے۔ تاہم جب حسین شاہ پلاٹ دیکھنے پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کوئی پلاٹ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ حسین شاہ نے کئی حکومتی عہدے داروں سے رابطے کیے، مگر شنوائی نہ ہوئی۔ موجودہ حکومت کے سابق وزیر اعظم کے پاس بھی گئے، مگر چونکہ ان کے پاس کرنے کے لیے اور بھی بہت سے بڑے بڑے کام تھے سو وہ حسین شاہ کے چھوٹے سے کام پر کیا توجہ



دیتے۔ نتیجتاً" چوبیس سال گزرنے کے بعد بھی حسین شاہ اپنے حق سے محروم ہیں۔
(حسین شاہ جی! بھوک ہڑتال کرنے سے بہتر ہے، حالات حاضرہ کے کسی پروگرام کے اینکر پرسن بن جائیں۔ ایک سو بیس گز کے ایک پلاٹ کے تو کیا، بیٹھے بٹھائے ہزاروں مربعوں اور کنالوں پر مبنی پلاٹ کے مالک بن جائیں گے۔)

کچھ ادھر ادھر سے

دنیا کا ہر مثبت کام روح کی خوراک ہوتی ہے اور دنیا کی ہر منفی سرگرمی ہماری روح کے لیے بیماری۔ فلاح عامہ، خدمت، برداشت، وسعت قلبی، سخاوت، انسانیت، رحم دلی، گواہی، انصاف یہ وہ تمام مثبت سرگرمیاں ہیں جو روح کی وٹامن ہوتی ہیں اور ان سے روح کے اندر سکون پیدا ہوتا ہے اور یہ سکون خوشی بن کر ہمارے چہرے، ہماری آنکھوں میں چمکتا ہے۔

(جاوید چودھری۔ زیرو پوائنٹ)

12 مئی 2007ء کو چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو سندھ ہائی کورٹ تک جانے سے روکنے کے لیے شاہراہ فیصل جیسی مصروف شاہراہ کو قتل گاہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس طرح 22 مئی 2012ء کو بھی سندھ محبت ریلی پر فائرنگ کر کے پریس کلب تک جانے سے روک دیا گیا۔

(خورشید علی عباسی)

سید زادہ ملتان یوسف رضا گیلانی نے اخباری انٹرویو میں یہ بھی کہا کہ میں نے عدالت کی کوئی توہین نہیں کی۔ یہ صرف آئین کی تشریح کا معاملہ ہے۔" اس نکتہ میں ہر سزا یافتہ مجرم کے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکتا ہے کہ فلاں آئینی شق کی تشریح جو میں کر رہا ہوں، وہ درست ہے۔ وہ نہیں جو عدلیہ کر رہی ہے۔

(عرفان صدیقی۔ نقش خیال)

لیاری کے سیاسی کارکنوں کا کہنا ہے کہ ایف سی کے اہلکاروں نے گھروں کی تلاشی کے دوران امتیازی رویہ اختیار کیا اور بلوچ گھرانوں کے ساتھ بدترین سلوک کیا۔

(ڈاکٹر توصیف خان)

امریکا میں فوجیوں کی خود کشی ایک بڑا مسئلہ بن کر ابھر رہی ہے۔ روزانہ 18 سابق فوجی موت کو گلے لگا رہے ہیں۔ افغانستان اور عراق میں جنگ لڑنے والے ہزاروں فوجی موت کو گلے لگا چکے ہیں۔

(انتھونی سونفرڈ۔ نیوز ویک)

یوسف رضا گیلانی میں پارٹی سے وفاداری کے سوا کوئی خوبی نہیں۔ یہ نام کے پڑھے لکھے ہیں۔ یہ کرپشن کے بادشاہ ہیں اور ان میں وہ گہرائی بھی نہیں تھی جو وزیر اعظم کے عہدے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

(جاوید چودھری۔ زیرو پوائنٹ)

راجہ پرویز اشرف کو وزارت سے سے محض اس لیے ہٹایا گیا کہ ان کی پرفارمنس ٹھیک نہیں تھی انہیں چیف ایگزیکٹو کیوں بنا دیا گیا؟ نالائقی کی اتنی بڑی سزا؟

(اماز خان۔ جستجو)

☆

میری بیاض سے

خالدہ جیلانی

مسرت حسن ______ سعودی عرب
عجب انداز ہیں اس کے بھی سجنے اور سنورنے کے
گماں کرتا ہوں میں جیسا، وہ اکثر وہ نہیں لگتا

نوشین اقبال ______ سندھلیانوالی
وہ دریا سو گیا اپنی روانی ختم کر کے
مجھے بھی گھر پلٹنا ہے کہانی ختم کر کے
مجھے بھی رفتگاں کی سمت ہی تو لوٹنا ہے
کسی دن ناگہاں یہ خوش بیانی ختم کر کے

سارا نوید ______ کراچی
زمین و آسمان ہوتے ہوئے بھی
میں بے گھر ہوں مکاں ہوتے ہوئے بھی
ہزاروں خوبیاں ہیں آدمی میں
ہزاروں خامیاں ہوتے ہوئے بھی

کومل عدنان ______ گلستان جوہر
شریک سفر دوستارے ہوئے
ہم ان کے ہوئے، وہ ہمارے ہوئے
عجب آسمانوں کی سیریں ہوئیں
عجب جنتوں کے نظارے ہوئے

رابی جولی ______ فیروزہ
تباہ سوچ سمجھ کر نہیں ہوا جاتا
جو دل لگاتے ہیں، فرزانے تھوڑی ہوتے ہیں
کہاں زبان و بیاں کارگر محبت میں
یہ معاملے سمجھانے تھوڑی ہوتے ہیں

حنا کنول ______ حویلی لکھا
تمہارا ساتھ ہو تو سارے موسم اچھے لگتے ہیں
وگرنہ بے مزا ہیں پھول، خوشبو اور برساتیں

فوقیہ رباب چیمہ ______ چیچہ وطنی
لے کر زنجیریں ہاتھوں میں کچھ لوگ تمہاری تاک میں ہیں
اے عشق ہماری گلیوں میں نہ اور پھرو تو اچھا ہے

ام کلثوم نونادی ______ گڈو کشمور
کتنے برسوں کا سفر خاک ہوا
اس نے جب پوچھا کیسے آنا ہوا؟

ناہید نور الٰہی ______ کراچی
ہر ایک دن اداس دن ہر ایک شب اداسیاں
کسی سے کیا بچھڑ گئے کہ جیسے کچھ بچا نہیں

نمرہ، اقرا ______ کراچی
تاک میں دشمن بھی تھے اور پشت پر احباب بھی
تیر پہلا کس نے مارا یہ کہانی پھر سہی

اریبہ خان ______ خان پور
اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ بھی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیادِ وفا رکھی تھی

سیدہ نسبت زہرا ______ کہروڑپکا
لہو لہان چراغوں کے سر ملے ہیں مجھے
تمہارے شہر میں ایسے بھی گھر ملے ہیں مجھے

سدرا انجم ______ کوئٹہ
مجھے بتاؤ اگر گھونسلے سلامت تھے!
ہوا میں اڑتے ہوئے کس کے پیر ملے ہیں مجھے

ندا، فضہ ______ کراچی
کہاں کا سود و زیاں اور کہاں کا کار جہاں
ضرورتوں کی مسافت نے مار رکھا ہے

صدف محبوب ______ سرگودھا
عجب بے کلی ہے، پس عشق بھی
یہ لمحہ گزارا نہیں جا رہا!
نہیں دور تک جیت کا شائبہ
مگر ہم سے ہارا نہیں جا رہا

☆

خاموشی کو زبان ملے

ادارہ

ثمینہ اکرم لیاری کراچی

شادی سے پہلے ثمینہ علی کہلانا پسند تھا مگر اب یہی نام میری پہچان ہے۔ شہر قائد میں لیاری کے علاقہ بہار کالونی میں گزشتہ کئی سال سے مقیم ہوں۔ ماشاءاللہ چار بچوں کی والدہ ماجدہ کے عہدے پر فائز ہوں اور ایک عرصہ سے مستقبل کے معماروں کو علم کی روشنی سے روشناس کرا رہی ہوں (میں اپنے گھر پہ بچوں کو کوچنگ دیتی ہوں) کراچی یونیورسٹی سے گریجویٹ ہوں وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں۔ پسندیدہ مشغلہ میں سر فہرست "مطالعہ کرنا اور ڈائری لکھنا ہے۔" میں کئی بار کے پڑھے ہوئے ناولز بھی بار بار پڑھنے سے بور نہیں ہوتی۔ پڑھنے کا اتنا چسکا ہے کہ اگر دوران صفائی کوئی اخبار کا صفحہ ہاتھ لگ جائے تو صفائی چھوڑ چھاڑ وہ پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ اسی بدولت معلومات غضب کی ہیں۔ ٹی وی پر صبح "عالم آن لائن" دیکھتی ہوں۔ حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کے لیے نیوز چینل بھی دیکھتی ہوں۔ مارننگ شو دیکھ کر بی پی شوٹ کرتا ہے اس لیے نہیں دیکھتی لیکن اگر ہماری ڈائجسٹ رائٹرز کا لکھا کوئی ڈراما چل رہا ہو تو صرف وہ دیکھتی ہوں۔ بصورت دیگر ہمارے ٹی وی ڈراموں کا معیار بہت گر گیا ہے اور پھر ٹی وی کے آگے بیٹھنے کی فرصت ملتی بھی نہیں ہے۔ شادی کے بعد میں نے تعلیم جاری رکھی۔ مختلف قسم کے کورسز + ڈپلومہ کیے۔ کیونکہ مجھے فارغ رہنے سے زیادہ مصروف رہنا اچھا لگتا ہے۔

"خواتین ڈائجسٹ" سے میرا تعلق اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ میں خود پرانی ہوں۔ 7th کلاس سے رسالہ پڑھنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ ــــــ اس کے ابتدائی شمارے بھی پڑھ ڈالے "جس کے لیے میں نے کوئی لائبریری، ٹھیلا اور پرانا بک اسٹال نہیں چھوڑا۔ جگہ جگہ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر رسالے خریدے اور ابتدا سے اب تک کے تقریباً" سب ہی شمارے پڑھ ڈالے۔ پڑھنے کی رفتار ڈرون حملوں کو بھی پیچھے چھوڑتی ہے۔ شادی سے پہلے ایک ہی نشست میں پورا ڈائجسٹ ختم کیا کرتی تھی۔ جس پر اباجی مرحوم ناراض ہوتے تھے۔ پھر میں ہمیشہ اباجی کے مسجد جانے کے بعد ہی رسالہ پڑھا کرتی تھی۔

پہلے پہل صرف "خواتین ڈائجسٹ" پڑھنا شروع کیا۔ بعد میں "شعاع اور کرن" کی بھی ریگولر قاری بن گئی۔ ہمیشہ اپنے جیب خرچ سے منگا کر پڑھا اور دوسروں کو بھی اس کا عادی بنا دیا۔ جبکہ اسٹوڈنٹ لائف میں کبھی میری تعلیم پر اس کا برا اثر نہ پڑا۔ بلکہ ہر قسم کے حالات میں مجھے اس سے رہنمائی ہی ملی۔ میں ہمیشہ اپنی کلاس کی پوزیشن ہولڈر رہی۔ دوران امتحانات بھی میں باقاعدگی سے ڈائجسٹ پڑھا کرتی تھی۔ شعور و آگہی کی دہلیز پہ قدم رکھا تو پھر اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ اس نے ایک استاد کی طرح ہر قدم پر مجھے سنبھالا۔ ہر دفعہ میں نے اسے پڑھ کر کچھ نہ کچھ سیکھا ضرور ہے اور آج تک سیکھ رہی ہوں۔ جب بھی میں کوئی نصیحت آموز کہانی پڑھوں تو اپنی میٹرک اسٹوڈنٹس سے ضرور شیئر کرتی ہوں اور انہیں بھی خواتین ڈائجسٹ پڑھنے کی تاکید کرتی ہوں کیونکہ خواتین کی کہانیاں شخصیت کو سنوارتی ہیں، بگاڑتی نہیں۔ اس کے پڑھنے سے وقت کا ضیاع نہیں ہوتا، بلکہ ہم علم کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ زندگی کی وہ کٹھن حقیقتیں جن سے ہم نظریں چراتے ہیں، اسی کی وجہ سے آسان ہو جاتی ہیں۔ ہر ماں کو اپنی بیٹی کے لیے "خواتین" ضرور اپنے گھر لگوا لینا چاہیے۔ "خواتین" ہی نہیں بلکہ "شعاع" اور "کرن" بھی ہر گھر میں ہر ماہ ضرور آنا چاہیے۔ یہ بچیوں میں زندگی کو بہتر انداز میں سمجھنے اور گزارنے کا سلیقہ و قرینہ سکھلاتا ہے۔

آج تک مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آیا! میرے اندر کوئی خوبی ہے بھی کہ نہیں۔ مجھے تو صرف اپنی خامیوں سے ہی آگاہی ہے۔ بہت زیادہ حساس ہوں اور میری حد سے بڑھی ہوئی حساسیت اکثر نقصان سے دوچار کرتی ہے۔ ملکی حالات اور سیاستدانوں کے کارناموں (کرپشن کے کارناموں) پر جلتی کڑھتی رہتی ہوں۔ کسی کی جوان اور ناگہانی موت پر ہفتوں دکھی رہتی ہوں۔ لوگوں پر بہت جلد بھروسا کر لیتی ہوں۔ بدلتے رویے مجھے بہت دکھ دیتے ہیں۔ اپنے دکھوں کی تشہیر کرنا مجھے پسند نہیں۔ اجنبی لوگوں سے جلدی گھل مل نہیں سکتی۔ دوست بنانے میں کبھی پہل نہیں کرتی، تحفہ لینے سے زیادہ تحفہ دینا پسند ہے۔ گفٹس دینے کے مواقع ڈھونڈتی ہوں۔ اس بات سے مجھے دلی خوشی ملتی ہے۔ سنجیدہ مزاج اور کم گو ہوں مگر اپنے فیورٹ لوگوں سے گھنٹوں بغیر فل اسٹاپ و کومے کے بول سکتی ہوں۔ (جیسے انیلہ یا پھر فریدہ) گھر میں رہنا پسند ہے تقریبات میں جانا بالکل پسند نہیں۔ ٹھنڈے مزاج کی ہوں مگر جب غصہ آتا ہے تو بہت شدید آتا ہے۔ غلط بات بالکل برداشت نہیں ہوتی۔ قناعت پسند ہوں اللہ کی رضا میں راضی رہتی ہوں۔ اللہ پر توکل کامل ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ بندوں کو صبر کرنا چاہیے، پھر صبر و شکر کا انعام ملتا ہے۔

شادی سے پہلے کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی، کیونکہ امی کے گھر یہ خرافات منانے کا رواج نہیں، جبکہ سسرال میں سالگرہ کو بہت اہتمام سے سیلیبریٹ کیا جاتا ہے۔ تمام فیملی ممبران ایک دوسرے کا برتھ ڈے یاد رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو وش ضرور کرتے ہیں اور ٹریٹ بھی لیتے ہیں۔ میری تاریخ پیدائش 4 مئی ہے۔ بچوں کی طرح باقاعدہ موم بتی جلا کر کیک تو نہیں کاٹتی۔ ہاں! اس حد تک ضرور اپنی سالگرہ مناتی ہوں کہ کچھ بھی اچھا سا پکا کر سب کو ٹریٹ دے دی۔ رات کو اکرم آئس کریم کھلا دیتے ہیں۔ البتہ اپنی وہ سالگرہ میں کبھی نہیں بھول سکتی، جب میری میٹرک اسٹوڈنٹس نے میری سرپرائز برتھ ڈے سیلیبریٹ کی تھی۔ سب لڑکیوں کو معلوم تھا کہ 4 مئی کو میم کی سالگرہ ہوتی ہے۔ 4 مئی کی شام میں کچن میں کوکنگ کر رہی تھی، جب وہ لوگ چپکے سے آئیں اور ڈھیر سارے پھولوں کی مجھ پر بارش کر دی اور کورس میں "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" کہہ کر مجھے وش کیا۔ یقین جانیں، بچیوں کی اتنی محبت پر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ڈھیروں برتھ ڈے کارڈز + پھول + گفٹس..... سب سے زیادہ ان کی پر خلوص محبت جو میرے لیے سب سے زیادہ قیمتی ہے۔

4 مئی 2011ء کی بات ہے، جب ہما اور مریم نے کوچنگ کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر میری سالگرہ کی چپکے چپکے تیاری کی۔ (اتنی خاموشی سے سالگرہ شام میں ارینج کی کہ مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی) شام میں آ کر کمرے کو سجایا۔ کیک، کینڈلز، کولڈ ڈرنک دیگر اسنیکس سے ٹیبل سجا کر مجھے بلا کر سرپرائز اوپن کیا اور سب نے وش کیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں محبتوں کے معاملے میں کتنی امیر ہوں۔ ان کی ڈھیر ساری محبتیں پا کر میں سرشار ہو گئی، جبکہ وہ پھول اور کارڈز میں نے اب تک سنبھال کر رکھے ہیں، کیونکہ میں محبتوں کی اس قدر حفاظت کرتی ہوں۔ جب مجھے عمیرہ احمد کا ناول "ایمان، امید اور محبت" بطور برتھ ڈے گفٹ ملا۔ یہ سالگرہ کا دن بھی میرے لیے یادگار دن رہا۔

ایک وقت تھا جب میں نے درجنوں ڈائریاں ہزاروں اشعار سے بھر رکھی تھیں۔ شاعری میری کمزوری تھی۔ مگر اب میری یہ دیوانگی کم ہو چکی ہے۔ گھر اور بچوں کے چکر نے گھن چکر بنایا ہوا ہے۔ چلیں! میری پسند کا شعر پڑھیں اور مجھے دیں اب اجازت۔ دعاؤں کی طلب گار۔

اے خدا! اگر لوگ بنائے تھے پتھر کے
میرے احساس کو شیشہ نہ بنایا ہوتا !

وہی محسوس کرتے ہیں خلش درد محبت کی
جو اپنے آپ سے بڑھ کر کسی سے پیار کرتے ہیں ☆



ہمارے نام

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

فریحہ..... واہ کینٹ

میں نے خواتین ڈائجسٹ کا پہلا پرچہ 1990ء میں خریدا اس وقت سیکنڈ ایر میں تھی اور اسی سال میری شادی ہوئی تھی۔ 1997ء میں میں لندن برمنگھم میں شفٹ ہو گئی۔ بھائی سے میں نے کچھ ناول اور پرچے منگوائے۔ ان میں فریدہ اشفاق کا ایک ناول چل رہا تھا' اب نام یاد نہیں لیکن لڑکی نام رانی اور لڑکے کا نام شازے تھا آپ اگر مجھے اس ناول کا نام بتادیں اور یہ بھی کہ کیا مجھے مکمل ناول مل جائے گا۔ میں اپریل میں پاکستان آئی ہوں اور خواتین اور شعاع فوراً" خریدے ہیں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ عنیزہ سید، نگہت عبداللہ۔ آسیہ رزاقی سب موجود تھیں مجھے لگا میں صحیح معنوں میں اپنوں میں آگئی ہوں۔

ج: فریحہ! ہمیں خوشی ہے کہ اتنے طویل عرصے کے بعد خواتین سے آپ کا تعلق' رابطہ بحال ہوا تو آپ کو اس میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی جس ناول کا آپ نے ذکر کیا' وہ فریدہ اشفاق کا ناول شکست شب تھا۔ یہ کتابی شکل میں آ چکا ہے۔ مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی سے مل سکتا ہے۔

نایاب چندہ..... F.F.C چوک

یہ رسالے صادق آباد میری باجی کے پاس آتے ہیں پھر وہ اسی دن میرے پاس بھیج دیتی ہیں۔ میں پڑھ کر ارم کو دیتی ہوں پھر ہم باقی دو شادی شدہ بہنوں کرن اور سلطانہ کے پاس بھیج دیتے ہیں۔

میری' ارم کی اور باجی رانی کی فیورٹ کہانی "ساری بھول ہماری تھی" اس ماہ بھی یہ زبردست تھی اب آخری قسط کا انتظار ہے اور جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو بھی کافی سسپنس پر ختم ہوا۔

میرے خواب لوٹا دو کا پچھلی اقساط کا خلاصہ دیا ہوا ہے' اس میں یہ غلطی کی ہے کہ وہاں لکھا ہوا ہے اریبہ نے سارہ کو اپنی ماں کے بارے میں بتادیا جو کہ نہیں بتایا اور میرے مطابق اریبہ شمشیر کی ہیروئین ہے کیونکہ سارہ جن بستیوں میں جائے گی۔ رازی کو بھی لے جائے گی اور تاجور کا تو میں نے پہلے ہی کہا تھا وہ حماد کی ہیروئن ہے۔

ج: نایاب! آپ بہنیں جس طرح مل جل کر رسالے پڑھتی ہیں کاش وطن عزیز کے سارے لوگ اسی طرح ایک دوسرے کا خیال کرنا سیکھ لیں۔

غلطی کی نشان دہی کے لیے شکریہ آپ نے صحیح لکھا ہے۔ اریبہ نے سارا کو نہیں بتایا یہ جان کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ ہماری قارئین پچھلی قسطوں کا خلاصہ بھی دلچسپی اور بڑی توجہ سے پڑھتی ہیں۔

امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ثانیہ مشعل..... حویلی لکھا' تحصیل دیپالپور' ضلع اوکاڑہ

سرخ رنگ سے سجی ماڈل نہایت اچھی لگی۔ سب سے پہلے "جو بچے ہیں سنگ" پڑھا۔ اف فرحت آپی کی ہر

ہیروئین ہی محبت سے گندھی ہوتی ہے۔ ویل ڈن فرحت جی "بریکنگ نیوز" بہت اچھا لگا۔ سلائی سیکھنے سے تو جان چھوٹی۔

آسیہ رزاقی کا "آخری کوشش" زبردست۔ "لگی تھی جو جیت" سمیر حمید کا ناول اچھا تھا۔ مگر کچھ جھول سا تھا "میرے خواب لوٹا دو" کی یہ قسط شان دار رہی۔

ج: ثانیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

رابعہ ملک' جویریہ غنی..... قصبہ فیروزہ

ہمیشہ کی طرح پرچا اس ماہ بھی ہماری امیدوں سے بڑھ کر تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک قسط وار ناولز..... واہ مزہ آجاتا ہے۔

"کوہ گراں تھے ہم" کیا کمال کی اسٹوری ہے۔ بہت اسٹرونگ اور سب سے جدا۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں اس کی تعریف کے لیے۔ اینڈ میں ماہ نور بی بی تو گھوم گئی پر ہم جھوم گئے۔ اور آخر میں فرحت اشتیاق! آہا..... کیا لکھتی ہیں فرحت جی! ایک ایک لفظ موتیوں سے جڑا۔ بہت قیمتی ہے یہ اسٹوری ہمارے لیے۔ اب خدا جانے یہ ام مریم کیا کرتی ہے۔

ج: شعاع' خواتین ہمارے دکھ سکھ کے ساتھی۔ جیون جوگے شالا آباد رہیں۔ رابعہ اور جویریہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ بہت خوب صورت تبصرہ کیا آپ نے۔ تہہ دل سے شکریہ۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

صالحہ اقصیٰ..... میرپور' آزاد کشمیر

جون گرمیوں کی تپتی دوپہریں ہوں یا دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی سردی ہو۔ گرمیوں میں آم کھانے کا موسم ہو یا سردیوں میں مالٹے کھانے کا موسم خواتین اور شعاع سے رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔ وجہ شاید نہیں یقیناً" اس کا معیار جو شروع سے لے کر چالیس سال تک آج بھی قائم ہے۔ عنیزہ سید بڑی خوب صورتی سے کہانی کو آگے کی طرف بڑھا رہی ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ ماہ نور نے جس تماشے والے جوگی اور کمہار کو دیکھا ہے وہ ایک ہی شخص سعد ہے اور یہ اسی طرح کے مختلف کام کرتا رہے گا' فرحت اشتیاق کے ناول کی یہ قسط بھی ٹاپ پر رہی' آسیہ رزاقی کا ناول بھی اچھا تھا۔ شہزادی عباس کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔ افسانوں میں بریکنگ نیوز سب سے اچھا رہا باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ صنم بلوچ کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں اور سندھی میں ندایا سر اور یاسر نواز کا انٹرویو شائع کریں۔

ج: صبا اور اقصیٰ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف اور مشورے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ فرمائشیں نوٹ کرلی ہیں۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

سدرہ ساحر قریشی..... ٹھٹھہ سندھ

خط لکھنے کی وجہ فرحت اشتیاق کا ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" ہے اور سینور سکندر کا کردار بہت اچھا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے اس ماہ کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ "کرن کرن روشنی" پڑھ کر ایمان ترو تازہ ہو جاتا ہے۔

میں نے کافی سال پہلے ایک ناول پڑھا' ڈائجسٹ کافی پرانا تھا پھٹا ہوا اس لیے مصنف کا نام نہیں پڑھ سکی البتہ کہانی کا عنوان یاد ہے "وہ اک ایسا شجر ہو" تھا۔

ج: سدرہ خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ جس ناول کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے۔ وہ فرحت اشتیاق نے لکھا تھا۔ کرن میں نومبر 2000 میں شائع ہوا تھا۔ اب کتابی شکل میں آنے والا ہے۔

فرخندہ انجم..... لاہور

آج نہ تو کسی کہانی پر تبصرہ کرنا ہے نہ ہی کچھ اور لکھنے کو دل کر رہا ہے تمام پڑھنے والی پرانی نسل اور نئی نسل سے صرف ایک سوال پوچھنا ہے؟

کیا ایک ماں جو بیٹے کو پالتی ہے پڑھاتی ہے اس کے لیے لڑکی پسند کرتی ہے اور وہی لڑکی سسرال سے لائے ہوئے جوڑے کو پسند ہی نہ کرے شگون کے جوڑے کو نکاح کے دن پہن کر ہی نہ دکھائے اس لڑکی کی۔ تعلیم د تربیت کیا ہوئی اور وہ ساس جو بہو کو بیٹی بنا کر رکھنے کا سوچے بیٹھی ہو اسے پہلی سیڑھی پر روک دیا جائے۔

کہ تمہارا بیٹا تو ہمیں پسند ہے۔ تمہاری لائی ہوئی کوئی بھی چیز ہمیں پسند نہیں وہ ماں جس نے بازار گھوم گھوم کر سب کچھ پسند کیا ہو اس کی پسند کو اہمیت ہی نہ دی جائے لڑکی کی ماں بجائے اس کے کہ بٹی کو سمجھائیں۔ اس کی

ساس کو سمجھائیں چلیں بچی ہے۔ بس آج کل کی لڑکیاں ایسی ہی ہیں۔

میں آج کل کی لڑکیوں سے ایک سوال کرتی ہوں اگر آپ کو سسرال کی لائی ہوئی کوئی چیز پسند نہیں آئی تو کیا وہ ساس کے ساتھ پہلے قدم پر ایسا سلوک کرے گی؟ میں سخت پریشان ہوں ہو سکتا ہے آپ کا جواب مجھے ذہنی سکون دے۔

ج : فرخندہ! آپ کی پریشانی کا جان کر افسوس ہوا۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں تو یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں۔ شادی کا دن ایک لڑکی کی زندگی کا اہم ترین دن ہوتا ہے۔ اس دن اسے سینکڑوں لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنا ہوتا ہے مووی کی شکل میں یہ لمحات تاعمر محفوظ رہتے ہیں۔ اگر اسے شادی کا جوڑا پسند نہیں آیا' اس کا رنگ اچھا نہیں لگا یا کوئی اور وجہ ہے اور وہ اپنی پسند کا جوڑا پہننا چاہتی ہے تو یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں۔

آپ کی بیٹی کو اگر سسرال کا جوڑا پسند نہ آئے تو آپ کیا کریں گی دو ہی صورتیں ہیں یا تو اس کو سمجھا بجھا کر راضی کریں گی کہ وہ ناپسندیدہ چیز کو قبول کرے یا اس کی پسند کے مطابق جوڑا دلوا دیں گی۔ لیکن یہ سوچیں آپ کی بیٹی دل سے خوش نہیں ہوگی۔ وہ سمجھوتا کرے گی ایک ماں کی حیثیت سے آپ کے دل پر کیا گزرے گی۔ اگر ایک ماں اپنی بیٹی کی خوشی چاہتی ہے وہ نہیں چاہتی اس کی بیٹی سمجھوتا کرے تو آپ بھی اسے اپنی بیٹی سمجھ کر اس کی خوشی کو قبول کرلیں۔

آپ کی بہو اگر اپنے دل کو سمجھالیتی اور تھوڑا سا سمجھوتا کرلیتی تو اس میں اسی کا فائدہ تھا۔ آپ کے دل سے نکلی دعائیں اس کی آئندہ خوشگوار زندگی کی ضامن ہوتیں

اور اس کی سعادت مندی سے آپ کے دل میں اس کے لیے محبت پیدا ہوتی۔ لیکن کم عمری میں انسان بہت سی باتیں سمجھ نہیں پاتا۔ وقت کے ساتھ اسے عقل آجائے گی۔

یہ تو ہمارا نقطہ نظر ہے۔ ہم اپنے قارئین کو بھی اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں۔

آپ اس موضوع پر اظہار خیال کریں۔ آئندہ ماہ ہم آپ کے خطوط شائع کریں گے۔

فرزانہ شبنم..... گلیانہ تحصیل کھاری

شعاع اور خواتین سے دوستی کو تقریباً" بارہ سال ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے نام لوں گی عمیرہ احمد کا کہ بہت زبردست لکھتی ہیں میں حیران ہوتی ہوں کہ اللہ نے ان کو بہت ذہین بنایا ہے فرحت اشتیاق کو اللہ صحت دے۔

راحت جبیں کا ناول "میری مٹی سے میرے خوابوں کا رشتہ" اور میمونہ خورشید کا "سن اے سجنی" ان کو دوبارہ شائع کریں کوئی اعتراض نہیں کرے گا کہ سب کو پسند آئے گا۔ نمرہ احمد چھوٹی سی عمر میں اتنے زبردست ناول لکھتی ہیں کہ ماشاء اللہ "جنت کے پتے" کا تو میں نے بھائی کو انگلینڈ میں بتایا کہ تم بھی پڑھو' پہلے وہ مجھے منع کرتا تھا لیکن اب وہ خود بھی بہت شوق سے پڑھتا ہے۔

ج : پیاری فرزانہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ دس سال سے خواتین اور شعاع پڑھ رہی ہیں یہ جان کر خوشی ہوئی لیکن یہ بات اچھی نہیں لگی کہ آپ نے اس عرصہ میں ایک بھی خط نہیں لکھا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سیدہ نازیہ حسن۔ تاندلیانوالہ فیصل آباد

جون کا خواتین زبردست تھا۔ شہزادی عباس خلجی ہیں تو نئی رائٹر مگر بہت اچھا لکھتی ہیں سمیرا حمید اور آسیہ رزاقی نے بھی کمال کردیا۔

مجھے جس تحریر نے خط لکھنے پر مجبور کیا۔ وہ مئی میں شائع ہونے والا صباحت یاسمین کا مکمل ناول "مزاحف" پڑھتے ہوئے خود بخود آنسو نکلنے لگے اس سے پہلے بھی کئی تحریروں نے رلایا جس میں "دردگر آدمی" کے حیدر مغیث کی موت اور اس کی محبت نے۔

خواتین کا ایک سلسلہ "تصویر سی بناتے جائیں" اپریل 2011ء کے بعد ایک بار بھی شائع نہیں ہوا۔ کیا ساجدہ حبیب کا وردی دعدہ اور دفائیں کتابی شکل میں آگیا ہے؟ پلیز بتائیں۔

نایاب جیلانی اور نبیلہ عزیز' رمشا خالد ' فرحت اشتیاق' ام مریم' سندس جبیں' مریم عزیز اور نازیہ کنول نازی نے ہیرو بنانے کے لیے خصوصی فیکٹریز لگوا رکھی ہیں کیا؟ ویسے مجھے ذاتی طور پر خوب صورتی سے زیادہ مرد کا باکردار ہونا پسند ہے۔ مگر باکردار مرد بہت کم ہوتے ہیں۔

رائٹرز سے بلکہ قابل احترام پیاری رائٹرز سے مودبانہ گزارش ہے کہ ہیرو اور ہیروئن کے نام اعراب کے ساتھ ایک دفعہ لکھ دیا کریں تاکہ ان کا صحیح تلفظ سے پڑھ سکیں اور برائے مہربانی ان نام کے مطالب بھی ساتھ لکھا کریں۔

بشریٰ گوندل نے بہت عرصہ سے کچھ نہیں لکھا۔ سدرۃ المنتہیٰ سے گزارش ہے کہ پلیز نام لے کر اور واضح الفاظ میں آسان لکھا کریں۔ کہانی پڑھتے ہوئے پتا ہی نہیں چلتا کہ ہیرو کی بات ہو رہی ہے یا ہیروئن کی منفرد تو آپ لکھتی ہیں مگر پلیز الجھایا مت کریں۔ پیاری آسیہ رزاقی آپ کی تعریف کے لیے ستارے اکٹھے کر کے لفظ بنانے پڑیں گے۔ آپ کی کہانیوں کی نانیاں اور دادیاں اللہ انہیں لمبی عمر بہت ساری تندرست کے ساتھ دے۔ آمین۔

اور مجھے ان قاری بہنوں سے کہنا ہے جو صرف تنقید ہی کرنا اپنا مقصد سمجھتی ہیں کہ رائٹرز بہت کھلا ڈلا لکھتی ہیں مگر مجھے ایسی کوئی بات کبھی نظر نہیں آئی۔ آپ میں سے اکثر کے گھر کیبل ہے جس کے ڈرامے دیکھ کر دیوار میں ٹکر مارنے کو دل کرتا ہے اور اب تو Ptv پر بھی ہماری ڈائجسٹ کی کہانیوں سے بہت زیادہ رومانس دکھایا جاتا ہے۔ بات میں صرف یہ کرنا چاہتی ہوں کہ ایک سبق آموز کہانی جب لکھی جائے تو سب واضح کرنا ضروری ہو گا کیونکہ آج کل کے بچے وہ نہیں ہیں کہ ماں باپ کے منع کرنے سے رک جائیں بلکہ وہ اس چیز کے پیچھے زیادہ ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں جس سے روکیں مگر میں یہ بات خاص کر ماؤں سے کہنا چاہوں گی کہ پلیز آپ اپنی بیٹیوں کی دوست بنیں تاکہ ڈنڈا چلانے والی مائیں۔ میرے خیال میں بہت صاف ستھرا ادب ہم تک ان رسالوں کے ذریعے پہنچتا ہے۔

ج : پیاری نازیہ! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید۔ خوب صورت تبصرے کے لیے تہہ دل سے شکریہ جہاں تک ہمیں علم ہے پرائیویٹ چینلز کے ڈراموں کی ڈی وی ڈی دستیاب نہیں ہیں۔ نایاب جیلانی اور نبیلہ عزیز کے متعلق جو سوال آپ نے کیے ہیں۔ ہم جلد ہی ان سے انٹرویو کریں گے۔ اس میں ان سوالوں کے جواب بھی دریافت کر لیں گے۔

خصوصاً ہیرو کی فیکٹریز کے متعلق مصنفین خود ہی بتا سکتی ہیں ویسے ہمیں کچھ کچھ اندازہ ہے کہ ہیروز کی یہ قسم نایاب ہے اور زیادہ تر یہ خواب و خیال کی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

سدرۃ المنتہیٰ بہت اچھی اور ذہین مصنفہ ہمیں بھی ان سے یہی شکایت ہے کہ وہ تھوڑا مشکل لکھتی ہیں۔ ہم نے ان سے درخواست کی ہے کہ وہ قدرے عام فہم انداز میں لکھیں۔

عالیہ بتول..... حویلی بہادر شاہ

جون کا شمارہ ہاتھ میں ہے ٹائٹل انتہائی برا لگا آپ کو میری بات بری لگے تو لگے میں تو کافی عرصے سے مستقل قاری ہوں خواتین کی لیکن قلم اٹھایا شادی کے بعد اب میں اتنی مصروف رہتی ہوں میرے دو بچے بھی ہیں جوائنٹ سسٹم بھی ہے میں بیمار ہوں پلیز آپ میرے لیے صحت کی دعا کریں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔

عنیزہ سید بہت اچھی طرح سے کہانی بڑھا رہی ہیں گرہیں کھلتی جا رہی ہیں نگہت عبداللہ نے بھی کچھ کچھ تیز کر دی ہے کہانی آسیہ رزاقی کی آخری کوشش بھی اچھی تحریر تھی۔ فرحت اشتیاق ویل ڈن بہت خوب لکھ رہی ہیں۔

"ساری بھول ہماری تھی" میں بہت دکھ ہوا بہرحال اچھا ہوا عریشہ کی آنکھیں تو کھلیں شہزادی عباس کا وفا حسن ناولٹ مازیہ کا کردار کے علاوہ احسن کی وفا پسند آئی۔

ج : پیاری عالیہ! اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کلی عطا فرمائے آمین۔

کہانیاں لکھی ہیں تو سنبھال کر کیوں رکھی ہیں، ہمیں بھجوا دیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا۔ یہ بات ہمیں کیوں بری لگے گی۔ آپ کو اپنی رائے رکھنے اور اس کا اظہار کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ ہم نے یہ سلسلہ آپ لوگوں کی آراء جاننے کے لیے ہی شروع کیا ہے۔

نجمہ بخاری..... مظفر گڑھ

ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا۔ جی 'تو بات ہو جائے" جو بچے ہیں سنگ" کی لگ رہا ہے ایک اور بند گلی' سکندر کا مقدر ہونے والی ہے۔ لیکن فرحت جی سے گزارش سکندر کے ساتھ کچھ اور برا نہیں کریں۔

ثمینہ عظمت علی کا "بریکنگ نیوز" عمدہ تحریر تھی پڑھ کے بہت مزا آیا۔

"وفائے حسن" ایک خوب صورت تحریر پہلی بار کسی مرد نے عقل سے فیصلہ کیا۔ ورنہ تو حسن سامنے دیکھ کے اچھے اچھوں کی عقل پر پٹی بندھی جاتی ہے۔

آخری کوشش ٹھیک تھا۔ لیکن اس کہانی پر جو اسکیچ تھا وہ بہت خوب صورت تھا۔ اس لڑکی کی خوب صورتی بے مثال تھی "کوہ گراں تھے ہم" بالکل نئے انداز اور نئے اسٹائل کی کہانی ہے اور کافی انٹرسٹنگ ہے۔

اینڈ میں ایک فرمائش پلیز پلیز ایف ایم 94 کے آر جے شفقت بخاری کو ڈھونڈ کے ان کا انٹرویو 'تصویر سمیت شائع کریں ان کی آواز و انداز جیسی کسی کی نہیں میرے پورے ملک میں۔ آپ جب بات کریں گی تو آپ جان جائیں گی۔ دل کے تاروں کو چھوتی ہوئی آواز ہے ان کی۔

ج : نجمہ! ہمیں افسوس ہے ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شفقت بخاری کی آواز واقعی اچھی ہے۔ آپ کی فرمائش جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

تہنیت احمد..... غازی پور ضلع رحیم یار خان

میرا تعلق جنوبی پنجاب کے ایک ایسے گاؤں سے ہے۔ جہاں کے لوگ موسموں کے اتار چڑھاؤ سے بے نیاز ہو کر اپنی دھرتی کو سجانے کا سبب بنتے ہیں یہاں کے کسان دسمبر کی ٹھٹھرتی راتوں کی پرواہ کرتے ہیں نہ ہی جون کے تپتے سورج کی 'اگر پرواہ ہوتی ہے تو اپنی فصل کی کہ فصل کو موسم کی سختی سے بچایا جا سکے۔ سخت سردیوں کی راتوں میں گرم کپڑوں سے بے نیاز اپنی فصلوں کو پانی لگاتے ہوئے اور گرمیوں میں سورج کے نیچے کام کرتے ہوئے جب ان کا پسینہ نیچے گر رہا ہوتا ہے اور پیاسی دھرتی اپنے اندر جذب کرتی ہے تو دل میں یہی خیال آتا ہے کہ بلاشبہ یہی عظیم لوگ ہیں جن کی بدولت ہمارا پیارا ملک ہرا بھرا ہے جب فصل نکلنا شروع ہوتی ہے اور ہر طرف سبزہ ہوا کے دوش پہ ایسے جھوم رہا ہوتا ہے جیسے ہمارا سبز ہلالی پرچم لہرا رہا ہو۔ ایسا منظر اور کسان کی خوشی الفاظ میں ناقابل بیان ہے۔

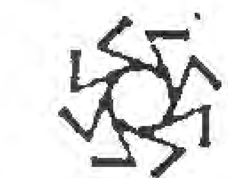
اسی پسماندہ اور ترقی پذیر گاؤں کے چند تعلیم یافتہ گھرانوں سے میرا تعلق ہے میں ایم اے (اردو) کرنے کے بعد اپنے گاؤں کی بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہی ہوں باوجود اس کے کہ یہاں تک خواتین ڈائجسٹ منگوانا بہت مشکل ہے لیکن ہم پھر بھی ہر مہینے باقاعدگی سے خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میری عادت ہے کہ خواتین ڈائجسٹ میں سب سے پہلے قارئین کے دلچسپ خطوط پڑھتی ہوں پھر ان کے تبصرے اپنے خیالات سے ملاتی ہوں کہ آیا جس کہانی کے بارے میں جیسا میں نے سوچا دوسری قارئین نے بھی ویسا ہی سوچا کہ نہیں۔

ہماری تمام قارئین کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں اور ہماری مصنفین بہت خوب صورت لکھتی ہیں۔ ان کے لیے بس اتنا کہوں گی کہ ان کی وجہ سے خواتین ڈائجسٹ ہماری رگوں میں نشے کی طرح سرائیت کر گیا ہے کہ جب تک پڑھ نہ لیں چین نہیں آتا۔

ج : پیاری تہنیت خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔

آپ نے صحیح لکھا۔ ہمارے جفاکش اور محنتی کسان محنت اور مشقت سے دھرتی کا سینہ چیر کر پورے ملک کو اناج مہیا کرتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آج تک کسی نے ان کے لیے نہیں سوچا۔ ان کے سر پر چھت ہے نہ تن پر کپڑا۔ پیٹ بھر کھانا میسر ہے نہ صاف پانی۔ ان کے بچے تعلیم سے محروم ہیں۔ وہ جب تک جاگیرداروں کو ووٹ دیتے رہیں گے۔ ان کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ علم حاصل کر کے دوسروں تک یہ روشنی پہنچا رہی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔





آپ کا باورچی خانہ

حفصہ انعام

1 - کھانا پکاتے وقت خیال تو غذائیت اور صحت سب ہی کا رکھنا چاہیے، مگر وہ جو ایک چیز ہے لذت کام و دہن (اوہ! اسے آسان الفاظ میں زبان کے چٹخارے کہہ لیں) تو بس یہی چیز غذائیت اور صحت کو اکثر پس پشت ڈال دیتی ہے اور پھر صرف پسند ناپسند ہی کا خیال رکھنا پڑتا ہے، کیونکہ مجھ سمیت گھر کے تمام افراد چٹ پٹی چیزوں کے شوقین جو ٹھہرے، لہٰذا زیادہ تر ایسی ہی ذائقہ دار چیزیں بنانی پڑتی ہیں۔

2 - مہمان اللہ کی رحمت ہیں اور سچ پوچھیں تو مہمان نوازی میری فطرت ہے۔ مہمانوں کی آمد پر (اچانک آمد) صرف یہی پریشانی ہوتی ہے کہ انہیں جلد سے جلد کتنا زیادہ سے زیادہ پکا کر کھلایا جائے (مقدار نہیں ڈشیں) اس لیے فوراً" دماغ لڑانا شروع کر دیتی ہوں۔ ویسے تو مجھے چکن بریانی بنانا بھی بہت آسان لگتا ہے اور بقول گھر والوں کے "تم بریانی اتنی جلدی بناتی ہو، جتنی دیر میں ہم انڈا فرائی کریں۔" بہرحال ایک بہت آسان اور جلد تیار ہونے والی ڈش لکھ رہی ہوں۔

دم کا قیمہ

اشیا:

قیمہ	ایک کلو
دہی	ایک پیالی
گھی	ایک پیالی
خشخاش	ایک چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چمچہ
بادام	چھ عدد
نمک	حسب ذائقہ
لونگ	چار عدد
کالی مرچ	چھ عدد
سفید زیرہ	ایک چمچہ
کالا زیرہ	ایک چمچہ
چھوٹی الائچی	چھ عدد
پیاز	ایک عدد
پودینہ	ایک گڈی

ہری مرچ	دو عدد
لیموں	دو عدد
لہسن	کھانے کا ایک چمچہ
ادرک	حسب ضرورت
بیسن	دو چمچے

ترکیب:

سب سے پہلے خشخاش اور بادام بھگو کر پیس لیں۔ پھر سارے خشک مسالے باریک پیس لیں۔ قیمہ دھو کر سارے خشک مسالے، ادرک، لہسن، دہی، نمک، گھی، ہری مرچ، لیموں، بیسن، خشخاش اور بادام ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پیاز تل کر نکال لیں۔ ایک پتیلی میں سارا قیمہ چڑھا دیں۔ جب قیمہ گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو توا رکھ کے تھوڑی دیر دم پر رکھ دیں۔ تلی ہوئی پیاز، پودینہ، ہری مرچ اوپر ڈال دیں۔

میں دم کے قیمے کے ساتھ پوریاں تلتی ہوں۔ آپ چاہیں تو اس کے ساتھ سادہ یا روے میدے کے پراٹھے بھی بنا سکتی ہیں۔

3 - عورت ہو یا لڑکی کچن دیکھ کر ہی اس کے سلیقے کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور بقول امی "ہمارے وقتوں میں عورتیں بہو کی تلاش میں کسی گھر جاتی تھیں تو کسی نہ کسی بہانے سے کچن کا جائزہ ضرور لیتی تھیں۔" (خیر! یہ معاملہ تو اب بھی ہے شاید.....) لیکن صرف اسی وجہ سے نہیں، بلکہ مجھے خود بھی کچن کی صفائی کا خبط ہے ساتھ ہی اس کی آرائش کا بھی خیال رکھتی ہوں روزانہ بھرپور صفائی اور ہفتہ وار تفصیلی صفائی معمولات میں شامل ہے۔

4 - صبح کا ناشتا تو اب رمضانوں میں سحری میں تبدیل ہو گیا ہے جس میں کھجلہ، پھینی وغیرہ کے ساتھ پراٹھے اور دہی کی نمکین لسی لازمی ہے ویسے یہ روغنی روٹی بھی بہت مزا دیتی ہے۔

سفید آٹا	چار کپ
خشک دودھ	آدھا کپ
شکر	آدھا کپ
انڈے	دو عدد
گھی	حسب ضرورت

ترکیب:

آٹے میں خشک دودھ، شکر اور گھی اچھی طرح ملا لیں۔ نیم گرم پانی سے آٹا گوندھ کر آدھا گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پیڑے بنا کر موٹی موٹی روٹی بیل لیں اور گرم توے پر ہلکی آنچ کر کے سینک لیں۔ مزے دار روغنی روٹی تیار ہے۔ یہ روٹی نہایت لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ روزے کی حالت میں سارا دن آپ کو توانائی بھی فراہم کرے گی۔

(نوٹ: اس روٹی میں شکر کی جگہ نمک بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔)

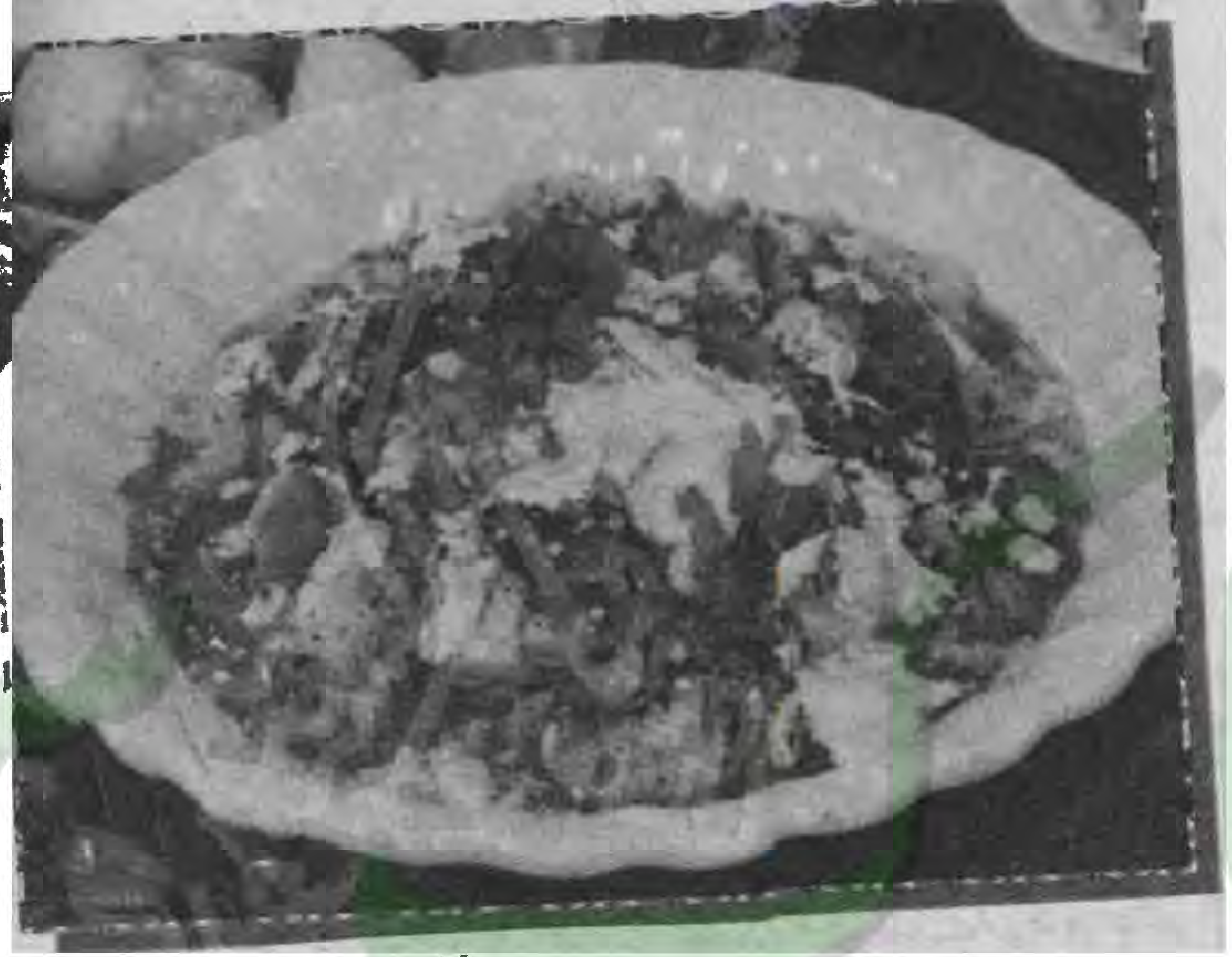
5 - باہر کھانا کھانے کا شوق نہیں ہے۔ البتہ کبھی کبھار پروگرام بن جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ مسلسل پکا کر کھانے اور کھلانے کے بعد کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنا چاہیے (کیوں صحیح ہے نا؟)

6 - موسم اور پکوان تو لازم و ملزوم ہیں۔ برسات ہو اور پکوڑے نہ ہوں تو پھر کیسا مزا؟ اسی طرح سردیوں میں پائے اور گرمیوں میں کریلے اور مختلف شربت موسم کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں۔ گرمیوں میں "ستو" (جی ہاں! ستو) بھی ہمارے سب گھر والے شوق سے نوش فرماتے ہیں۔

7 - اچھا پکانے کے لیے صرف محنت نہیں، بلکہ شوق، موڈ اور ہاتھ کا قدرتی ذائقہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ سب نہ ہوں تو صرف محنت سے لذت نہیں آتی۔

8 - باورچی خانے کا اصل حسن اس کا صاف ستھرا ہونا ہے۔ بالخصوص کاکروچ اور کیڑے مکوڑوں سے پاک ہونا چاہیے۔ اگر کچن کیبنٹ میں براؤن پیپر (خاکی کاغذ) بچھا دیں تو کاکروچ نہیں آتے۔





موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

دہی بڑے چنا چاٹ

اجزا:

دہی	دو کپ
ابلے کابلی چنے	ایک کپ
ماش کی دال	آدھا کپ
مونگ کی دال	آدھا کپ
آلو	دو عدد
ٹماٹر	دو عدد
پیاز	ایک عدد
ہری مرچ	دو عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
میٹھا سوڈا	آدھا چائے کا چمچہ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا	حسب ذائقہ
ہینگ	ایک چٹکی
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
پاپڑی	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

مونگ اور ماش کی دال چار گھنٹے تک بھگونے کے بعد پیس لیں اور اس میں نمک، میٹھا سوڈا، کٹی ہوئی لال مرچ اور آدھا چمچہ زیرہ (بھون کر پیس لیں) ملا کر رکھ دیں۔ آمیزہ پتلا نہیں ہونا چاہیے۔

فرائنگ پان میں ایک کھانے کا چمچہ تیل گرم کر کے اس میں ہینگ ڈالیں، پھر ثابت دھنیا اور ثابت زیرہ ڈال کر تھوڑا سا بھونیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو کوٹ کر دال

میں ملا دیں۔ کڑاہی میں دال کے بڑے بنا کر سنہرا ہونے تک تلیں، پھر نمک ملے پانی میں ڈال دیں۔

دہی میں نمک، کٹی ہوئی لال مرچ اور باقی بچا ہوا زیرہ ڈال کر پھینٹ لیں۔

آلو کو ابال کر چوکور کاٹ لیں اور کابلی چنوں کے ساتھ دہی میں ڈالیں، پھر بڑے بھی پانی سے نکال کر دہی میں ڈال دیں۔ ٹماٹر، مرچ، پیاز اور ہرا دھنیا باریک کاٹ کر ڈالیں اور ہلکے ہاتھ سے سب کو مکس کر دیں۔

چاٹ مسالا، پاپڑی اور املی کی چٹنی کے ساتھ مزے دار دہی بڑے چنا چاٹ پیش کریں۔

چکن چٹوری

اجزا:

چکن	ایک کلو
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
خشخاش	دو کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت سرخ مرچ	آٹھ عدد
ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
سوکھے آلو بخارے	دس عدد
دار چینی	ایک ٹکڑا
لونگ	چار عدد
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

زیرہ، دھنیا، مرچ اور خشخاش کو توے پر بھون کر باریک پیس لیں۔ پتیلی میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری کر لیں۔ لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر تھوڑا بھونیں، پھر چکن ڈال کر فرائی کریں۔ ساتھ ہی ہلدی، دار چینی، لونگ، الائچی پاؤڈر، نمک اور اوپر والا مسالا بھی ڈال دیں۔ گوشت گلنے تک ہلکی آنچ پر پکائیں، پھر آلو بخارے ڈال کر روغن آنے تک بھونیں اور پانچ منٹ کے لیے دم پر چھوڑ دیں۔ ڈش میں نکالتے وقت لیموں کا رس ڈال کر نان یا چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

چاکلیٹ آئس کریم

اجزا:

دودھ	تین کپ
خشک دودھ	آدھا کپ
کریم	ڈیڑھ کپ
کنڈینسڈ ملک	ایک کپ
انڈے	دو عدد
کافی	ایک چائے کا چمچہ
کوکو پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
چاکلیٹ	ایک کپ
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:

دودھ پکا کر اس میں انڈے پھینٹ کر ڈالیں اور مسلسل چمچہ ہلاتے رہیں۔ خشک دودھ بھی تھوڑے سے پانی میں حل کر کے شامل کر دیں۔ ایک ابال آجائے تو چولہے سے اتار لیں۔ اب کافی اور کوکو پاؤڈر ڈال کر مکس کر لیں۔ ایک بڑے پیالے میں چاکلیٹ اور مکھن ڈال کر بڑے پتیلے کے اندر گرم پانی میں رکھ دیں تاکہ چاکلیٹ پگھل کر مکھن کے ساتھ مکس ہو جائے۔ چاکلیٹ اور مکھن پگھل جائیں تو کریم مکس کر لیں۔ دودھ والا آمیزہ بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کر لیں اور کسی پیالے میں نکال لیں۔ اب اس میں کنڈینسڈ ملک اور چاکلیٹ کریم اچھی طرح یکجان کر کے فریزر میں رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد نکال کر دوبارہ خوب پھینٹیں اور ایئر ٹائٹ بکس میں ڈال کر تقریباً" دو گھنٹے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔

مزے دار فج چاکلیٹ آئس کریم تیار ہے۔

نفسیاتی الجھنیں

عدنان

ڈیل کارنیگی نے پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک صاحب کی سرگزشت لکھی ہے جس کے بارے میں ان کا بیان ہے کہ بالکل سچی ہے۔

گہرے صدمہ کے باعث ایک صاحب کی بھوک اڑ گئی' نیند غائب ہو گئی۔ کسی پہلو چین نہیں آتا تھا۔ ان کے اعصاب بالکل جواب دے گئے اور خود اعتمادی ختم ہو گئی۔ ڈاکٹروں کے پاس گئے تو کسی نے سکون آور گولیاں دیں۔ کسی نے سیرو تفریح کی سفارش کی۔ انہوں نے دونوں کو آزمایا لیکن بالکل فائدہ نہ ہوا اور طبیعت اور حالت ویسی ہی رہی۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ "ایک شام میں افسردہ اور غمگین بیٹھا تھا تو میرا چار سالہ بیٹا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس کے لیے ایک کشتی بنادوں۔"

میں کشتی بنانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ دراصل میرا کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میرا بیٹا اپنی ضد پر اڑا رہا اور مجھے شکست تسلیم کرنی پڑی۔

اس ننھی سی ناؤ بنانے میں میرے تین گھنٹے صرف ہو گئے۔ کام ختم کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کشتی بنانے میں جو تین گھنٹے لگائے ہیں' وہ انتہائی سکون اور اطمینان کی گھڑیاں تھیں اور یہ سکون اور اطمینان مجھے کئی مہینوں کے بعد پہلی بار حاصل ہوا تھا۔

اس انکشاف پر میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کئی مہینوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب میں نے کسی بات پر غور کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جب میں کسی ایسے کام میں مصروف رہوں جس میں سوچ بچار اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہو تو میرا پریشان' افسردہ اور غمگین رہنا مشکل ہے۔ مثلاً "اس کشتی کے کام کو لیجیے' اس نے میری ساری پریشانیوں کو یکسر ختم کردیا۔ چنانچہ میں نے مصروف رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

اگلی صبح میں ہر کمرے میں جا کر ان چیزوں کی فہرست تیار کرنے لگا جو میری توجہ چاہتی تھیں۔ بے شمار اشیاء۔ کتابیں رکھنے کا ریک۔ سیڑھیاں' کھڑکیاں' پردے' کنڈیاں' تالے' ٹونٹیاں مرمت طلب تھیں۔ میں نے دو ہفتوں کے دوران تمام مرمت طلب چیزوں کو مرمت کرلیا۔ اس کے علاوہ میں نے سماجی کام کرنے شروع کیے۔ محلے کے لوگوں کی تکالیف اور ان کی مدد کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ کھاتے پیتے لوگوں کو محلے کے سفید پوش ضرورت مند لوگوں کی ضرورتوں سے آگاہ کرنا شروع کیا اور ان سے کار خیر میں حصہ لینے کے لیے کہا تو ان میں سے بیشتر اس کے لیے بخوشی تیار ہو گئے اور یہ سب کچھ کر کے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں اپنے رنج و غم' پریشانیاں بھول کر ایسے کاموں میں' جو گھر' رشتے دار اور محلے والوں کے تھے۔ ایسا مصروف ہوا کہ پریشان اور افسردہ رہنے کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

میں دو بچوں کی ماں ہوں میں اپنے خاوند کی بہت عزت کرتی ہوں مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی اور شخص میں دلچسپی لے رہی ہوں۔ وہ ہمارے خونی رشتے سے نہیں ہیں۔ لیکن جب تک میں ان کو دیکھ نہ لوں تو مجھے قرار نہیں آتا۔ میرے خاوند کو ابھی تک اس کا علم نہیں۔ میں ان صاحب کو صرف دیکھنے کی حد تک پسند کرتی ہوں۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں' صرف دیکھنے کو دل چاہتا ہے اور اس قدر محبت ہو گئی ہے کہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ وہ مجھے ہر طرح سے سمجھا کر تھک گئے ہیں کہ آپ بزدل ہیں۔ اس لیے آپ محبت کے چکروں میں نہ پڑیں۔ وہ حضرت بیوی کو چھوڑ چکے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں تو آزاد ہوں مگر آپ مجبور ہیں۔ مجھے تین ماہ سے یہ جنون ہے کہ میں ان کو دل بھر کر دیکھ لوں۔ جتنا دیکھتی ہوں دل نہیں بھرتا۔ جب وہ کبھی نہ آئیں تو میں بہت زیادہ روتی ہوں کسی کے پوچھنے پر یہ کہہ کر اس کی تسلی کرتی ہوں کہ مجھے علم نہیں کہ میں کیوں روتی ہوں۔ ویسے میرے گھر والے بھی اس وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ وہ کہتے ہیں اگر آپ کو میرے ساتھ پیار ہے تو یا اپنے گھر میں میرا تعلق بڑھائیں۔ یا میرے ساتھ کہیں بھاگ چلیں۔ لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ میں ساری زندگی گناہ گار بن کے گزاروں۔ کیونکہ نکاح کے اوپر نکاح بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ ویسے آج تک انہوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی کیونکہ ہم اکثر اکیلے بھی ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہاری خوشی کے ساتھ میری خوشی ہے۔ جو تم پسند کرو وہ ہی میں پسند کروں گا' ان کی ایک دن کی غیر حاضری میرے لیے جان کا عذاب بن جاتی ہے۔ جو چیز گھر میں پکاتی ہوں' وہ شامل نہ ہوں تو کھانے کو دل نہیں چاہتا۔

واضح کردوں کہ میرے شوہر کی عمر سینتالیس سال ہے اور میری عمر صرف ستائیس سال ہے۔ وہ میرے ہم عمر ہیں۔ میرے گھر میں ہر چیز ہونے کے باوجود مجھے سکون نہیں۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتے ہیں۔ میں اپنے خاوند کو کیسے مطمئن کروں اور وہ کیسے ہمارے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں؟ انہیں دیکھنے کو دل پریشان رہتا ہے بتائیں کیا کروں' میں پریشان رہتی ہوں۔ بچوں کو ــــ مارتی ہوں۔ ہر وقت ست اور بیزار رہتی ہوں۔ کافی کوشش کرتی ہوں کہ میں گھر میں نارمل رہوں۔ لیکن میرے بس سے باہر ہے۔ ہر وقت ان کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہوں۔ وہ کہتے ہیں مجھے آپ سے پہلے پیار نہیں تھا۔ لیکن اب ہم نے قرآن کو گواہ بنا کر قسم کھائی ہے کہ میں آپ کا راستہ ہموار کروں گی۔ اگر نہ ہوا تو میں کیا کروں۔ میں نے قسم اٹھائی ہے۔

ج : آپ دو بچوں کی ماں ہیں۔ کسی کی بیوی ہیں۔ ایک گھر کی عزت آپ سے وابستہ ہے آپ کی حرکات' آپ کا رویہ' آپ کا راستہ گناہ اور دلدل کا راستہ ہے۔ جس راستے پر آپ چل رہی ہیں اور چلنے کا سوچ رہی ہیں وہ تباہی' بربادی اور بدنامی کا راستہ ہے۔ جس کے بعد آپ دین کی رہیں گی نہ دنیا کی۔ اس بدمعاش نے آپ کو اس قدر پھانس لیا (یا آپ خود پھنس گئیں) اتنی بے راہ روی تو اختیار کروالی۔ یا دونوں نے مل کر کرلی۔ اب..... گھر میں رہ کر گناہ کے مزید راستے کھولنا چاہتا ہے۔

اگر آپ کو اپنی' اپنے خاندان' اپنے شوہر اور بچوں کی زندگی اور عزت عزیز ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ بدنامیوں کے داغ آپ کے دامن پہ نہ لگیں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے بچے زمانے کی دشنامیوں سے بچے رہیں۔ تو آج ہی' اسی وقت اس شخص سے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا واسطہ اور تعلق ختم کرلیں۔ اس سے کبھی نہ ملیں۔ اسے کبھی گھر نہ آنے دیں۔ اپنی بیوی کو وہ پہلے ہی چھوڑ چکا ہے۔ اب وہ آپ کی تباہی کے درپے ہے۔

میں تو دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ! آپ کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ باقی اس پر عمل کرنا آپ کا کام ہے۔ اس گناہ سے بچنا آپ کے ہاتھ میں ہے اور خدا کرے آپ بچ جائیں۔

☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

عائشہ کاظمہ..... بھاول نگر

س : گرمی میں مختلف تقریبات میں شرکت کرنا ہوتی ہے تو میک اپ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن میک اپ ٹھہرتا نہیں۔ کچھ دیر بعد چہرے پر دھبے پڑ جاتے ہیں اور چہرہ بے رونق اور پھیکا پھیکا لگنے لگتا ہے۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میں گرمی میں میک اپ کر کے تقریب میں شرکت کر سکوں۔

ج : گرمیوں کے موسم میں جلد کے بعض غدود اپنی چکنائی زیادہ تعداد میں خارج کرنے لگتے ہیں اور جلد چکنی ہو جاتی ہے۔ دن میں کئی بار منہ دھوئیں مگر چہرہ عجیب چکنا چکنا رہتا ہے۔ اس لیے میک اپ بھی چہرے پر نہیں ٹھہرتا۔ اس کے لیے ایک آسان سا علاج کیجیے۔

اشیا :

ٹماٹر درمیانہ سرخ	ایک عدد
لیموں کے قطرے	تین چمچ
پودینہ کا عرق	ایک چمچ

ترکیب :

ٹماٹر کے دو ٹکڑے کرلیں۔ اس پر لیموں اور پودینہ کے قطرے ڈال کر آہستہ آہستہ چہرے پر اس کا رس ملیں۔ رس ملتے وقت آپ ہاتھ کو نیچے کی جانب لا کر مالش نہ کریں۔ بلکہ ہاتھ کو پیشانی کے رخ پر رکھیں۔ پندرہ منٹ بعد آپ سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ آپ کو خود تازگی کا اثر محسوس ہوگا۔ ٹماٹر کی یہ ننھی منی مالش جلد کے لیے بہترین مالش ہے۔ میک اپ کرنے سے پہلے یہ عمل کریں گی تو میک اپ دیر تک قائم رہے گا کیونکہ یہ عمل چکنائی خارج ہونے میں وقفہ پیدا کرتا ہے۔

میک اپ کرنے سے پہلے آپ چہرے پر برف کے ٹکڑوں سے مساج کریں۔ اس سے چہرے کے مسام بند ہونے میں مدد ملے گی۔

نرشیہ خان..... لاہور

س : میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کوئی بھی شیمپو سوٹ نہیں کرتا۔ بال بے حد روکھے اور خشک ہیں۔

میری آنکھوں کے گرد حلقے ہیں جو پیدائشی ہیں۔ کیا وہ دور ہو سکتے ہیں؟

ج : بالوں کی خشکی دور کرنے کے لیے آپ ہفتہ میں ایک مرتبہ یہ نسخہ استعمال کریں تو آپ کے بالوں میں چمک آجائے گی اور بال صحت مند رہیں گے۔

ایک کپ دودھ میں ایک انڈا پھینٹ لیں۔ جب خوب جھاگ بن جائے تو اسے سر پر بالوں میں اچھی طرح لگائیں۔ پندرہ منٹ تک لگا رہنے دیں' پھر بال دھولیں۔

بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ شیمپو سے ان کے بال خشک ہو جاتے ہیں۔ آپ گھر پر بنا ہوا شیمپو استعمال کریں۔

گھر پہ شیمپو بنانے کی ترکیب یہ ہے۔

گلیسرین صابن	ایک ٹکیہ
پانی	ایک پیالہ
انڈا	ایک عدد

گلیسرین صابن کو چھیل کر ایک پیالہ پانی میں ابال لیں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر وہ جیلی کی طرح بن جائے گا۔ انڈے کو اچھی طرح پھینٹ لیں اور جیلی میں ملالیں۔

اس سے بال دھولیں۔ آنکھوں کے حلقے اگر پیدائشی ہیں تو ان کو دور کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن یہ حلقے کم ضرور کیے جاتے ہیں۔

حلقوں کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ڈاکٹر سے مشورہ کرلیں۔